مطبع	چاپ خانہ کوہاٹ روڈ پشاور
طبع اول	سنہ ۱۹۸۶ء
تعداد	ایک ہزار
کاتب	سناء الدین کاکاخیل
قیمت	-/۴۰ روپیہ

ملنے کا پتہ

سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل ۔ زیارت کاکا صاحب

تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور

مختصر سوانح حضرت قطب الاقطاب شیخ المشائخ

حضرت سید کستیر

الملقب بہ

رحمکار رحؒ

المعروف بہ

کاکا صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل

فہرست

انتساب

حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

کے

عقیدتمندوں کے نام



سرگذشت عہدِ گل را از نظیری بشنوید

عندلیب آشفتہ تر گفتہ است این افسانہ را

(نظیری نیشاپوری)

هوالناصر

مقدمہ

مہنگائی کے اس دور میں مقدمہ نگاری کے تکلف کا موقع نہیں رہا، کیونکہ کتاب کا ہر اضافی صفحہ کتاب کی قیمت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اس لئے مجھے جب بھی حکم دیا جاتا ہے تو میں از راہ امتثال امر مقدمہ لکھنے کا وعدہ تو کر بیٹھتا ہوں۔ لیکن کوشش یہی کرتا ہوں کہ اپنی معروضات کو اختصار سے بیان کروں۔

محبّی و مشفقی جناب سید بہادر شاہ ظفؔر کی اس خاکسار سے محبت اور حضرت کاکا صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات سے میری عقیدت (جسے میں سرمایہ ظفرِ عاقبت سمجھتا ہوں) کے پیشِ نظر صرف اپنے محسنوں اور دوستوں کے اصرار ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ ثواب کمانے کی خاطر بھی زیرِ نظر کتاب پر مقدمہ لکھنے کی سعادت کو خدا تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہوں جس کے لئے میں اس محسنِ حقیقی کا شکر ادا کرتا ہوں اور ان تمام دوستوں کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کے قلوب و اذہان میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے یہ تحریک پیدا کی کہ اس کارِ خیر کے لئے انہوں نے میرا انتخاب کیا۔ فالحمدللہ۔

منقبت نگاری ہمارے ہاں ایک روایت کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اور بدقسمتی سے بعض افراد نے ہر رطب و یابس پر منقبت کا لیبل چپکا کر اس فنِ شریف و صنف کو اس حد تک بدنام کر دیا ہے کہ اس میدان میں لکھی گئی

ہر کتاب صرف ایک مخصوص طبقے میں ہی مقبول ہو سکتی ہے، کیونکہ کشف و کرامات کی تفصیلات پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ سنجیدہ قاری اس امت کے رجال کے مقدس سوانح کی یکرنگی کے نتیجے میں اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال میں حضرت کاکا صاحبؒ کے بارے میں ایک ایسی کتاب تحریر کرنا جو سیرت نگاری کے اصول و ضوابط کے مطابق ہو اور جس میں محض ما فوق الفطرت قسم کے افسانوں کی بھرمار نہ ہو ایک نہایت ہی مثبت اور اس لئے انتہائی قابل قدر کوشش ہے، کیونکہ اس قسم کی کتاب کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں یہ حقیقت راسخ ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس امت میں اولیاء اللہ کو اس لئے مبعوث کیا ہے تاکہ وہ فخر موجودات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں انسانوں کو مکارم اخلاق کی تعلیم دیں۔ اور اس طرح نسلِ انسانی زندگی کی مسرتوں اور اُخروی سکون کے حصول میں کامیاب ہو۔

جناب ظفر نے حضرت کاکا صاحبؒ کی زندگی سے متعلق اس کتاب کے متعلقہ حصے میں انؒ کی پاک اور مقدس زندگی سے ایسے واقعات منتخب کئے ہیں جو انہوں نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے متاثر ہو کر اپنے زمانے اور بعد کی نسلوں کو اسلامی اخلاق کا درس دینے کیلئے شعوری طور پر انجام دیتے ہیں، جن کو بار بار پڑھنا اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے رہنا خود انسانی نسل کے مفاد میں ہے۔

حضرت کاکا صاحبؒ کے سوانح میں اسلامی اخلاق کے ذیلی عنوانات کے تحت ایسے تمام واقعات کو یکجا کرنے کا ایک اضافی فائدہ ... ہے کہ نفسیاتی کشمکش اور ذہنی بحران کے وقت آسانی سے ان

مثالوں کو مشعلِ راہ بنایا جاسکتا ہے، جنہیں ان عنوانات کے ذریعے ڈھونڈنا آسان تر ہوگیا ہے۔

حضرت کاکا صاحبؒ کی مقدس زندگی کے واقعات "مقامات قطبیہ" اور "مجمع البرکات" جیسی مستند کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں اس لئے ان روایات کی صحت کے بارے میں تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں لیکن جہاں جہاں جناب ظفر صاحب کو خود اپنے وضع کردہ معیار کے مطابق کسی روایت میں کوئی ضعف نظر آیا ہے وہاں اُنہوں نے عقلی اور دوسرے نقلی ذرائع سے وہی روایت اپنائی ہے جو ان کی رائے میں صحیح اور قابلِ اعتبار ہے۔

موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا پہلا حصہ سیرت نگاری سے تعلق رکھتا ہے جبکہ دوسرے حصے کا تعلق تاریخ سے ہے۔ کتاب کے تاریخی حصے کو بھی دو شعبوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا پہلا اور آخری حصہ تاریخ پر تنقید یا تشریح واقعات کے ذیل میں آتا ہے، جبکہ اس کا درمیانی حصہ ایک انتہائی دلچسپ تحقیق پر مشتمل ہے۔

فاضل مؤلف نے اُن حضرات کی رائے کی تردید میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کیا ہے جو حضرت کاکا صاحبؒ کو نسلی طور پر خٹک تسلیم کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اُنہوں نے مختلف حوالوں سے حضرت کاکا صاحب کے شجرۂ نسب کی تحقیق کی ہے اور ان کے شجرے کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ طیبہ سے ملایا ہے۔ اس ضمن میں بعض ایسے حوالوں کی تردید میں جن کی رو سے حضرت کاکا صاحبؒ کو یاسین خیل خٹک سمجھا جاتا ہے، جناب ظفر نے فلالوجی کی بنیاد پر خٹک کو ایک علاقائی وحدت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ یہ ایک بالکل نئی تحقیق ہے، اس لئے فاضل مؤلف کی جانب سے اپنی تحقیق پر اصرار

کے باوجود بہت سے لوگوں کو اس کی صحت کا قائل کرنے کیلئے مزید تحقیق اور تدقیق کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ایک بات جو اس ضمن میں مجھے کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ خٹک کو علاقائی رشتے کا مظہر ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "خٹک نامہ" میں رہنے والے "غیر کا کا خیل" گروہوں کو نسلی طور پر کس شاخ سے وابستہ سمجھا جائیگا۔ میری ناقص رائے میں جناب ظفر کی گرانقدر تحقیق کے لازمی نتیجے کے طور پر اس سلسلے میں تحقیق انتہائی ناگزیر ہوگئی ہے۔ اور اس میدان میں کام کرنے والے نوجوانوں پر اب یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ وہ اس تحقیق کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے کے سلسلے میں جناب ظفر کی وضع کردہ تعریف کو ثابت کرنے کیلئے مزید ٹھوس دلائل مہیا کریں اور صرف فلالوجی ہی پر اکتفا نہ کریں۔

"خٹک کلچر" کے بارے میں جناب ظفر کی تصریحات انتہائی دقیع ہیں، لیکن اچھا ہوتا اگر فاضل مؤلف خٹکوں کی علاقائی وحدت کے ساتھ ساتھ ان کی کلچری وحدت کے بارے میں مزید مواد مہیا کر کے اپنے موقف کو مضبوط تر بنانے کی کوشش کرتے۔ مجھے نوجوان نسل سے پوری پوری امید ہے کہ وہ ان خطوط پر "خٹک خوشہ" کی تفصیلات کا مطالعہ کر کے اس کے نتائج سے اپنی قوم کی معلومات میں اضافہ کریں گے۔ بہر حال اس ضمن میں اولیت کا سہرا جناب سید بہادر شاہ ظفر ہی کے سر رہے گا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں حضرت شیخ "رحمکار" کے اس تذکرے میں بایزید انصاری کے حالات بیان کرنے کی حکمت نہیں سمجھ سکا۔ حضرت کاکا صاحب ۹۸۳ھ مطابق ۱۵۷۶ء میں پیدا ہوئے جبکہ خود فاضل مؤلف کے اندازے کے مطابق بایزید انصاری

کی وفات ۸۷-۹۸۶ھ میں ہوئی۔ یعنی بایزید انصاری کی وفات کے وقت حضرت کاکا صاحبؒ کی عمر شریف تین سال کے لگ بھگ تھی۔ روشنائی تحریک کے پورے سیاق و سباق میں کہیں بھی حضرت کاکا صاحبؒ کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف محاصرۂ پشاور (۱۰۳۹ھ / ۱۶۳۰ء) کے ضمن میں تاریخ مرصع کے مؤلف نے مقامات قطبیہ کی سند پر (نام لئے بغیر) حضرت کاکا صاحبؒ کے بارے میں اتنا بتایا ہے کہ اس معرکے میں شہباز خان کو جو مغلوں کا ساتھی تھا حضرت شیخ رحمکارؒ نے اپنے بھائی کے ذریعے یہ پیغام بھیجا کہ وہ تین دن خیرآباد میں توقف اختیار کرے۔ (شہباز خان پختونوں کی متوقع فتح کے خوف سے وطن چھوڑ کر جانا چاہتا تھا)۔ اس ضمن میں یہ بات مدنظر رہے کہ یہ معرکہ دراصل کمال خان داؤدزئی کی قیادت میں تمام پختون "اولسات" کی متحدہ قوت اور مغلوں کے درمیان ہوا جس میں عبدالقادر روشانی نے بھی حصہ لیا جسے جناب ظفر نے اس واقعے کے ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔ حالانکہ مقامات قطبیہ اور تاریخ مرصع دونوں اس واقعے کو کمال خان کا واقعہ لکھتے ہیں (مقامات ص۔۱۶۱۔ اور تاریخ مرصع ص۔ ۵۸۵) تاریخ مرصع کی یہ پوری روایت "نقل" کے عنوان سے مقامات قطبیہ سے لی گئی ہے۔ اس ایک واقعے کے بغیر مقامات تاریخ مرصع اور حالنامہ میں کہیں بھی روشانی تحریک کے ضمن میں حضرت کاکا صاحبؒ کا ذکر نہیں آیا۔ اور اس لئے راقم الحروف کو بایزید انصاری کا تذکرہ کچھ بے محل سا لگتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت کاکا صاحبؒ کی اولاد کو "میاں" کے خطاب کی وجہ جواز کے طور پر میاں روشان کا ذکر ضروری سمجھ گیا ہو، کیونکہ کتاب میں بایزید انصاری کے مختصر سے تذکرے کے مابعد اس موضوع پر اظہار خیال

کیا گیا ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے، کہ پختونوں میں بزرگ شخصیتوں کیلئے
"میاں" کے خطاب کا رواج بایزید انصاری کے زمانے سے ہوا ہے"۔ میں
انتہائی ادب سے یہ گذارش کروں گا کہ جناب ظفر کی تحقیق کی وقعت
کے باوجود اس سلسلے میں میری رائے ان سے مختلف ہے۔ اولاً تو اسلئے
کہ عباس سروانی کی تاریخ شیر شاہی میں "میاں" کا لفظ خاندان سوری
کے متعدد افراد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح اس لفظ کی تاریخ بابر
(م۔ ۱۵۳۰) کے زمانے تک پہنچ جاتی ہے جو بایزید انصاری سے پہلے
گزرے ہیں۔ اور ثانیاً اس لئے بھی کہ میری تحقیق کے مطابق اباسین کے اس
پار کے علاقے میں "ویش" (تقسیم اراضی) کے نظام سے اس لفظ کا گہرا
تعلق ہے۔ کیونکہ اس نظام میں بزرگان دین کے بغیر اور تمام افرادِ قبیلہ کے
گھر بدلتے رہتے تھے اور اس لئے صرف بزرگوں کے خاندان کو "ستانہ دار"
(صاحب مکان) کہا جاتا تھا اور یہی مطلب "میاں" کا بھی ہے جو "میانہ"
(گھر) سے قرابت رکھتا ہے اور اس لفظ کا بھی وہی مطلب لیا جاتا تھا
جو "ستانہ دار" اور آستانہ دار" کا ہے۔ ورنہ اباسین کے اُس پار تو یہ لفظ
"اللہ میاں" اور "میاں بیوی" کی شکل میں پتہ نہیں کب سے رائج تھا۔

ان معروضات کے باوجود میری رائے میں یہ تذکرہ حضرت شیخ رحمکار کے "تذکروں" میں ایک
نمایاں حیثیت کا حامل ہے اور خدا کرے اس سے وہ تمام شکوک و شبہات رفع ہوں جن کے ازالے
کیلئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اور اگر کسی صاحب کو کتاب یا اس مقدمے کے مندرجات سے
اختلاف بھی ہو تو بھی میری رائے میں جناب ظفر کی ماہرانہ تحقیق کے شوق تنقید کے لئے مہمیز
کا کام دے گی۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین۔

۶۔ خوشحال کالونی
پشاور شہر

قلندر مومند
۲۱ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ
۳۱ مئی ۱۹۸۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

یوں تو حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز اپنے وقت کے بہت بڑے روحانی پیشوا مادر زاد ولی اللہ اور ولی ابن ولی تھے، نیز علوم باطنی میں معرفت الٰہی کے نہایت اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ ساتھ ہی ساتھ علوم ظاہر اور میدان علوم شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی بہت بڑے شہسوار تھے۔ چنانچہ اپنی زندگی میں بھی، اور رحلت کے بعد آج تک کم وبیش ان چار سو سال میں ہر سمت سے گوناگوں مخالفتوں اور حاسد لوگوں کی طرف سے خود ساختہ افسانہ طرازیوں کے باوجود مخلوق خدا کی نظروں میں ان کا رتبہ تو کیا کم ہوتا، البتہ صاحب نظر لوگوں کے دلوں میں اُن کی قدر و منزلت بڑھتی ہی رہی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حضرت کی درگاہ پر ہر روز سینکڑوں ہزاروں زائرین اپنی اپنی مرادیں لیکر آج بھی آتے ہیں، اور اپنی جھولی بھر بھر کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ شیخ المشائخ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ ظاہری طور پر کسی اور ولی اللہ کے دست گیر نہ تھے۔ تاریخی شواہد اس بات کے بھی موجود ہیں کہ حضرت شیخ اپنے دور کے چند ایسے بزرگوں سے بھی ملتے رہتے تھے جو اُس وقت یا بعد میں بہت نامور ٹھہرے تھے، لیکن اس بات کا کسی کے پاس بھی کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں کہ حضرت نے ان حضرات میں سے کسی ایک سے بیعت کی ہو۔ بنی سنائی اور گھڑی گھڑائی باتوں کو ایک طرف رکھ کر دیکھنا ہے۔

کہ حضرت شیخ صاحب خود ولی ابن ولی ابن ولی ہیں اور نہیں تو کم سے کم اسی علاقہ میں ان کے چار جداعلیٰ معروف و مشہور ولی اللہ گزرے ہیں اس کے باوجود حضرت خود کو نہ تو قطب کہلوانا پسند کرتے ہیں نہ غوث، نہ اپنی علمیت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں نہ بزرگی کا، بلکہ اپنے فقر پر فخر کرتے اور خود کو "عبداللہ" کہتے ہیں۔ دُنیا کی آلائشوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ دور و دراز پہاڑوں کے انتہائی دشوار گزار گوشوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ مخلوق خدا کو منع فرماتے ہیں کہ میرے پاس مت آؤ۔ لیکن جب دیکھتے ہیں کہ مشیت الٰہی کو یہ رویہ پسند نہیں تو پھر خلق اللہ سے ناطہ جوڑ لیتے ہیں اور یہ ناطہ ایسا جڑتا ہے کہ پھر آج تک نہ ٹوٹا ہے نہ ٹوٹنے کا آئندہ کوئی امکان نظر آتا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب شیخ المشائخ حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز کی زندگی کے حالات و واقعات پر محققانہ اور نہایت عالمانہ انداز میں ایک شگفتہ تحریر ہے۔ اس کتاب میں ہمارے مشفق و مہربان استاد جناب میاں بہادر شاہ ظفر کاکاخیل نے مقدور بھر تاریخی حقائق اور عالمانہ دلائل کی روشنی میں اُن اعتراضات کا مسکت جواب دیا ہے جو ایک عرصہ سے حضرت شیخ کی سیادت نیز ان کی پیری مریدی کے بارے میں کچھ پست ذہنیت کے لوگ اٹھا رہے تھے۔ بلکہ آج سے بہت پہلے اس قسم کے مسکت جواب کی ضرورت تھی۔ بہرحال ایک بات طے ہے کہ جن لوگوں کے ذہنوں میں ایسے کچھ شکوک و شبہات ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو ایسے حقائق کو مانتے ہیں، نہ دلائل کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ خدا کے وہ حق ناشناس بندے ہوتے ہیں جو خود خدا کی ذات

والاصفات میں اسکے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کریم کی حقانیت میں بھی اپنی فطرت کے عین مطابق شک کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن حمید کا فیصلہ ہے۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (مہر کردی اللہ نے اُن کے دلوں پر اور انکے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

ترجمہ: یقینی (بات) یہ ہے کہ خدا جسے چاہے گمراہی میں مبتلا رکھتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے (راہ راست پر) لے آتا ہے۔

سو ایسے حق ناشناس اور گمراہ لوگوں سے یہ توقع تو نہیں کہ وہ حق بات کو تسلیم کریں گے، اس کے باوجود میاں صاحب کے اس کوشش کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کارِ خیر کا اجر دے۔ آمین۔

زیر مطالعہ کتاب میں اُستادِ محترم نے چند باتوں کی طرف بطورِ خاص کاکاخیلوں کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کی تصنیفات کیلئے تلاش وجستجو، تعلیمات پر عمل، چراغان کے بارے میں از سرِ نو غور وخوض اور عرس مبارک کے موقع پر بدعات وفواحشات کی بجائے ذکر واذکار کی محافل برپا کرنا۔

کاش! کاکاخیلوں کو بالخصوص اور دیگر پشتون قبائل کو بالعموم خدا یہ توفیق دے کہ وہ ان گم شدہ کتابوں کو تلاش کریں جو حقیقت میں علم و حکمت کا ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ اسی طرح نئی نسل کو خدا یہ صلاحیت دے کہ وہ آنے والے زمانوں میں اصلاح اعمال واحوال کو اپنا وطیرہ بنا سکیں۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

میاں بہادر شاہ ظفر صاحب میرے مشفق و مہربان بزرگ ہیں۔ یہ ان کی کرم نوازی ہے کہ اس کتاب کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں ان کی نگاہ انتخا[illegible] ہیچ مدان پر پڑی۔

بہت [illegible] کی بات ہے استاد محترم نے ایک ضخیم مسودہ میرے حوالے [illegible] ز[illegible] تبہ سے فرمائش کی کہ میں اس مسودہ پر ایک نظر ڈالوں۔ نیز اگر کوئی سی بات میرے علم میں ہو، یا کوئی تجویز میرے ذہن میں آئے یا کسی کمی بیشی کی ضرورت محسوس کروں تو وہ بلا کم و کاست نوٹ کرلوں۔ مشفق و مہربان جناب استاد مکرم کی یہ فرمائش میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی تھی چنانچہ میں نے حسب الحکم مسودہ غور سے پڑھا اور اپنی استعداد کے مطابق چند معروضات ان کی خدمت میں پیش کیں۔

وقت گزرتا رہا، استاد محترم سے گاہ بگاہ ملاقات ہوتی رہی۔ مسودہ کے بارے میں بھی اکثر گفتگو ہوتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ یہ مسودہ کتابی صورت میں کیسے چھپے۔ میرے اندازے کے مطابق مسودہ کی چھپائی پر اخراجات کا تخمینہ کوئی تیس پینتیس ہزار روپے تھا۔ لیکن اتنی بڑی رقم کہاں سے آتی۔ خود استاد محترم کی مالی حالت یہ اخراجات برداشت کرنے کی متحمل نہ تھی۔ کسی پبلشر سے رجوع وہ نہ کرنا چاہتے تھے، کیونکہ پبلشرز مصنفین کو بھیک مانگنے والے فقیروں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں میں نے دو تجاویز پیش کی تھیں۔ پہلی تجویز یہ کہ انجمن کاکاخیل سے یا کاکاخیل قبیلے کے مخیر حضرات سے مدد لے کر کتاب چھپوائی جائے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ سو روپیہ فی حصہ کے حساب سے مخیر لوگوں سے چندہ اکٹھا کیا جائے۔ یہ چندہ دراصل "قرضہ قابل واپسی" ہو۔ کتاب جب چھپ جائے تو جس کی مرضی ہو بحصہ ساوی قرضہ میں کتابیں لے لے [illegible] اور جو کتابیں نہ لیں ان کو

یا از فروخت رقم واپس کی جائے۔ مگر استادِ محترم کو یہ دونوں تجاویز محض اپنی خودداری کی وجہ سے قابلِ عمل معلوم نہ ہوئیں۔ اور یوں یہ معاملہ عرصہ دراز تک معرضِ التواء میں پڑا رہا۔

مسودہ کے مطالعے کے بعد میں نے محترم اُستاد کے سامنے دیگر تجاویز کے علاوہ ایک یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ اگر ممکن ہو تو نظرِ ثانی کر کے اس مسودہ کو امکانی حد تک مختصر کیا جائے۔ میں واقعی مشکور ہوں کہ مشفق و مہربان اُستاد نے میری اس رائے سے اتفاق کیا۔۔۔ لیکن اسکے باوجود چھپائی کا مسئلہ اپنی جگہ لاینحل ہی رہا۔

چند مہینے قبل مہربان استادِ مکرم کا ایک خط میرے نام آیا، انہوں نے لکھا تھا۔۔۔ میں عمر کے اُس حصہ میں ہوں کہ روز بروز میری صحت طبعی عوارض کی وجہ سے گرتی جارہی ہے۔ اعضاء و قویٰ آہستہ آہستہ ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ کمزوری بڑھ رہی ہے۔ خاص طور پر بینائی کی کمزوری نے پریشان کر رکھا ہے۔ دو آپریشن کروا چکا ہوں۔ لیکن لگ بھگ اسی برس کی عمر میں نظر کی بہتری کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

انہوں نے نہایت دکھ بھرے انداز میں لکھا تھا کہ یہ میری زندگی کی آخری کوشش بھی ہے اور خواہش بھی، کہ اپنی اس کاوش کو کتابی صورت میں دیکھوں۔ جس پر میں نے اپنی زندگی کے تقریباً بیس سال محنت کی ہے۔

انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ اب جب کہ کسی طرف سے بھی کوئی اور سبیل نظر نہیں آرہی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ شیخنا حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے حالاتِ زندگی پر مبنی یہ مسودہ میں اپنے خرچ سے چھپوا دوں۔ اس سلسلہ میں طباعت و اشاعت کا کام تمہیں سرانجام دینا ہوگا۔

میرے لئے حقیقتاً اس سے بڑھکر خوشی اور کیا ہو سکتی تھی کہ میں اُستاد محترم کے کسی کام آؤں۔ میرا سبب حد اعلیٰ کی زندگی پر یہ تحقیقی کتاب منظرِ شہود

پر آئیے۔ چنانچہ میں نے فوراً حامی بھر لی۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ کتابت کا تھا۔ اُستاد محترم کا باریک خط، مسودے میں کاٹ چھانٹ، نوٹا ناٹی۔ مخصوص قسم کے نام۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے ہمیں ایک ایسے کاتب کی ضرورت تھی جو کم خرچ میں یہ کام بخوشی سرانجام دینے کا بیڑا اٹھائے۔ ظاہر ہے یہ کام مشکل تھا لیکن اُستاد محترم کی اور میری بھی یہ خواہش تھی کہ یہ کام میاں صاحب سناء الدین کاکاخیل کاتب کے ہاتھوں پورا ہو۔ کیونکہ (اگرچہ خط تو بہ نسبت دوسرے خوشنویسوں کے ان کا اتنا اچھا نہیں مگر) کاکاخیل اور پیدائشی مولد یہاں ہونے کی وجہ سے یہ کام صرف وہی سرانجام دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں صرف مکھی پر مکھی مارنے والے کاتب کی نہیں ایک صاحب ذوق دقیق النظر اور عالم کاتب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ الحمدللہ کہ اس کام کے لئے میاں سناء الدین صاحب نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے حامی بھی بھر لی اور پھر وقت بھی نکالا۔ اور حقیقت یہ ہے انہوں نے صرف کتابت ہی نہیں کی بلکہ دقیق نظر سے اصلاح بھی فرماتے رہے۔

دوسرا مرحلہ پروف کے پڑھنے کا تھا۔ مجھے دعوی تو نہیں البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر قارئین کرام کو کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو وہ مصنفِ کتاب یا کاتب کے کھاتے میں نہ ڈالیں۔ بلکہ وہ میری ناقص نگاہی کی وجہ سے رہ گئی ہو گی۔ جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

میں خود کو یقیناً اس قابل نہیں سمجھتا کہ ایک ایسے مہتم بالشان دلی اللہ کے بارے میں لکھی ہوئی تحقیقی کتاب کے بارے میں دو چار حرف بھی لکھ سکوں۔ لیکن یہ میرے قابل صد احترام اُستاد کی خواہش و فرمائش بھی جو میرے لئے حکم سے کم نہ تھی، کہ میں ضرور کچھ نہ کچھ اس کتاب کے بارے میں لکھوں

چنانچہ یہ چند سطور بہ امر مجبوری سپرد قلم کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے درجات اور بلند کرے، اور اس کتاب کے لکھنے والے اور پڑھنے والوں پر حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے طفیل اپنا رحم و کرم کرے۔ آمین یارب العٰلمین

فقط

ادنیٰ خادم نبیرۂ حضرت شیخ جیو رحمکار نور اللہ مرقدہ
سیف الرحمٰن سید کاکاخیل

پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی
۲۶ جون سنہ ۱۹۸۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں انسانوں کی فلاح و بہبود و رہنمائی کیلئے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا ہے۔ جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی ہر قسم کی تکالیف و مصائب کا سامنا کر کے انسانوں کی رہنمائی اور اصلاح کا فریضہ بدرجۂ اتم سرانجام دیا ہے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ فریضہ ان کے اصحابِ کرام سرانجام دیتے رہے۔ جنہوں نے گم کردہ راہ انسانوں کو راہِ راست پر لانے میں اپنی عزیز عمریں صرف کیں۔ ان کے بعد یہ فریضہ علماء امت اور اولیاء اللہ کے ذریعے سرانجام دیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں نے ہر دور میں دکھی انسانیت کی فلاح و بہبود اور انکو راہ راست پر لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں ان نفوسِ قدسیہ کی بے لوث کوششوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

ان اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مایوس اور دل گرفتہ انسانوں کو ایک نئی حرکتِ ایمانی عطا کی۔ اور فضا میں کفر والحاد اور تذبذب و اوہام کی جو تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں، توحید الٰہی اور اتباعِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے انہیں روشن کیا۔ اور ہزاروں لاکھوں گم کردہ راہ انسانوں کو راہ راست پر لگایا۔ اور انکو یقینِ محکم اور سکونِ قلب کی دولت سے مالامال کیا۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے دوسرے

اسلامی ممالک کی طرح برصغیر پاک و ہند کے ہر ایک خطے میں بھی موجود ہیں اور پشتونخوا کے ہر ایک گوشے میں بھی بہت سے اولیاء اللہ ہو گذرے ہیں۔

ان اولیاء کرام میں کچھ تو ایسے ہیں جنکے ناموں اور کاموں سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ اور ان کے حالاتِ زندگی پردہ اخفاء میں ہیں۔ مگر بہت سے ایسے بھی ہیں، جنکو اللہ تعالیٰ نے زندگی میں بھی شہرت و مقبولیت بخشی اور بعد از وفات بھی ان کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ان نیک اور خاص الخاص بندوں میں سے ایک بندہ خاص قطب الاقطاب شیخ المشائخ حضرت سید کستیر الملقب بہ رحمکار دالمعروف بہ کاکا صاحبؒ بھی ہیں جنکا مقام تصوف کی دُنیا میں بہت بلند و ارفع ہے۔ آپ فقر کے بادشاہ، مرد قلندر اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ آپ نے محبت الٰہی میں تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ آپ کی کسرنفسی کی یہ حالت تھی کہ اپنی ذات کے لئے پیر، مرشد، صوفی، سالک، مشیخت پناہ وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو "عبداللہ" یعنی بندۂ خدا کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

آپ کی سب سے بڑی کرامت شریعت نبوی پر استقامت ہے۔ آپ نے جس طرح ہزارہا طالبان حق کو اپنی زندگی میں مدارج کمال پر پہنچایا تھا، اسی طرح بعد از وفات بھی آپکی یہ فیوضات جاری ہیں۔ اور خلوص کی دولت سے مالا مال خوش قسمت زائرین آپکے مزار پُرانوار پر حاضری کے وقت اسے محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس بلند و ارفع مقام پر فائز کیا تھا، اس مختصر سی کتاب میں اسکی چند جھلکیاں دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ فکر و نظر، طبع و مذاق، اسالیب و انداز اور قدار

کبھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اگرچہ عقیدہ اپنی جگہ پر اٹل رہتا ہے۔ اسلام پر آج بھی مسلمانوں کا عقیدہ اتنا محکم اور اٹل ہے، جتنا آج سے چودہ سو برس پیشتر تھا۔ بزرگانِ دین اور صوفیائے عظام سے لوگ آج بھی اتنی عقیدت رکھتے ہیں جتنی انکے زمانے میں رکھتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پہلے اگر لوگوں کی نظر میں کرامت کی اہمیت تھی، تو اب سیرت و کردار کو اہمیت حاصل ہے۔ پہلے اگر کرامت کی داستانیں ایمان و عقیدت میں استحکام پیدا کرتی تھیں تو اب سیرت و کردار کے واقعات زندگی کو بنانے اور عمل کو سنوارنے میں مدد دیتے ہیں۔ میں نے حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کی حالاتِ زندگی میں یہی بات پیشِ نظر رکھی ہے۔

اس کتاب کی تالیف میں میں نے جن کتابوں سے کم یا زیادہ استفادہ کیا اسکی تفصیل مختصراً یہ ہے۔

۱۔ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب نے جن اجداد کرام کے مختصر حالات میں نے اس کتاب میں لکھے ہیں۔ وہ ایک قلمی مسودے سے اخذ کئے گئے ہیں۔ جو محترم میاں محمد بادشاہ کاکاخیل مرحوم کی ملکیت تھی۔ اور اب سنا ہے، کہ میاں صاحب مرحوم کے قلمی مسودات کا وہ ذخیرہ پشتو اکیڈمی (پشاور یونیورسٹی) نے حاصل کیا ہے میاں صاحب مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ حضرت شیخ رحمکار اور ان کے اجداد کے حالات معلوم کرنے میں صرف کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے افغانستان و ہندوستان کے کئی حصوں کے کئی بار سفر لئے تھے اور بلاشبہ اپنے زمانے میں کاکاخیلوں کے سلسلے میں اپنی معلومات کے لحاظ سے ایک زندہ تاریخ تھے۔ اس قلمی مسودے میں جن کتابوں کے نام بار بار آتے ہیں اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

دقائق الانوار (عبدالمتین مشہدی)، نفحات الانس (مولانا عبدالرحمن جامی)
معارج الانوار (ابوالقاسم)، جامع التواریخ (شیخ رشید سمرقندی) [illegible]

(مولانا جامی) جامع الانساب، بحر الانساب، عادۃ السعادت، شرائف عثمانی، مرأۃ آفتاب نما، ہفت اقلیم (امین احمد رازی) مخبر الواصلین (محمد فاضل اکبرآبادی) نفحات (شیخ الاسلام احمد جام بن یونس، تذکرہ دولت شاہ سمرقندی) مجمع البرکات (عبداللہ شاہ بخاری) نفحات (شیخ ابوالحسن جرجانی)۔

اس قلمی مسودے میں حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کے اجداد میں سے ہر شخصیت کا حال جس کتاب سے ماخوذ ہے، اُس کتاب کا نام مصنف کا نام نیز باب، صفحہ اور جلد وغیرہ غرض تمام تفصیلات لکھی ہوئی ہیں۔ اور ہر شخصیت کی تاریخ پیدائش و وفات سالوں اور لفظوں میں لکھی ہوئی ہے۔ اور بعض کے ساتھ ایسے اشعار یا مصرعے بھی لکھے ہوئے ہیں جن سے انکی تاریخ ولادت و تاریخ وفات بحساب ابجد معلوم ہو سکتی ہیں۔ اور حضرت رحمکار کے جن اجداد کرام کا دوسرے اولیاء اللہ سے روحانی رابطہ رہا ہے، اُن کے نام بھی میں نے اسی قلمی مسودے سے اخذ کئے ہیں۔ غرض یہ قلمی مسودہ حضرت رحمکارؒ اور ان کے اجداد کرام کے حالات معلوم کرنے میں نہایت مفید ہے۔

اس کے علاوہ میں نے حسب ذیل کتابوں سے بھی کم و بیش استفادہ لیا ہے:

۲۔ انوار الاولیاء (سید رئیس احمد جعفری ندوی)

۳۔ تذکرۂ اولیائے ہند، جلد اول و دوم (مولفہ مرزا احمد گورگانی)۔

۴۔ تذکرۃ الاولیاء (اس کتاب کے اول و آخر کے صفحات نا پید ہیں۔ اور مؤلف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کتاب میں دور اول کے صوفیائے عظام کے حالات لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے حضرت شیخ فریدالدین عطار کے تذکرے کا اُردو ترجمہ ہو۔

۵۔ تاریخ الامت حصہ سوم، چہارم، پنجم اور ششم (علامہ اسلم جیراجپوری)۔

۔ تاریخ اسلام حصہ سوم (اکبر شاہ خان نجیب آبادی)۔

۷۔ ہسٹری آف دی سارا سین (جسٹس سید امیر علی مرحوم)
۸۔ افغانستان کی مختلف تاریخیں۔
۹۔ تذکرۂ اولیائے سرحد (عبدالقدوس ہاشمی)
۱۰۔ روحانی رابطہ (عبدالحلیم اثر افغانی)
۱۱۔ تذکرۂ شیخ رحمکار (مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل)
۱۲۔ التکشف عن المہمات التصوف (حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی)
۱۳۔ اشرف السوانح (حصہ دوم و سوم)
۱۴۔ مجمع البرکات (سید عبداللہ شاہ بخاری)
۱۵۔ مناقب منظوم (میاں شمس الدین کاکاخیل مرحوم)
۱۶۔ تاریخ مرصع (افضل خان خٹک مرحوم)
۱۷۔ تذکرۃ الاولیاء (حضرت فقیر جمیل بیگ صاحب قدس سرہٗ)
۱۸۔ مقامات قطبیہ و مقالات قدسیہ (تصنیف حضرت شیخ عبدالحلیم قدس سرہٗ)
۱۹۔ مختلف قلمی صورت میں شجرے۔

جہاں تک حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کے حالات و مناقب کا تعلق ہے، اس کا زیادہ تر حصہ حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کی کتاب مقامات قطبیہ سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب حضرت شیخ دانشمند نے اپنی وفات سے چار سال قبل ۱۰۹۲ھ میں لکھی تھی۔ اور خوش قسمتی سے دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی تھی۔ یہ کتاب حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کے ایک نواسے ابو اسد اللہ مہتد اللہ مرحوم نے ۱۳۱۸ھ میں طبع کرائی ہے۔ اور اس طرح سے یہ بیش قیمت علمی سرمایہ ہمارے ہاتھوں تک پہنچ گیا ہے۔ ورنہ یہ کتاب بھی بہت سی دوسری کتابوں کی طرح ضائع ہو جاتی

۔ کتاب فارسی میں ہے ۔ زبان مشکل ہے ۔ کتاب میں آیات قرآنی اور احادیث سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ۔ اور تصوف و سلوک کے باریک و دقیق مسائل بھی اسمیں موجود ہیں ۔ دوسرے صوفیائے کرام کے اقوال بھی جابجا ذکر کئے گئے ہیں ۔ اور انکی تصانیف کے حوالے اور اقتباسات بھی ہیں ۔ ان باتوں کی وجہ سے عوام اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔ مطبوعہ نسخے میں کتابت کی غلطیاں بھی بہت ہیں ۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھی عاریتاً ملا تھا یہ قلمی نسخہ نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے ۔ کتاب کے آغاز میں ان آیات قرآنی کی ایک فہرست سورت و رکوع کی قید کے ساتھ الگ دی گئی ہے جو اس کتاب میں جابجا مذکور ہیں ۔ مناقبات کو بھی عنوانات کے لحاظ سے تقسیم کر کے انکی فہرست دی ہے ۔ خط بھی بہت اچھا اور غلطیوں سے پاک ہے ۔ علاوہ ازیں مطبوعہ کتاب کی نسبت اس قلمی نسخے کی ترتیب بھی موزون ہے ۔ میں نے زیادہ تر استفادہ اس قلمی نسخے سے کیا ہے ۔

فقیر جمیل بیگ صاحبؒ کی قلمی کتاب تذکرۃ الاولیا پشتو اکیڈیمی کے کتبخانہ میں موجود ہے ۔ اور میں نے بھی اکیڈیمی میں اس سے جستہ جستہ مقامات کا مطالعہ کیا ہے ۔ اس کے علاوہ ردی بیچنے والے ایک دکاندار سے اتفاقاً میں نے فارسی کے چند پرانے رسالے خریدے تھے تو ایک رسالے میں اسی تذکرۃ الاولیاء کے حوالے سے کاکا صاحبؒ کے کچھ حالات کبھی درج تھے ۔

اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تذکرۃ الاولیاء کا ایک قلمی نسخہ کابل میں پشتو ٹولنہ کے پاس بھی موجود ہے ۔

تاریخ مرصع کا بھی جستہ جستہ مقامات کا مطالعہ اور اس سے کچھ استفادہ کیا ہے ۔

مجمع البرکات ایک ضخیم قلمی کتاب ہے۔ جو سید عبداللہ شاہ بخاری ساکن شیر درہ (داور مولدا چارسدہ) کی تالیف ہے۔ مؤلف عالم و فاضل انسان تھے۔ کتاب فارسی میں ہے۔ مصنف نے حالات و واقعات جمع کرنے میں بڑی کد و کاوش کی ہے۔ اور تحقیق و تفتیش میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی ہے۔ اکثر کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ بعض بعض جگہوں میں خوش عقیدتی کے باعث مبالغہ آرائی بھی کی ہے۔ کہیں رطب و یابس بھی موجود ہے۔ باین ہمہ حضرت رحمکار کاکا صاحب قدس سرہ کے حالات و سوانح کے بارے میں ایک بہت عمدہ معلوماتی کتاب ہے ابھی تک ہمیں اس کتاب کا صرف ایک ہی نسخہ معلوم تھا جو حکیم مولانا لطیف اللہ باکاخیل مرحوم کے صاحبزادوں کے پاس ہے۔ یہ قلمی مسودہ حکیم صاحب مرحوم کے والد مرحوم نے کسی اور قلمی مسودے سے ۱۲۸۵ھ میں نقل کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل کتاب اس وقت سے پہلے کی تالیف ہے۔ خوش قسمتی سے اب سے چند ماہ پہلے اس کتاب کا دوسرا نسخہ بھی دریافت کیا گیا۔ یہ قلمی مسودہ گورنمنٹ کالج کیمبل پور کے لائبریرین محترم صوفی نذر محمد صاحب صابری کی ذاتی ملکیت ہے۔ اس قلمی مسودے پر تاریخ تصنیف درج نہیں، مگر زیارت کاکا صاحب والے نسخے کی نسبت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ اسلئے یہ مسودہ مصنف کا خود لکھا ہوا ہوگا۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کتاب کے اور نسخے بھی موجود ہونگے۔ اور توقع کی جاسکتی ہے کہ شاید مستقبل قریب میں معلوم ہو جائیں۔ بہر حال اصل کتاب بارھویں صدی ہجری کے اختتام کے لگ بھگ لکھی گئی ہوگی۔

اگرچہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کے سوانح و حالات میں گزشتہ ادوار میں ان کے معتقدین و مریدین نے متعدد کتابیں لکھی تھیں مگر ہماری بدقسمتی

سے وہ تمام کتابیں زمانے کی ستم ظریفی اور اپنے مالکوں کی ناقدر شناسی کے باعث ضائع ہو گئی ہیں۔ اور یا دوسروں کے ہاتھوں پہنچ چکی ہیں۔ اور آج بھی اگر کسی کے پاس کوئی قلمی نسخہ موجود ہے، تو وہ اسے دوسروں کو استفادہ کرنے کی نسبت اسے کیڑوں کی خوراک بن جانے کو اچھا سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اس ضیاع اور اس رویئے کو بہت بری طرح محسوس کرتے ہیں۔

غالباً ۱۹۵۱ء میں پہلی بار جناب مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل (ممبر اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان) نے پہلی بار "تذکرہ رحمکار" کے نام سے حضرت کاکا صاحبؒ کے حالات و سوانح میں ایک پُر از معلومات کتاب لکھی تھی، جو بہت مقبول ہو کر جلد ختم ہو گئی۔ جناب مفتی صاحب نے کچھ عرصہ بعد مزید اضافوں کے ساتھ یہ کتاب دوبارہ طبع کرائی۔ لیکن اب وہ بھی بہت عرصہ سے ناپید ہے چونکہ مفتی صاحب موصوف اپنی دوسری علمی سرگرمیوں اور مشاغل میں منہمک رہتے ہیں، اس لئے اس قسم کی کتاب کی انکو لکھنے کیلئے فرصت ہی میسر نہیں۔ دوسری طرف حضرت کاکا صاحب قدس سرہٗ کے معتقدین کی طرف سے حضرت ممدوح کی سوانح و حالات کے بارے میں مصدقہ معلومات پر محیط کتاب کا تقاضا شدت سے جاری ہے۔

چونکہ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی اور بے مائیگی کا پورا پورا احساس و اعتراف ہے۔ اس لئے حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کے علوِ شان اور رفعت مقام کو ذہن میں لاتے ہوئے میں اس قسم کی کتاب لکھنے کی اہلیت و استعداد خود میں نہیں پاتا تھا۔ لیکن اپنے مخلص احباب کا جنکو میری تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے علم کے باوجود میرے بارے میں کچھ حسن ظن ہے، اصرار تھا کہ میں اس کام سے پہلوتہی نہ کروں۔ چنانچہ میں نے کافی تذبذب اور ذہنی کشمکش کے بعد

اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا۔ اور ۱۹۷۸ء کے آخر تک اسے مکمل کیا۔ لیکن یہ مسودہ بعض وجوہات کے باعث بہت ہی ضخیم تھا۔ اور بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے میں اسے شائع نہ کر سکا۔ یہ مسودہ میرے پاس بارہ سال تک پڑا رہا۔ چونکہ میرے مالی وسائل ایک ضخیم کتاب کی اشاعت کے متحمل نہیں ہو سکتے، اور میری صحت دن بہ دن گرتی جا رہی ہے اور آنکھیں جواب دے رہی ہیں۔ اسلئے میں نے اپنے سابقہ مسودے کو ممکن حد تک مختصر کر دیا۔ خدا کرے کہ میری توقع پوری ہو اور یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائے۔

اگرچہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کے حالاتِ زندگی کو حسبِ دلخواہ بیان کرنے کے لئے نہ تو میرے قلم میں سکت اور طاقت ہے اور نہ میری زبانِ عاجز میں اظہارِ بیان کے لئے یارا اور سہارا، پھر بھی میں نے اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود اس توقع کے ساتھ قلم اٹھایا ہے کہ کم از کم حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ کے سوانح نگاروں کی فہرست میں میرا نام بھی شامل ہو جائے کیونکہ ؎

مرا این بس کہ داند ماہر دیم
کہ من نیز از خریدارانِ اویم

اللہ تعالیٰ سے میری یہ دعا ہے، کہ وہ اپنے فضل و کرم سے مجھے اس فریضہ سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور میرے قلم سے دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو حضرت ممدوح کے علوِ شان کے منافی ہو۔ یا جس سے کسی کی دل آزاری ہو جائے۔ کیونکہ بقول عارف شیرازی ؎

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازین گناہے نیست

ایک ضروری گذارش: (۱) جیسا کہ صفحات گزشتہ میں عرض کیا ہے (۲) کتاب کا مسودہ [illegible] تک لکھا جا چکا تھا۔ مگر بعض ناگزیر وجوہات کے باعث اسکی اشاعت ممکن نہ ہو سکی تھی۔

اس کتاب کا تقریباً حصہ زیادہ جناب سرفراز خان عقاب صاحب کے کتابچے موسومہ "[illegible] صاحب" کا جواب ہے۔ اس وقت عقاب صاحب بقید حیات تھے۔ مگر اب جبکہ مسودے کی کتابت مکمل ہوئی۔ مجھے ان کے فوت ہو جانے کا علم ہوا۔ لیکن اب اس مسودے میں کسی تبدیلی کا امکان نہ تھا۔ چنانچہ اب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم دونوں کے گناہوں اور خطاؤں کو معاف فرمائے۔

(۲) ان دنوں مجھے جناب پریشان خٹک صاحب کی کتاب "پشتون کون؟" کے بعض حصوں کے نہایت سرسری مطالعے کا موقع ملا۔ مجھے ان کی کتاب یا ان کے نظریے کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ باتیں میرے اس کتاب کے موضوع اور مقصد سے باہر ہیں۔ البتہ اس کتاب میں ایک دو باتیں ایسی ہیں جو میرے لئے انتہائی حیرت و استعجاب کا باعث ہیں۔ اور میرے [illegible] مذکور ایک انتہائی اہم شخصیت کے مسلک اخلاق اور ان کے کردار سے ان کا [illegible] ہے۔ اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ میں جناب پریشان خٹک صاحب کے اس دعوے اور موقف کی تردید میں اپنے موقف کو واضح کر دوں۔

(۱) جناب پریشان صاحب لکھتے ہیں: "خوشحال خان کی اجازت کا جو [illegible] ان کا داماد شیخ ضیاء الدین پیش [illegible]

کی کارستانیوں کو برداشت کر رہا تھا۔ مگر مہابت خان کو دیس نکالا دینے اور خوشحال خان کے برخلاف عملی اقدامات کرنے کے بعد اسے مزید برداشت کی طاقت نہ تھی"۔

ج۔ "بہرام خان ان احساسات میں ان کا شریک تھا۔ یہ دونوں اشرف خان کے کردار کو عمل کی روشنی میں نزدیک سے دیکھ رہے تھے۔ پہلے خوشحال خان کی رہائی کا انتظار کیا۔ اس کے بعد خوشحال خان کی اجازت کا"۔

د۔ "شیخ ضیاء الدین نے سب سے پہلے یہ کیا، کہ مہابت خان کو اشرف خان کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ اور اسے معزول کر کے منصب بہرام خان کو دلوادیا"۔ (پشتون کون؟ ص ۴۵۹)

سطور بالا میں شیخ ضیاء الدین شہید سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں، وہ ہماری قومی روایات کے مطابق جو کم و بیش ساڑھے تین سو سال سے پشت بہ پشت اور سینہ بہ سینہ محفوظ چلی آرہی ہیں۔ نیز تاریخی شواہد کی روشنی میں حضرت شیخ ضیاء الدین شہید کے مسلک، اخلاق و کردار کے قطعاً منافی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ بہرام خان کی حمایت کے جوش میں اس کے کردار کو پس منظر میں رکھنے کی خاطر خواہ مخواہ ناکردہ گناہ شیخ ضیاء الدین شہید کو ان دونوں بھائیوں کی گندی سیاست میں ملوث کرنے کی کوشش ہے۔ اس لئے میں طوالت سے بچنے کی خاطر نہایت اختصار کے ساتھ وہ واقعات لکھتا ہوں، جن سے خود بخود مندرجہ بالا سطور میں اختیار کردہ دعوے اور موقف کی تردید ہو جائیگی۔

اصل واقعات: ۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت ضیاء الدین شہید اشرف خان و بہرام خان دونوں کے بہنوئی تھے۔ جب تک خوشحال خان مغلوں کا منصبدار اور با اقتدار تھا، حالات معمول کے مطابق تھے۔ لیکن ۱۰۷۴ھ بمطابق ۱۶۶۴ء میں خوشحال خان

کو گرفتار کر کے ہند بھیجا گیا، جہاں وہ کم و بیش چار ساڑھے چار سال تک قید و نظر بند رہے۔ خوشحال خان کی غیر حاضری میں اشرف خان مغلوں کا منصبدار ہُوا تھا۔ اور یہیں سے اشرف خان و بہرام خان کے درمیان اقتدار کے لئے خاندانی مخالفت شروع ہوئی۔ جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اور دونوں بھائی مغلوں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے کسی بھی حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ خوشحال خان کی رہائی کے بعد بھی چونکہ اشرف خان منصب پر فائز تھا۔ دونوں بھائیوں کی مخالفت میں بھی کمی نہیں آئی تھی۔

دونوں بھائیوں کی اس شدید مخالفت کو ختم کرنے کے سلسلے میں شیخ ضیاءالدین شہیدؒ نے کئی بار مختلف اوقات میں ان کے درمیان مصالحت کرائی تھی۔ لیکن یہ مصالحت اس لئے دیرپا ثابت نہیں ہوتی تھی۔ کہ ہر بار اشرف خان شرائطِ مصالحت سے منحرف ہو جایا کرتا تھا۔ اور چونکہ اشرف خان منصبدار اور برسر اقتدار تھا۔ اس لئے بہرام خان اُسکے ہاتھوں دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ رہائی کے بعد خوشحال خان اگرچہ مغلوں کا زخم خوردہ تھا۔ پھر بھی اُس نے مغلوں کی عملی مخالفت سے اپنے آپ کو روکے رکھا تھا۔ مگر جب مہابت خان تیسری بار ولایت افاغنہ کا گورنر مقرر ہو کر آیا۔ تو اُس نے خوشحال خان کو مغلوں کا منصب قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہا۔ اور خوشحال خان کی طرف سے دوٹوک الفاظ میں انکار کرنے سے مہابت خان بھی خوشحال خان کا مخالف ہُوا۔ اور اس نے اشرف خان سے اس بات کا مچلکہ لے لیا۔ کہ وہ اپنے علاقے میں اپنے باپ کو نہیں چھوڑے گا۔ اس بات کا خوشحال خان پر نہایت برا اثر ہُوا۔ اور اس نے مغلوں کے خلاف مسلح عملی اقدامات کرنے شروع کئے۔ اور دوسرے [illegible] کو بھی مغلوں کی مخالفت پر آمادہ کرنے کے لئے دورے کرنے لگا۔

ان حالات میں حضرت ضیاءالدین شہید نے اس فساد آلود ماحول سے نکلنے اور اپنا مسکن چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ اور جیسا بارک خٹک کے ملکوں اور معززین کو آپ کے اس ارادے کا علم ہُوا۔ تو انہوں نے آپ کے پاس ایک جرگہ بھیجا۔ اور آپ کو بارک خٹک کے علاقے میں مستقل طور پر رہائش اختیار کرنے کی پیشکش کی۔ اور آپ نے یہ پیشکش قبول کرلی۔ چنانچہ آپ مع اہل وعیال اور خاص خاص مریدوں کے بارک خٹک کے علاقے میں جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ لیکن جب اشرف خان کو آپ کے وطن چھوڑنے اور بارک خٹک میں جانے کا علم ہُوا۔ تو اُس نے فوراً آپ کے پیچھے پچاس ساٹھ سوار دوڑائے جنہوں نے آپ کو علاقہ خوڑہ میں کسی جگہ جالیا۔ اور آپ کو اشرف خان کا پیغام پہنچایا۔

اشرف خان نے آپ کو اکوڑہ خٹک آنے اور مشورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ ساتھ ہی اپنے سواروں کو ہدایت بھی کی تھی۔ کہ آپ کو بہر حال اکوڑہ لایا جائے۔ اور کوہاٹ جانے نہ دیا جائے ـــ شیخ ضیاءالدین کو اپنے ساتھیوں نے اکوڑہ نہ جانے کا مشورہ دیا۔ مگر چونکہ اشرف خان کے سوار آپ کے لیجانے پر بضد تھے اس لئے آپ اپنے اہل وعیال کو راستے ہی میں چھوڑ کر دو تین خاص مریدوں کے ساتھ اشرف خان کے سواروں کی معیت میں اکوڑہ آئے۔ یہاں اشرف خان نے آپ کو بارک خٹک جانے سے سختی کے ساتھ منع کیا۔ لیکن آپ نے اُس کی بات نہ مانی۔ تو آپ کو ایک کمرے میں قید کرلیا۔ آپ دس دن تک قید رہے۔ اس دوران ایک لونڈی کے ذریعے آپ کو زہر دیا گیا۔ جس سے آپ شہید ہوگئے اور گیارھویں دن آپ کی لاش گاؤں بھجوادی گئی۔ اور مشہور یہ کیا کہ آپ کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔

میاں محمد مبین مصنف مناقب شیخ رحمکار قدس سرہ کے مطابق اشرف خان کے ہاتھوں شیخ ضیاءالدین کی شہادت سنہ ۱۰۸۶ھ میں واقع ہوئی تھی۔ گویا اشرف خان کی معزولی سے چھ سال پہلے۔

اشرف خان کی معزولی اور گرفتاری: شیخ ضیاءالدین کی شہادت کے تھوڑے عرصے بعد اورنگ زیب نے مہابت خان صوبہ دار کو واپس بلالیا اور اپنے بڑے بیٹے شہزادہ معظم کو شاہ عالم بہادر کا خطاب دیکر اسے پشتونوں کی مہم پر بھیجا۔ شہزادے

کی خصوصی درخواست پر میر خان میر میران کو امیر خان کا خطاب دیکر ولایت افغنہ کا گورنر مقرر کیا گیا یہ امیر خان خوشحال خان کا دوست تھا۔ شہزادہ اور امیر خان جب اٹک پہنچے، تو انہوں نے خوشحال خان کو پشاور میں شہزادہ سے ملاقات کی دعوت دی۔ چنانچہ خوشحال خان نے بادل ناخواستہ پشاور میں شہزادہ سے ملاقات کی۔ اور پھر شہزادے کی معیت میں لنڈی خانہ میں امیر خان سے بھی ملاقات کی۔ اس عرصے میں اشرف خان مغلوں کا منصبدار تھا۔ شہزادے اور امیر خان دونوں نے خوشحال خان کی بڑی دلجوئی کی۔ اور اُسے منصب قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ مگر خوشحال خان نے معذرت ظاہر کردی۔ امیر خان نے ولایت افاغنہ میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی شروع کی اور اس کی یہ پالیسی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ پشتون آپس میں لڑنے لگے۔ اور ہر فریق امیر خان سے ہدایات لیتا رہتا تھا۔ امیر خان اشرف خان کے رویئے سے مطمئن نہ تھا۔ اسلئے بادشاہ کی اجازت سے اسے سنہ ۱۰۹۲ھ میں پشاور میں گرفتار کرکے ہندوستان بھیجا۔ جہاں سے وہ بیجاپور بھجوایا گیا۔ اور وہاں تقریباً چودہ سال قید رہنے کے بعد سنہ ۱۱۰۶ھ میں قید کی حالت میں فوت ہوا۔ اور وہیں دفن کیا گیا۔

اب یہ بات میرے لئے انتہائی باعث تعجب ہے کہ شیخ ضیاء الدین سنہ ۱۰۸۶ھ میں اشرف خان کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں۔ اور اس کے چھ سال بعد اشرف خان کو صوبدار امیر خان نے گرفتار کرکے معزول کیا ہے اور اسے ہندوستان بھیجا ہے۔

اس صورت میں میں نہیں سمجھ سکتا، کہ بقول پریشان خٹک صاحب شیخ ضیاء الدین نے کیسے مہابت خان کو اشرف خان کے کردار سے آگاہ کرکے اسے معزول کرایا۔ اور اس کا منصب بہرام خان کو دلوادیا۔ جبکہ نہ تو اس وقت مہابت خان گورنر تھا۔ اور شیخ ضیاء الدین صاحب بھی اس سے چھ سال پہلے اشرف خان کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی عقل و درایت کی روشنی میں غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ ولایت افاغنہ مغل سلطنت کا ایک دور افتادہ شورش اور فساد زدہ صوبہ تھا۔ اور اکبر سے لیکر اورنگ زیب تک ہر ایک

بادشاہ کے لئے یہ ایک رِستا ہُوا ناسور تھا۔ پھر ایسے خطرناک صوبے کا گورنر اتنا غافل اور بے پرواتھا، کہ وہ اشرف خان جیسے شاطر منصب دار کے افعال واعمال سے اپنے وسائل و ذرائع سے مطلع نہ ہوسکتا تھا۔ اور اس پر نظر نہیں رکھتا تھا؛ اور پھر شیخ ضیاء الدین کا اس پر اتنا اثر تھا، کہ جونہی انہوں نے اشرف خان کے اعمال سے صوبہ دار کو مطلع کیا۔ اور بہرام خان کی سفارش کی، تو صوبہ دار نے فوراً اس پر عمل کیا؛

تاریخ نویسی کا یہ انوکھا انداز ہے ـــ اور اس بارے میں میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ ع

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

میاں محمد مبین کی شہادت نہایت مستند ہے۔ کیونکہ وہ حضرت ضیاء الدین شہید کے پڑپوتے ہیں۔ بایں تفصیل کہ: محمد مبین ابن عیاذ الدین ابن قیاس الدین ابن ضیاء الدین شہید۔

بہرام خان کی وفات کے بعد جب افضل خان خود مغلوں کا منصبدار ہُوا۔ اس وقت شیخ ضیاء الدین شہید کے بیٹے اور بھتیجے جوان ہو چکے تھے اور دونوں نے اپنے مریدوں کی حمایت پر افضل خان سے کئی لڑائیاں بھی لڑیں۔ جن میں میاں محمد مبین کا والد بھی شریک رہا ہے۔ اس لئے اگر ان دنوں محمد مبین کم عمر بھی ہوگا۔ تب بھی چونکہ حضرت ضیاء الدین کی شہادت کاکاخیلوں کے لئے ایک عظیم المیہ تھا۔ اس لئے اُس کی شہرت کسی بھی وقت ماند نہیں پڑی تھی، لہٰذا میاں مبین نے جو تاریخ لکھی ہے، وہ یقیناً مستند ہے۔

قارئین سے میری درخواست ہے، کہ اگر ان کو اس کتاب میں کوئی خوبی نظر آئے، تو وہ اسے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کا فیض سمجھیں اور اسکی خامیوں کو میری ذاتی کوتاہیوں اور علمی بے مائیگی پر محمول کرکے مجھے اس سے مطلع کریں تاکہ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان غلطیوں کی اصلاح کروں۔

میں اپنے اُن مخلص احباب' میاں خلیل گل صاحب، جناب قلندر مومند صاحب، جناب سیف الرحمٰن سید اور جناب میاں سناء الدین کاکاخیل کا انتہائی شکر گزار ہوں۔ کہ اول الذکر ہر دو احباب نے اس مسودے کو از اول تا آخر پڑھا اور مجھے اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرمایا۔ اور جناب سیف الرحمٰن سید نے کتابت شدہ مسودے کو بار بار پڑھا اور انتہائی خلوص اور دیدہ ریزی کے ساتھ مسودے کی اغلاط کو درست کیا۔ اور جناب میاں سناءالدین صاحب نے ان اغلاط کو نہایت محنت سے درست کیا۔ میری مخلصانہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اس بے لوث محنت کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

زیارت کاکا صاحب
۱۶ ستمبر ۱۹۸۶ء

نیاز آگین
بہادر شاہ۔ ظفر

شجرہ نسب

سرتاج اولیاء قطب الاقطاب حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ کا شجرہ نسب

۱- حضرت سید کستیر الملقب بہ رحمکار و المعروف بہ کاکا صاحب قدس سرہ العزیز تاریخ پیدائش ۳۰ شعبان / یکم رمضان سنہ ۹۸۳ھ۔ تاریخ وفات ۲۴ رجب یوم جمعہ سنہ ۱۰۶۳ھ مزار زیارت کاکا صاحبؒ (نوشہرہ۔ پشاور)۔

۲- ابن قدوۃ السالکین سراج العارفین حضرت شیخ بہادر المعروف بہ اکب بابا قدس اللہ سرہ العزیز۔ تاریخ پیدائش سنہ ۹۴۱ھ۔ تاریخ وفات سنہ ۱۰۲۷ھ مزار نزد موضع کنا خیل تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور

۳- ابن حضرت سید نادر المعروف بہ مست بابا قدس سرہٗ۔ تاریخ پیدائش سنہ ۹۰۵ھ۔ تاریخ وفات سنہ ۹۶۹ھ۔ مزار موضع شیخے۔ نوشہرہ۔

۴- ابن سید غالب الدین المعروف بہ غالب بابا و سنی سردر بابا قدس سرہ تاریخ پیدائش سنہ ۸۵۸ھ تاریخ وفات سنہ ۹۳۱ھ مزار نزد موضع مروبہ علاقہ خوئرہ تحصیل نوشہرہ (پشاور)

۵- ابن حضرت سید آدم صاحب قدس سرہٗ۔ تاریخ پیدائش سنہ ۸۰۶ھ تاریخ وفات سنہ ۸۷۲ھ۔ مزار نزد موضع کربوغہ (ضلع کوہاٹ)

۶- ابن سید لسیین قدس سرہ۔ تاریخ پیدائش سنہ ۷۶۷ھ تاریخ وفات سنہ ۸۲۵ھ مزار نزد شہر گردیز علاقہ خوست (افغانستان)

۷- ابن سید محبت صاحب قدس سرہ تاریخ پیدائش سنہ [illegible]ھ تاریخ وفات سنہ ۷۹۵ھ مزار علاقہ خوست بسمت جنوبی افغانستان۔

۸ - ابن حضرت سید باقر صاحب قدس سرہ۔ تاریخ پیدائش ۷۰۵ سنہ ھ تاریخ وفات ۷۶۵ سنہ ھ۔ مزار غزنی۔ افغانستان۔

۹ - ابن حضرت سید محمود صاحب قدس سرہ۔ تاریخ پیدائش ۶۷۲ سنہ ھ۔ تاریخ وفات ۷۲۶ سنہ ھ۔ مزار پشین۔ بلوچستان۔

۱۰ - ابن حضرت سید احمد صاحب قدس سرہ۔ تاریخ پیدائش ۶۳۳ سنہ ھ تاریخ وفات ۶۹۱ سنہ ھ۔ مزار پشین۔ بلوچستان۔

۱۱ - ابن حضرت سید سیف الدین صاحب قدس سرہ۔ تاریخ پیدائش ۵۸۱ سنہ ھ۔ تاریخ وفات ۶۵۱ سنہ ھ۔ مزار پشین۔ بلوچستان۔

۱۲ - ابن حضرت سید سعد الدین صاحب قدس سرہٗ تاریخ پیدائش ۵۵۱ سنہ ھ تاریخ وفات ۶۲۷ سنہ ھ۔ مزار پشین۔ بلوچستان۔

۱۳ - ابن حضرت سید علی اکبر صاحب قدس سرہ۔ تاریخ پیدائش ۴۶۹ سنہ ھ۔ تاریخ وفات ۵۰۷ سنہ ھ۔ مزار پشین۔ بلوچستان۔

۱۴ - ابن حضرت سید انعام صاحب قدس سرہ۔ تاریخ پیدائش ۳۷۵ سنہ ھ۔ تاریخ وفات ۴۶۲ سنہ ھ۔ مزار بخارا۔

۱۵ - ابن حضرت سید علی الملقب بہ سید الرجال ثانی۔ تاریخ پیدائش ۲۹۱ سنہ ھ تاریخ وفات ۳۸۹ سنہ ھ۔ مزار بخارا

۱۶ - ابن حضرت سید قاف قدس سرہ، المعروف بہ سید جان بابا۔ تاریخ پیدائش ۲۳۵ سنہ ھ۔ تاریخ وفات ۳۰۶ سنہ ھ مزار بخارا۔

۱۷ - ابن حضرت سید فاتح قدس سرہ۔ تاریخ پیدائش ۱۰۳ سنہ ھ تاریخ وفات ۲۶۷ سنہ ھ مزار مشہد۔

۱۸ - ابن حضرت سید علی الملقب بہ سید خاتم و سید الرجال اول۔ وفات ۲۲۱ سنہ ھ مزار مشہد۔

۱۹۔ ابن حضرت سید امام اسمٰعیل صاحبؒ قدس سرہ۔ وفات ۱۴۷ھ مزار مدینہ منورہ۔

۲۰۔ ابن حضرت سید امام جعفر الصادق قدس اللہ سرہ العزیز۔ پیدائش ۸۰ھ وفات ۱۴۷ھ مزار مدینہ منورہ۔

۲۱۔ ابن سیدنا حضرت امام باقر صاحب قدس اللہ سرہ العزیز پیدائش ۵۷ھ وفات ۱۱۴ھ۔ مزار مدینہ منورہ۔

۲۲۔ ابن سیدنا امام علی زین العابدین قدس اللہ سرہ العزیز تاریخ پیدائش ۳۷ھ۔ وفات ۹۵ھ۔ مزار مدینہ منورہ۔

۲۳۔ ابن سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ولادت ۴ھ شہادت ۶۱ھ۔ مزار مقدس کربلائے معلیٰ۔

حضرت سید رحمکار کاکا صاحبؒ کے چند اجداد کرام کا اجمالی تعارف

بخارا میں آمد حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کے سولھویں پشت میں آپ کے ایک جد اعلیٰ حضرت سید قاف صاحب جو عوام میں سید جان بابا کے نام سے مشہور رکھے۔ امیر اسمٰعیل سامانی کے عہد میں اپنے اہل و عیال سمیت سال ۲۹۵ھ میں مشہد مقدس سے نقل مکانی کر کے بخارا میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے۔ اور یہاں ہی سال ۳۰۳ھ میں رحلت فرمائی۔ آپ کے بعد آپ کے اکلوتے فرزند سید علی الملقب بہ سید الرجال (ثانی) آپکے جانشین ہوئے۔ آپ کی وفات سامانی خاندان کے آخری بادشاہ عبدالملک بن نوح کے عہد میں سال ۳۸۹ھ میں ہوئی۔ مزار مبارک بخارا میں ہے۔ اس کے بعد آپ کے فرزند سید لقمان قدس سرہٗ آپ کے جانشین ہوئے۔ آپ کی وفات

سال ۴۶۸ھ میں بعہد ملک شاہ سلجوقی واقع ہوئی۔ مزار مبارک بخارا میں ہے۔ اسکے بعد آپ کے فرزند سید علی اکبر قدس سرہٗ بخارا سے نقل مکانی کر کے ہرات آئے۔ اور خواجہ عبد اللہ انصاری قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے تعلیم و تربیت حاصل کی ان کی وفات پر ہرات سے حج بیت اللہ کے ارادے سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ اور پھر وہاں سے پشین آئے اور یہاں مستقل طور پر رہائش اختیار کی۔ آپکے آٹھ صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ آپ نے سلطان محمود بن ارسلان خوارزم شاہ کے عہد حکومت میں سال ۵۷۰ھ میں رحلت فرمائی۔ اور پشین ہی میں دفن ہوئے۔
آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے سید سعد الدین قدس سرہٗ آپکے جانشین ہوئے۔ آپ سال ۵۵۱ھ میں پشین میں پیدا ہوئے تھے۔ تجرد و توکل میں یکتا تھے۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے سید حسین اور سید سیف الدین اول الذکر صغر سنی میں فوت ہو چکے تھے۔ حضرت سید سعد الدین ۶۲۷ھ میں فوت ہوئے۔ مزار پشین میں ہے۔ آپ کے بعد حضرت سید سیف الدین قدس سرہٗ آپکے جانشین ہوئے

حضرت سید سیف الدین قدس سرہٗ ولادت ۵۸۱ھ۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل حضرت بہاء الدین بلخی (والد مولانا جلال الدین رومی) سے کی۔ اور اپنے مرشد کی معیت میں حج بیت اللہ شریف سے بھی مشرف ہوئے۔ بعد میں اپنے مرشد کی اجازت سے اپنے وطن پشین آئے۔ کہتے ہیں کہ آپ نے حضرت شیخ فرید الدین عطار سے بھی کچھ فیض حاصل کیا تھا۔ آپ کی وفات بعہد سلطان شمس الدین کرت واقع ہوئی۔ مزار پشین میں ہے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت سید احمد قدس سرہٗ آپ کے جانشین ہوئے۔

حضرت سید احمد صاحب قدس سرہٗ آپ کی ولادت ۶۳۳ھ میں ہوئی۔

آپ کا روحانی رابطہ حضرت فریدالدین گنج شکر اور شیخ فخرالدین عراقی سے تھا۔ حضرت فخرالدین عراقی کی معیت میں حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ بعد میں اپنے مرشد کی اجازت سے اپنے وطن پشین آئے۔ اور اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ سال ۶۹۱ھ میں وفات پائی۔

"کلک ہاتف اخص رقم فرمود" میں لفظ "اخص" سے بھی آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مزار پشین میں ہے۔

حضرت سید محمود قدس سرہٗ۔ ولادت ۶۷۲ھ علوم ظاہری کی تکمیل مولانا قطب الدین سے کی۔ پھر ہندوستان چلے گئے۔ اور حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے مرید ہوئے۔ اور بہت جلد اپنے مرشد کی توجہات سے مدارج عالیہ پر پہنچ گئے۔ آپ ہمیشہ جذب و استغراق کی حالت میں ہوتے۔ بہت ہی کم خواب و کم خوراک تھے۔ کیمیا نظر تھے۔ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے۔ اسکی دُنیا ہی بدل جاتی۔ ۷۲۶ھ میں بعہد سلطان شمس الدین کرت (ثانی) فوت ہوئے۔ زبدۂ بہشت سے بھی آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مزار پشین میں ہے۔

حضرت سید باقر ابن حضرت سید محمود صاحب (ولادت ۷۰۵ھ) علوم ظاہری کی تکمیل ہرات میں کی۔ اور روحانی تربیت حضرت شیخ صفی الدین اردبیلی سے حاصل کی۔ ایران کے حکمران خاندانوں میں خاندان صفویہ کا بانی شاہ اسمٰعیل صفوی انہی صفی الدین اردبیلی کے ساتویں پشت میں ہیں۔ حضرت سید باقر کچھ عرصہ بعد ہندوستان چلے گئے اور حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی سے سلسلہ چشتیہ میں بھی فیض حاصل کیا۔ بعد میں ہندوستان سے غزنی آئے۔ اور یہاں ایک غلجی سردار کی لڑکی سے شادی کی۔ اور یہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ ۷۶۴ھ میں وفات

پائی۔ مزار غزنی میں ہے۔

حضرت سید محبت قدس سرہٗ۔ ولادت ۷۲۵ھ کے لگ بھگ غزنی میں ہوئی۔ علوم ظاہری و باطنی کی حصول کیلئے ہندوستان چلے گئے۔ اور حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت کی خدمت میں حاضر ہوکران سے بیعت ہوئے۔ اور اپنے مرشد کی معیت میں حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔ اور کئی ممالک کی سیر و سیاحت بھی کی۔ بعد میں اپنے وطن واپس آکر علاقہ خوست میں قیام فرمایا۔ اور سال ۷۹۵ھ میں رحلت فرمائی۔ آپ کے تین فرزند تھے۔ سید لیسین۔ سید عالم جان اور سید حسن۔ سید لیسین آپ کے جانشین ہوئے۔

حضرت سید لیسین۔ آپ کی ولادت ۷۶۷ھ میں ہوئی۔ روحانی فیض حضرت میر سید جہانگیر سمنانی سے حاصل کیا۔ انکے رحلت فرمانے کے بعد حضرت میر سید گیسو دراز کی خدمت میں حاضر ہوکر چند سال اُنکے پاس بھی رہے۔ مخدوم شاہ تقی الدین شیخ شعبان سے آپکے خصوصی دوستانہ تعلقات تھے۔ آپ نہایت مرتاض، کم خواب و کم خوراک تھے۔ اکثر پانچ پانچ دن کے بعد روزہ افطار کرتے۔ سنت نبویؐ کے نہایت پابند تھے۔ آپ کی وفات ۸۲۵ھ میں بعہد شاہ رخ مرزا ہوئی ہے۔ آپ کے چار صاحبزادے تھے۔ سید آدم۔ سید بہاء الدین سید جان جو جانی بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ اور سید سرور الدین جو بچپن میں فوت ہو چکے تھے۔ آپ کا مزار افغانستان کے سمت جنوبی میں شہر گردیز کے قریب واقع ہے۔

حضرت سید آدم صاحب قدس سرہٗ:۔ آپ کی ولادت ۸۰۶ھ میں ہوئی۔ علوم ظاہری کی تکمیل مولانا قاسم اللہ اور شیخ وجیہہ الدین سے کی۔ پھر ہندوستان چلے گئے۔ اور حضرت شیخ نور الدین قطب عالم بنگالی کے مرید ہوئے

اور انکی خدمت میں چند سال رہ کر اکتساب فیض کیا۔ اس کے بعد وطن واپس آئے
آپ محقق کامل اور عارف بے بدل تھے۔ فقر و قناعت کے بادشاہ تھے اکثر روزہ سے
ہوتے تھے عبادت و ریاضت اور خلق اللہ کی رشد و ہدایت میں دن رات مصروف
رہتے تھے۔ آپ کے دو فرزند تھے سید غالب الدین جو عوام میں غالب بابا کے نام
سے مشہور ہیں۔ اور شیخ محمد قاسم۔ دو صاحبزادیاں بھی تھیں۔ والد کی وفات کے
بعد آپ اپنے وطن سے نقل مکانی کر کے قبیلۂ بنگش اور قبیلہ خٹک کے موجودہ
علاقے کے ایک سرحدی مقام کربوغہ کے قریب جسکو "حسن تنگے" اور "ممانڑی غونڈی"
بھی کہا جاتا تھا، مقیم ہوئے۔ یہاں آپ نے بعمر (۶۴) سال ۹۰۲ھ میں وفات پائی۔
حضرت شاہ بدیع الدین الملقب بہ شاہ مدار سے آپ کے خصوصی تعلقات تھے۔ آپ
کا مزار پر بہت عرصہ تک گنبد نہیں بنا تھا۔ لیکن اب سنا ہے کہ مزار پر گنبد بھی بنا ہے۔
اور زائرین اور مجاوروں کی رہائش کے لئے کچھ مکانات بھی بن گئے ہیں۔

حضرت غالب الدین الملقب بہ غالب بابا و مسمی سرود بابا، نقشبندی و
چشتی، سہروردی قدس اللہ سرہ العزیز۔ آپ کی ولادت ۸۵۸ھ میں ہوئی۔
ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہرات چلے گئے۔ اور تحصیل علوم میں مصروف رہے۔
پھر سمرقند چلے گئے۔ اور خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت میں حاضر ہو کر انکے مرید ہوئے۔
اور چند سال ان کی خدمت میں رہ کر ان سے روحانی فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد
ہندوستان آئے۔ اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز
کے آستانہ مبارک پر دس سال تک معتکف رہے اور خواجہ غریب نواز سے بطریق اویسیہ
سلسلہ چشتیہ میں فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد اجمیر سے دہلی آئے۔ اور حضرت خواجہ
سماء الدین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے سلسلہ سہروردیہ میں بیعت کی۔ اور
چند سال اپنے مرشد کی خدمت میں رہے۔ اس کے بعد اپنے وطن واپس آئے اور اپنے

والد کے مزار پر معتکف ہوئے۔ اس عرصہ میں آپ بہت کم خوراک تھے صرف کبھی کبھی بکری کا تھوڑا سا دودھ پیا کرتے تھے۔ سنہ ۹۰۰ھ کے قریب اپنے خاندانی روایات کے مطابق آپ اپنے چند مریدوں کے ہمراہ کربوغہ سے چل کر دریائے سندھ کے کنارے تک آئے۔ اور علاقہ خوڑہ میں جو ان دنوں میں بہت ہی کم آباد، بلکہ غیر آباد تھا۔ موضع مروبہ کے قریب جہاں آجکل آپ کا مزار واقع ہے مقیم ہوگئے۔ یہاں جنگل ہی جنگل تھا۔ اور دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن بہت جلد آپ کے فیضان سے لوگ جوق در جوق آپ کے پاس آنے لگے۔ اور ان سب کو آپ کی خانقاہ سے کھانا مل جایا کرتا تھا۔ آپ کے خوارق و کرامات بہت زیادہ ہیں۔ آپ کے خلفاء میں خواجہ عماد لاہوری اور خواجہ شہباز بہت مشہور ہیں۔

آپ کے دو بیٹے سید شاکر و سید صابر عالم جوانی میں فوت ہو چکے تھے۔ اُن کی قبریں بھی آپ کے مزار کے متصل گنبد میں موجود ہیں۔ آپ کی رحلت سنہ ۹۳۱ھ میں واقع ہوئی۔ مزار موضع مروبہ علاقہ خوڑہ (نظام پور تحصیل نوشہرہ) ایک جنگل میں ہے۔ مزار پر گنبد بنا ہے۔ اور زائرین کے قیام کے لئے مکانات بھی بنے ہوئے ہیں۔ اور تمام زائرین کو قیام و طعام کی مفت سہولتیں حاصل ہیں۔ ایک مسجد بھی ہے۔ آپ کے مزار پر حاضرین کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ جنگل میں منگل کا سماں نظر آتا ہے۔ آپ کے مزار تک روزانہ دو بسیں چلتی ہیں، جنکی وجہ سے نہ صرف زائرین کو بلکہ علاقہ کے لوگوں کو بھی بڑی سہولت حاصل ہے۔

زبدۂ عارفان، قدوۂ کاملان حضرت سید نادر صاحب المعروف بہ ست بابا قدس سرہٗ۔ آپ سنہ ۹۰۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ آپ کی ظاہری و باطنی تربیت حضرت حاجی صاحب عبدالوہاب دہلوی نے کی ہے۔ جو حضرت شیخ سماء الدین دہلوی کے خلیفہ اکبر تھے۔ حضرت حاجی صاحب کے ساتھ آپ کے خاندانی تعلقات

بھی تھے۔ ۹۳۲ھ تک حضرت مست بابا حاجی عبدالوہاب صاحب کے زیر تربیت رہے۔ اسی سال جناب حاجی صاحب فوت ہوگئے۔ اس لئے حضرت مست بابا کچھ عرصہ تک حضرت شیخ جمال المعروف بہ شیخ جمالی کے بھی زیر تربیت رہے۔ شیخ جمالی بھی حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ تھے۔

اس کے بعد حضرت مست بابا سلسلہ چشتیہ میں تربیت حاصل کرنے کی غرض سے حضرت عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوکر انکے مرید ہوئے، اور چند سال اپنے مرشد کی خدمت میں رہ کر فنافی اللہ اور بقا باللہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ ۹۴۵ھ میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی بھی فوت ہوگئے۔ اسلئے حضرت مست بابا بھی اپنے وطن واپس آئے۔ اور اپنے والد کے مزار پر معتکف ہوئے اور پھر چند سال بعد اپنے خاندانی روایات کے مطابق وہاں سے چل کر علاقہ خٹک کے موضع شیخی کے نزدیک ایک جنگل میں جہاں آجکل آپ کا مزار ہے، مقیم ہوئے۔ اور خلق خدا کی ہدایت میں مصروف ہوئے۔ لوگ جوق در جوق آپ کے پاس آنے لگے۔ اور فیض یاب ہوتے گئے۔ اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

حضرت مست بابا ہر وقت جذب و استغراق کی حالت میں ہوتے۔ اسلئے آپ مست بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے استغراق کا یہ عالم تھا، کہ ایک دفعہ کسی بدنہاد نے آپ پر تلوار کے کئی وار کئے۔ مگر آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔ آپ کے استغراق کے بارے میں اور بھی کئی روایات منقول ہیں۔

آپ کے مرشد طریقت شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور انکے مرشد طریقت شیخ عبدالحق صاحب ردولوی کے محویت اور استغراق کا بھی یہی عالم تھا۔ بلکہ حضرت ردولوی کی بابت تو یہ کہتے ہیں کہ چالیس سال تک جس جامع مسجد میں نماز پڑھتے رہے۔ اس کا راستہ تک بھی یاد نہ تھا۔ اور بختیار نام آپ کا ایک خادم "حق حق" کے

نعرے لگاتا ہوا آپ کے آگے آگے جاتا تھا۔ اور آپ اسکی آواز پر چلتے رہتے اور مسجد پہنچ جاتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے
تیری ہستی کی رنگ و بو نہ رہے

حضرت مست بابا کے تین فرزند تھے۔ یعنی شیخ بہادر جو عوام میں "بابک بابا" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور حضرت جابر و حضرت بابر تینوں بھائی اپنے والد کے مرید اور دست گرفتہ تھے۔ مگر حضرت جابر و حضرت بابر اُس وقت کے صوبہ دار پشاور کے فوجیوں کے ہاتھوں جو ڈاکوؤں کے تعاقب میں آئے تھے غلطی سے شہید ہو گئے۔ ان ہر دو صاحبان کی قبریں ایک الگ گنبد میں اپنے والد کے مزار کے احاطے میں ہیں۔ اور قبور شہدا کے نام سے مشہور ہیں۔

حضرت مست بابا کی وفات ۹۶۹ھ ۱۵۶۲-۶۳ء میں ہوئی۔ آپ کا مزار موضع شیخی (تحصیل نوشہرہ) کے نزدیک ایک جنگل میں ہے۔ مزار کے احاطے میں مسجد لنگر خانہ اور زائرین کے قیام کے لئے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ اور تمام زائرین کو اس جنگل میں تمام ضروریات مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ اس احاطے میں محترم اکوڑ خان بانی ریاست خٹک کی قبر بھی ہے۔

قطب الاقطاب، شیخ المشائخ حضرت سید بہادر المعروف بہ ابک بابا قدس اللہ سرہ العزیز۔ آپ کی ولادت ۹۲۱ھ میں ہوئی۔ آپ کا اصلی نام کچھ اور تھا "بہادر" آپ کا لقب تھا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ کم عمری میں بوجہ صاحب کمال ہونے کے آپ سے بڑے بڑے اہم کام صادر ہوا کرتے تھے۔ اسلئے والد ماجد آپ کو "بہادر" کہکر پکارا کرتے تھے۔ اس ضمن میں مجمع البرکات کی روایت ہے، کہ "چون در ایام کودکی کہ امور خلائق از لیستاں کشیدہ شدند۔ ازیں وجہ حضرت پدرش بہادر خواند"۔

یعنی مردِ شجاع۔ یعنی چونکہ صغر سنی میں آپ سے لوگوں کی مقصد برآری ہوا کرتی تھی، اسلئے والد محترم آپ کو بہادر یعنی مردِ شجاع کہکر پکارا کرتے تھے۔ اور "ابک" کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پشتو میں باپ کو پکارنے کیلئے "ابا" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور "ابک" ابا کا اِسم تصغیر ہے۔ جو عموماً پیار کے طور پر کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ خان خوشحال خان خٹک کے اس شعر سے بھی ظاہر ہے سہ

د راحت په وخت چې تل ترتا زار يږي

په سختۍ کښې ديزار يږي له ابکه!

ترجمہ:۔ (یعنی) "وہ دوست جو آرام و راحت کے دنوں میں آپ پر نثار ہونے کے مدعی ہیں، سختی اور مصیبت کے دنوں میں وہ باپ سے بھی بیزار ہو جاتے ہیں"۔

چونکہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب بچپن میں آپ کو "ابک جیو ابک جیو" کہکر پکارا کرتے۔ اسلئے عوام الناس بھی آپ کو "ابک جیو ابک جیو" کہتے تھے۔ بعد میں مرورِ زمانہ کے ساتھ "جیو" کا لفظ متروک ہو گیا۔ اور صرف لفظ "ابک" رہ گیا اور اب احتراماً "بابا" کا لاحقہ لگا کر آپ کو "ابک بابا" کہا جاتا ہے۔

حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ نے ظاہری تعلیم شیخ محمد غوث گوالیاری سے حاصل کی۔ اور اپنے والد حضرت سید نادر صاحب سے سلسلہ سہروردیہ اور چشتیہ میں دست گرفتہ تھے۔ مجمع البرکات کی ایک روایت کے مطابق آپ شیخ محمد جعفر لاہوری سے بھی بیعت تھے۔ اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے حضرت شیخ حمزہ کشمیری سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ آپ حضرت حاجی عبدالوہاب صاحب کے خلیفہ اکبر اور حضرت مست بابا کے پیر بھائی تھے۔

حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے خاندانی روایات کے مطابق اپنے والد کے مقام رہائش سے نقل مکانی کر کے چند میل کے فاصلے

بر موضع "کناخیل" کے قریب ایک جنگل میں رہائش پذیر ہوئے۔ اس جنگل میں اس مکان کے کچھ آثار اب تک موجود ہیں۔ جہاں حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب تولد ہوئے تھے۔

حضرت شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ کے ایک نامور خلیفہ سلطان صدرالدین صاحب فرماتے ہیں۔ کہ قطب عالم کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ آپ کی خدمت میں جو بھی حاضر ہوجاتا، اپنی مراد پالیتا۔ آپ کیمیا نظر اور مستجاب الدعوات تھے۔ بچپن ہی سے نہایت بے خوف اور دلیر تھے۔ نہایت راستباز، صادق القول فصیح و بلیغ، علم و عمل کے مالک تھے۔ آپ کی توجہ سے ہزارہا بدکار نیکوکار بن گئے۔ اکثر مریض آپ کی خدمت میں لائے جاتے، اور صرف آپ کی توجہ اور تاثیر نظر سے شفایاب ہوجاتے۔ مارگزیدہ آپ کے لعاب دہن سے تندرست ہوجاتے علماء و فضلاء کے قدردان تھے۔ اکثر صوفیائے عصر بغرض حصول فیض روحانی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ آپ تمام پشتون قبائل کے رہنما تھے۔

حضرت سلطان صدرالدین صاحب فرماتے ہیں۔ کہ ایک دن حضرت قطب عالم اپنے مریدوں کے ہمراہ اُس جگہ تشریف لائے۔ جہاں آپ کا مزار واقع ہے۔ آپنے فرمایا "اے میرے عزیزو! وفات کے بعد مجھے یہاں ہی دفن کرنا" مریدوں نے عرض کیا، کہ حضرت! یہاں تو لوگوں کو آنے جانے میں بڑی تکلیف ہوگی۔ اس پر آپنے فرمایا: کہ جو لوگ میری زیارت اور ملاقات کے لئے آنا چاہینگے۔ ان کے لئے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ البتہ بدکاروں کے لئے آنے میں تکلیف ہوگی۔ اور میرا مدعا بھی یہی ہے، کہ بدکاروں سے واسطہ ہی نہ پڑے۔

آجکل حضرت قطب عالم شیخ بہادرؒ صاحب کے مزار تک روزانہ موٹر، لاریاں وغیرہ چلتی رہتی ہیں۔ جسکی وجہ سے زائرین کو آنے جانے میں بڑی سہولت حاصل ہے لیکن کچھ عرصہ پہلے پیدل جانے کا راستہ بہت دشوار گزار اور تکلیف دہ تھا۔ پیدل

اہلِ ذوق جوق در جوق آپ کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے۔ اور آج کل تو زائرین کا اتنا ہجوم ہوتا ہے۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ نوشہرہ سے براستہ مانکی شریف روزانہ بہت سی موٹر، ویگنیں اور بسیں آپ کے مزار تک چلتی رہتی ہیں۔

حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ بتاریخ ۱۲ شعبان ۱۰۲۷ھ کو فوت ہوئے۔ اگرچہ بعض تذکروں میں آپ کی تاریخ وفات ۱۱۰۰ھ بھی لکھی ہوئی ہے۔ اور "روحانی رابطہ" میں آپ کی تاریخ وفات ۱۱۰۲ھ لکھی ہوئی ہے۔ مگر یہ دونوں تاریخیں درست نہیں ہیں۔ میرے زیر مطالعہ قلمی مسودے میں ۱۰۲۷ھ کے ساتھ یہ صراحت بھی موجود ہے۔ کہ آپ شہنشاہ جہانگیر کے بارھویں سالِ جلوس میں فوت ہوئے تھے۔ نیز اسی سال شہزادہ اورنگ زیب بھی پیدا ہوا تھا۔ چونکہ اورنگ زیب کی پیدائش اور جہانگیر کی تخت نشینی کا بارھواں سال ۱۶۱۸ء ہے، جو ۱۰۲۷ھ کے مطابق ہے، اس لئے آپ کی یہی تاریخ وفات درست ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی اس تاریخ وفات کے ساتھ یہ مصرع بھی لکھا ہوا ہے ؏

"کامل و طاہر و طیب رفت"

اس سے بھی بحساب ابجد ۱۰۲۷ھ نکلتی ہے۔

حضرت قطب عالم شیخ بہادر قدس سرہٗ کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور اطراف و اکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے چند بہت مشہور خلفاء کے نام یہ ہیں :-

۱۔ حضرت سلطان صدرالدین (اٹک والے)۔ آپ حضرت شیخ بہادر صاحب کے خاص خلفاء میں سے تھے۔ آپ نے اپنے مرشد کے مناقب میں ایک کتاب بھی لکھی تھی

۲۔ میاں ولی صاحب۔ ۳۔ میاں شادی صاحب۔ ۴۔ اخون میاں ذذ (سوات)۔ ۵۔ اخوند شرف بلخی۔ ۶۔ شیخ اللہ داد خٹک۔ ۷۔ شیخ ملک

(مہندے خٹک)۔ ۸۔ ۹۔ شیخ نسک کے دونوں فرزند۔ ۱۰۔ فقیر ملک میر سالکن اندری۔ آپ کا مزار حضرت شیخ بہادر صاحب کے مزار سے باہر الگ ایک مختصر احاطے میں واقع ہے۔

حضرت شیخ بہادر قدس اللہ سرہ العزیز کے مزار سے ملحق ایک نہایت وسیع مہمانخانہ ہے۔ جس میں روزانہ صدہا زائرین قیام کرتے ہیں۔ ان کی رہائش اور خورد و نوش کی تمام ضروریات حضرت کے لنگر خانہ اور مہمانخانہ کے منتظمین کی طرف سے مفت پوری کی جاتی ہیں۔ اور زائرین کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ خواتین کے قیام کیلئے الگ مکانات بنے ہوئے ہیں۔

غرض یہ نظارا دیکھکر حضرت عبدالرحمٰن بابا قدس سرہٗ کے ان شعروں کی تصدیق ہوتی ہے کہ ؎

هر بهار لره خزان په جهان شته دے
خزان نشته لری بهار د درویشانو
هسے گرم بازار بل په جهان نشته
لکه گرم دے بازار د درویشانو

ترجمہ :- "دنیا میں ہر بہار کے لئے خزان مقدر ہے۔ مگر فقیروں کی بہار اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے۔ اور جیسا پُر رونق بازار فقیروں کا ہے۔ ایسا پُر رونق بازار دُنیا میں اور کہیں بھی نہیں ملتا۔"

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زِ راہ و رسم منزلہا

چند اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے اقوال و ملفوظات

(جنکی روشنی میں حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب
قدس سرہ کے مقام و مرتبہ کے سمجھنے میں سہولت ہوگی)

۱۔ حضرت اویس قرنی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں جس نے خدا کو پہچانا۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہ رہی اور جس شخص نے خدا کو سمجھا وہ ہر چیز کو سمجھ جاتا ہے۔ فرمایا تنہائی میں سلامتی ہے۔ فرمایا سربلندی عاجزی میں ہے سرداری سچائی میں ہے، فخر فقر میں، نسبت پرہیزگاری میں اور بزرگی قناعت میں اور استغنا توکل میں ہے۔

۲۔ حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں: سچا عابد وہ ہے۔ جو کوشش کی تلوار سے اپنی تمام خواہشات کو مار ڈالے۔ اور اپنی تمناؤں کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں تباہ کردے۔ اور خداوند کریم کی رضا پر راضی رہے۔ اور محض اس بات کی خواہش کرے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ نیز فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست بناتا ہے، اسے تین خصلتیں عطا کرتا ہے۔ دریا جیسی سخاوت۔ زمین جیسی عاجزی اور آفتاب کی طرح شفقت۔ آپ سے پوچھا گیا، بندہ اپنے کمال کو کب پہنچتا ہے؟ فرمایا جب وہ اپنے عیبوں کو پہچان لے۔ اور مخلوق سے کسی قسم کی توقع نہ کرے۔

۳۔ حضرت جنید بغدادی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا۔ جس کی زندگی نفس سے ہے۔ اسکی موت جان نکلنے سے واقع ہوتی ہے۔ مگر جس کی زندگی

اللہ تعالیٰ سے ہے۔ وہ طبعی زندگی سے اصلی زندگی کی طرف انتقال کر جاتا ہے۔
فرمایا: عبودیت کی دو خصلتیں ہیں۔ ظاہر و باطن میں ہر طرح خدا کی رضا پر راضی رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری محبت کے ساتھ اقتدا کرے۔ فرمایا: خُلق چار چیزوں کا نام ہے۔ سخاوت۔ اُلفت۔ نصیحت۔ شفقت۔

۴۔ حضرت ذوالنون مصری قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں۔ بد ترین حجاب خود پسندی ہے۔ نیز فرمایا۔ جو معدہ کھانے سے بھرا ہوا ہے اُس میں حکمت نہیں آسکتی۔ فرماتے ہیں: بدن کی صحت تھوڑا کھانے میں اور روح کی صحت تھوڑا گناہ کرنے میں۔ فرمایا: جو چیز حق تعالیٰ سے غافل کردے وہ دُنیا ہے۔

۵۔ حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں: اصل معرفت صوفیائے کرام کی ہے۔ جو ذوق دلی اور کشف الٰہی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ لیکن یہ معرفت صرف خواص اولیاء کا حق ہے۔ یہ لوگ بغیر کسی واسطہ دیدارِ حق سے مشرف ہوتے ہیں۔ اسکی مثال وہی ہے، جو علم نبوت کی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: وَاٰتَیْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔

اس علم کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہ آیا یہ الہام ہے یا وجدان؟ بندہ نہیں جانتا کہ یہ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ نہ یہ جانتا ہے کہ یہ کہاں سے آتا ہے؟ نبی کے بارے میں تو یہ معلوم ہے کہ اس پر وحی فرشتے کے ذریعے نازل ہوتی ہے لیکن بندے تک فرشتہ نہیں پہنچتا پھر بھی یہ بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ نبی اور ولی دونوں کا علم اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے خواہ اسکی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔

۶۔ حضرت سہیل بن تستری قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں: نجات چار باتوں میں ہے۔ کم کھانا۔ تنہائی۔ بے خوابی اور خاموشی۔

۷۔ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں:

۴۷۶

خدا کو چھوڑ کر جو دوسروں سے مانگتا ہے۔ اس نے خدا کے درجے اور مرتبے کو نہیں پہچانا ہے۔

۸ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں: عاشق کا دل محبت کی آگ کا آتشکدہ ہے (سوائے حق) جو اُسکے دل میں آتا ہے، وہ جل کر خاکستر اور نا پید ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آتش محبت سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی آگ نہیں ہے۔

فرمایا: چھوٹی چھوٹی ندیوں اور نہروں سے جب پانی بہتا ہے تو اُس کا شور سنائی دیتا ہے۔ لیکن جب وہ دریا میں مل جاتی ہیں تو پھر ان کا شور باقی نہیں رہتا۔

فرمایا: عارفوں کا ایک مقام ایسا ہے، کہ جب وہ اس مقام تک پہنچتے ہیں۔ تو جہان اور جو کچھ جہاں میں ہے، وہ اپنی دو انگلیوں کے درمیان دیکھ لیتے ہیں۔

فرمایا: عارف وہ ہوتا ہے، کہ جو کچھ چاہتا ہے اسکے سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔ اور جو بات کرتا ہے، اس کا جواب (غیب سے) سنتا ہے۔

فرمایا: حق تعالیٰ کی شناخت کی علامت مخلوق سے کنارہ کشی ہے۔ اور معرفت کی باتوں میں خاموشی۔

فرمایا: کہ عارف کی شناخت یہ ہے کہ وہ خاموش ہو۔ اور اسکے چہرے پر غم کے آثار ہوں۔ نیز فرمایا: جو انسان جس قدر معرفت میں زیادہ ہوگا، اتنا ہی متحیر ہوگا۔ فرمایا: اہل معرفت آفتاب کی مانند ہیں۔ کہ جن کی روشنی تمام جہاں پر پڑتی ہے۔ اور ان کے نور سے تمام جہاں روشن ہے۔

فرمایا: انسان اس وقت تک عارف نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے نفس

کی معرفت سے باخبر نہ ہوجائے۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ کا قرب بغیر نماز کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نماز مومن کی معراج ہے۔

فرمایا: جس نے نعمت پائی، سخاوت کی بدولت پائی۔

فرمایا: حق تعالیٰ کا دیدار اس دُنیا میں یہی ہے کہ اسکی تجلیات کا عکس بندہ پر پڑے۔

فرمایا: اہل محبت وہ لوگ ہیں کہ بغیر استاد کے واسطہ دوست (حق) کا کلام سنتے ہیں۔ (یعنی یہ حضرات واصل اِلی اللہ ہوتے ہیں)۔ اور اُنکو فنا فی اللہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

فرمایا: "علم" ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ اور "معرفت" ایک ندی یا نہر ہے۔ علم اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ اور معرفت بندوں کے لئے۔ پس کہاں خدا اور کہاں بندہ۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ جب علم حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے تو علمِ غیب بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ اور یہ اسکے ہرگز منافی نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبروں کو غیب پر مطلع کیا۔ غیب پر انکو مطلع کرنا اور چیز ہے اور علم غیب دوسری چیز۔ علم غیب کے لئے حضرت خواجہ کے نزدیک یہ ضروری ہے، کہ وہ علم کلی اور غیر محدود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بندے کا علم خواہ وہ نبی مرسل کیوں نہ ہو غیر محدود نہیں ہے۔ لیکن علم غیب نہ ہونے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا۔ کہ امور غیبیہ پر من جانب اللہ ان کو اطلاع بھی نہ تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک کے واقعات بیان فرمائے۔ اور یہ سب امورِ غیب ہیں جو حق تعالیٰ کے بتانے سے آپ کو حاصل ہوئے۔ پس جو علم اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہے۔ وہ علم غیب ہے۔ اور جس کو عام کر رکھا ہے۔ وہ امور غیبیہ پر اطلاع ہے۔ فقہائے کرام عالم الغیب ہونے کا اطلاق کسی بندے

ایز نہیں کرتے اور امور غیبیہ مطلع ہونا وہ اولیاء کرام تک کیلئے مانتے ہیں۔ کیونکہ علمائے کرام اور علمائے متقدمین حضرت خواجہ کے اس رمز سے واقف ہیں۔ اسلئے وہ انبیائے کرام اور اولیاء کے لئے اطلاع علی الغیب کا لفظ استعمال کرنے میں باک نہیں کرتے۔ اور کسی جگہ بھی انہوں نے عالم الغیب کا لفظ بجز حق تعالیٰ کے استعمال نہیں کیا ہے۔ مولانا رومی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

علم غیبی کس نمی داند بجز پروردگار ؛ ہر کہ او گوید کہ من دانم باو باور مدار
مصطفیٰ ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے جبرئیل ؛ جبرئیل ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے کردگار

۹۔ حضرت جلال الدین رومی قدس اللہ سرہ العزیز :۔

شریعت، طریقت اور حقیقت کے بارے میں حضرت مولانا کی تشریح، فرماتے ہیں :۔

" شریعت ہم چو شمع است کہ راہ می نماید۔ چوں در راہ آمدی۔ این رفتن تو طریقت است۔ وچوں بمقصد رسیدی آں حقیقت است۔ حاصل آنکہ شریعت ہمچو علم کیمیا آموختن است از استاد یا از کتاب۔ طریقت استعمال کردن داروہا ومس را در کیمیا بالیدن۔ وحقیقت زر شدن مس۔ یا مثال شریعت ہمچو علم طب آموختن است۔ وطریقت پرہیز کردن بموجب علم طب۔ و دارو خوردن۔ وحقیقت صحت یافتن"۔

یعنی مثلاً ایک شخص نے علم طب پڑھا۔ یہ شریعت ہے۔ دوا استعمال کی۔ یہ طریقت ہے۔ مرض سے افاقہ ہوا۔ یہ حقیقت ہے۔ حاصل یہ کہ شریعت علم ہے۔ طریقت عمل ہے۔ اور حقیقت اس عمل کا ثمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:۔ کہ شریعت چار جزوں کا نام ہے۔ اقرار زبانی۔ اعتقاد قلبی۔ تزکیہ اخلاق۔ اعمال یعنی اوامر و مناہی۔

اعتقاد تین طریقوں سے پیدا ہوتا ہے۔ تقلید سے۔ استدلال سے کشف حال

سے ۔ پہلی دو قسموں کو شریعت کہتے ہیں۔ یعنی ان طریقوں سے اگر کسی کو اعتقاد حاصل ہو، تو کہا جائیگا کہ اسکو شرعی اعتقاد حاصل ہے۔

تیسری قسم کا اعتقاد طریقت ہے۔ یہ قسم بھی شریعت سے باہر نہیں، لیکن امتیاز کیلئے ایک خاص نام رکھ لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اعتقاد سلوک و تصوف اور مجاہدہ اور ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس طرح تزکیہ اخلاق کے جو احکام شریعت میں مذکور ہیں۔ ان کا نام شریعت ہے۔ لیکن محض احکام کے جاننے سے تزکیہ اخلاق نہیں ہوتا۔ علمائے ظاہر اخلاق کی حقیقت و ماہیت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ لیکن خود انکے اخلاق پاکیزہ نہیں ہوتے۔ یہ مرتبہ مجاہدات اور فنائے نفس سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اس کا نام طریقت ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا۔ کہ شریعت و طریقت دو متناقض چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں میں جسم جان، جسد و روح، ظاہر و باطن اور پوست و مغز کی نسبت ہے۔

تصوف بھی دو جزوں سے مرکب ہے۔ علم و عمل۔ عقائد میں جن مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ ان میں ذات و صفات باری کے متعلق جو مسائل ہیں۔ تصوف میں بھی انہی مسائل سے بحث ہوتی ہے۔ لیکن تصوف میں ان مسائل کی حقیقت دو طرح بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسکی تفصیل آگے آئے گی۔ یہی حصہ تصوف کا علمی حصہ ہے۔ لیکن تصوف کے اس حصہ میں جو مابہ الامتیاز ہے۔ یہ ہے کہ اس میں علم و ادراک کا جو طریقہ ہے، وہ عام طریقہ سے مختلف ہے۔ تمام علماء و حکماء کے نزدیک ادراک کا ذریعہ حواس ظاہری و باطنی یعنی حافظہ، متخیلہ، حس مشترک وغیرہ ہیں۔ لیکن ارباب تصوف کے نزدیک ان وسائل کے سوا ادراک کا ایک اور ذریعہ بھی

کے بعض حضرات صوفیہ کا دعویٰ ہے۔ کہ مجاہدہ، ریاضت، مراقبہ اور تصفیہ قلب سے ایک اور حاسہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو حواس ظاہری و باطنی سے معلوم نہیں ہوسکتیں۔ امام غزالی نے اسکی تشبیہ یوں دی ہے۔ کہ مثلاً ایک حوض ہے جس میں نالوں کے ذریعے پانی آتا ہے۔ یہ گویا علوم ظاہری ہیں۔ خود حوض کی تہہ میں بھی ایک سوت ہے جس سے فوارے کی طرح پانی اچھلتا ہے۔ اور حوض میں آتا ہے۔ یہ علم باطن ہے جسکو علم لدنی کشف اور علم غیب کہتے ہیں۔ اور یہی علم ہے جو انبیاء اور اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ انبیاء اور اولیاء میں فرق یہ ہے، کہ انبیاء میں یہ علم نہایت کامل اور فطری ہوتا ہے۔ یعنی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہیں ہوتا۔ بخلاف اولیاء کے جنکو اُن کو مجاہدات اور ریاضات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

۰ اہل ظاہر اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ تحقیقات علمیہ سے ثابت ہوچکا ہے، کہ انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ اشیائے خارجی کو کسی حاسہ سے محسوس کرتا ہے۔ پھر اس قسم کی بہت سی چیزوں کو محسوس کرکے ان میں قدر مشترک پیدا کرتا ہے۔ جسکو "کلی" کہتے ہیں۔ پھر انہی کلیات و جزئیات کے باہمی نسبت و مقابلہ سے سینکڑوں ہزاروں نئی نئی باتیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن ان تمام معلومات کی اصل بنیاد حواس ہی ہوتے ہیں۔ اس کو الگ کیا جائے تو تمام سلسلہ بے کار ہوجاتا ہے۔ اسلئے صوفیہ کا یہ دعویٰ کہ حواس کے سوا ادراک کا کوئی اور ذریعہ بھی ہے، تحقیقات علمی کے خلاف ہے۔

صوفیہ حضرات کا جواب یہ ہے:-

"ذوق این بادہ ندانی بخدا تا نچشی"

وہ کہتے ہیں کہ جس طرح علوم ظاہری کے سیکھنے کا ایک ذریعہ مقرر ہے۔ جس کے بغیر وہ علوم حاصل نہیں کئے جاسکتے اسی طرح علم باطن کا بھی ایک طریقہ ہے۔

تک اس خاص طریقے کا تجربہ نہ کیا جائے۔ اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ بہت سے مسائلِ علمی ایسے ہیں، جنکو کسی خاص عالم یا حکیم نے دریافت کیا ہے۔ اور دوسرے لوگ صرف انکی شہادت پر ان مسائل کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس قیاس پر جب سینکڑوں بزرگ جنکے علم وفضل، صدق ودیانت دقت نظر اور جدت ذہن سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ مثلاً حضرت بایزید بسطامی، حضرت ابوسعید، حضرت امام غزالیؒ، شیخ محی الدین اکبر، شیخ سعدیؒ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور دوسرے بہت سے بزرگ حضرات نہایت وثوق واعتماد سے انکی شہادت دیتے ہیں، کہ علم باطن حواس سے بالکل جداگانہ چیز ہے۔ تو انکی اس شہادت پر کیوں اعتماد نہ کیا جائے۔ سینکڑوں ایسے علماء گذرے ہیں، جنکو علم باطن سے قطعاً انکار تھا۔ لیکن جب وہ اس کوچے میں آئے، اور خود ان پر وہ حالت طاری ہوگئی، تو وہ خود سب سے زیادہ اسکے معترف ہوگئے۔

چونکہ یہ مسئلہ تصوف کے تمام علمی مسائل کی بنیاد ہے، اس لئے مولانا نے بار بار اسکو بیان کیا ہے، اور مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے کہ ارباب ظاہر کا اس سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بچہ فلسفیانہ مسائل کا انکار کرتا ہے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں :- ؎

قال را بگذار و مردِ حال شو — پیش مردِ کاملے پامال شو
گر تو سنگِ خارا و مرمر شوی — چوں بہ صاحبدل رسی گوہر شوی

۱۰ـ حضرت ابوالحسن جرجانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں: عارف وہ ہوتا ہے، جو اپنا دل اللہ کو دے دیتا ہے، اور بدن لوگوں کی خدمت میں مصروف رکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر نیک گمان رکھنا معرفت کی انتہا ہے۔ اور اصل معرفت

اپنے نفس کے ساتھ بدگمانی کرتا ہے۔ نیز فرمایا: جو اپنے مولیٰ کی خدمت کرتا ہے، اس کیلئے اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ نیز فرمایا: صاحبِ استقامت بنو نہ کہ صاحبِ کرامت۔ کرامت تو تمہارا نفس چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ استقامت۔

حضرت ابوبکر شبلی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں: جو کچھ پاس ہو اُسے راہِ محبوب میں لٹا دینا محبت ہے۔ فرمایا: جو شخص خدا سے متصل اور دنیا سے منقطع ہو، وہ صوفی ہے۔

حضرت ابوالحسن خرقانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں: دو شخصوں سے دین میں اتنا زبردست فتنہ پیدا ہوتا ہے، کہ اتنا شیطان سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اول حریص، دوم بے علم زاہد۔

فرمایا: جوانمردی ایک دریا ہے جس سے تین چشمے ہر وقت جاری رہتے ہیں۔ سخاوت، مخلوقِ خدا پر شفقت، مخلوق سے بے نیازی اور خالق سے نیازمندی۔ نیز فرمایا کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیر تھے اور ہم نے بھی فقر اختیار کیا ہے۔ علما جو اپنے آپ کو نائبِ رسول کہتے ہیں، غلط ہے۔ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت ہمارے لئے ہے۔ فرمایا: بہت سے لوگ زمین پر چلتے پھرتے ہیں اسکے باوجود وہ مردہ ہیں، اور بہت سے لوگ ایسے ہیں۔ جو باوجودیکہ قبروں میں مدفون ہیں مگر زندہ ہیں۔

سلطانِ طریقت، شہبازِ حقیقت قطب الاقطاب شیخ المشائخ

حضرت سید کستیر الملقب بہ رحمکار

المعروف بہ کاکا صاحبؒ کے مختصر حالات اور سوانح

درفیض است مشین از کشائش ناامیداینجا
بہ رنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

نام مقامات قطبیہ کے مطابق آپ کا اسم محضہ کستیر ہے۔ پشتو زبان میں کستیر سیاہی مائل زرد رنگ کے ایک خوشبودار پھول کا نام ہے۔ بعض لوگ زعفران کے پھول کو بھی کستیر کہتے ہیں۔ خان خوشحال خان خٹک مرحوم نے بھی اپنے ایک شعر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ستا د زلفو هر پېچ لره چه گورم
همگی په رنگ و بوئ لکه کستیر دے

ترجمہ:۔ (اے محبوب) تمہاری زلفوں کا ہر پیچ وخم مجھے کستیر کے رنگ وبو کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

گلِ کستیر موسم بہار میں پہاڑی علاقوں میں بکثرت اُگتا ہے۔ اور پشتون عوام کا من پسند پھول ہے۔ پشتون اپنے علاقے کے طبعی مناسبت کی وجہ سے اپنے بچوں کے نام عموماً خوبصورت پھولوں، طاقتور پرندوں اور حیوانات کے ناموں پر رکھتے ہیں۔ مثلاً صدبر۔ چنار۔ انار۔ شہباز۔ شیر وغیرہ۔ چونکہ آپ کا خاندان بھی آپ کی ولادت سے کم وبیش دو سو سال قبل علاقہ خٹک میں اقامت گزیں ہو چکا تھا

[illegible] ایک ہی خاندان تھا۔ اس لئے علاقے کے لوگوں کے ساتھ معاشرتی
[illegible] بندھنوں میں بندھ چکا تھا۔ اور معاشرتی لحاظ سے آپ کے خاندان
اور علاقے کے دوسرے لوگوں کے رسم و رواج اور معاشرت میں کوئی فرق و امتیاز
نہ تھا۔ اسلئے قیاس یہی ہے کہ آپ کے والدین نے بھی علاقائی رواج کے مطابق
آپ کا نام کستیر رکھا ہوگا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کے نیک بندے نام و نمود
کے میدان سے دور بھاگتے ہیں۔ انکو تو اپنے تن من اور دھن کا ہوش نہیں ہوتا
اس لئے بھاری بھرکم ناموں کی طرف انکی توجہ ہی مبذول نہیں ہوتی۔ ویسے بھی
اگر دیکھا جائے پھول کو جس نام سے بھی پکارا جائے۔ اُس کے حسن اور مہک میں نام
کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا۔

بعد میں علاقائی رواج کے نتیجے میں لوگوں نے نام کے ساتھ محبت و پیار
کے طور پر گل کا لاحقہ بھی لگایا۔ اور آپ کو کستیر گل کہا جانے لگا۔ چنانچہ اس رواج
کے مطابق بعد میں آپ کے تمام صاحبزادوں کے ناموں کے ساتھ بھی گل کا لاحقہ
لگایا گیا ہے۔

لقب آپ زیادہ تر "رحمکار" کے نام سے مشہور و متعارف ہیں۔ یہ
آپ کا لقبی نام ہے۔ چونکہ آپ حد درجہ نرم دل، شفیق، مہربان اور فیض رساں
تھے اور ہر چھوٹے بڑے کیلئے آپکی آغوش شفقت وا رہتی تھی۔ اسلئے آپ کو رحمکار
کہا جانے لگا۔ یہ نام بعض تذکروں میں کاتبوں اور عوام کی ستم ظریفی سے "لمکار اور
رامکار" بھی لکھا ہوا ملتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ "رحمکار" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت شیخ احمد سرہندی قدس اللہ سرہ العزیز کے لئے "مجدد الف ثانی"
کا لقب پہلی بار حضرت مولانا عبد[illegible] سیالکوٹی نے استعمال کیا تھا۔ اسی طرح یہ
بھی مشہور ہے کہ حضرت مولانا اشرف [illegible] قدس اللہ سرہٗ کیلئے "حکیم الامت [illegible]

کالقب پہلی بار مرزا احمد بیگ مرحوم مالک "مطبع محبوب المطابع دہلی" نے استعمال کیا تھا۔ اور پھر ان القاب کو اللہ تعالیٰ نے ایسی مقبولیت بخشی، کہ اصلی ناموں سے بھی زیادہ مشہور ہوئے۔ میرے پاس کوئی ایسی دستاویزی ثبوت تو موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ رحمکار کا لقب آپکے لئے پہلی بار کس نے استعمال کیا ہے۔ البتہ یہ روایت حد تواتر تک زبان زد عوام و خواص ہے۔ کہ سردارانِ مغلیہ آپ کو رحمکار کے لقب سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پشتون لوگ بھی آپ کو اسی لقبی نام سے پکارا کرتے تھے۔ اور آپ کا یہ لقبی نام آپ کی زندگی میں عوام و خواص میں مروج اور مقبول ہو چکا تھا۔ میں اپنے اس موقف کی تائید میں حسب ذیل اشعار پیش کرتا ہوں۔ خان خوشحال خان خٹک مرحوم اپنی مشہور نظم فراقنامے میں لکھتا ہے (اپنے وطن کی یاد میں) ؎

شیخ رحمکار چہ پکښې پروت دے ؛ زما پلار چہ پکښې پروت دے

یا ؎ د خوشحال تکیه په خدائے ده
بیا په تا شیخ رحمکاره!

یا ؎ په شیخ رحمکار مے تازه توبه وکړه
هغه نګارے راته عشوه وکړه

ان اشعار کے علاوہ خان مرحوم کے کلام میں اور بھی کئی بار "رحمکار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح اشرف خان ہجری سے منسوب اس شعر میں بھی "رحمکار" کا لفظ آیا ہے ؎

زۀ په بند د اورنګ نۀ یم چه بہ خلاص شم
زۀ بند کړے رحمکار زیري کاکا یم

اسی طرح میاں شمس الدین مرحوم اور میاں نذیبین مرحوم نے بھی اپنی اپنی

منظوم مناقبوں میں اکثر اشعار میں "شیخ رحمکار" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات بارھویں صدی ہجری کی شخصیتیں ہیں۔ فقیر جمیل بیگ صاحب نے بھی اپنی کتاب میں آپ کو شیخ رحمکار کے لقبی نام سے یاد کیا ہے۔

اس وضاحت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ آپ کا یہ لقبی نام "رحمکار" نہ صرف مغلوں میں بلکہ پشتون عوام میں بھی مقبول و مروج تھا۔ بہر حال آپ کے لئے یہ لقبی نام پہلی بار جس کسی نے بھی استعمال کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس نام کو ایسا مقبولِ عوام و خواص بنایا، کہ اب آپ کا اصلی نام بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اور تمام اطراف و جوانب میں آپ اصلی نام "ستیر" کی بجائے "رحمکار" کے لقبی نام سے مشہور و متعارف ہیں۔

کاکا صاحبؒ پشتون عوام باپ، چچا بلکہ ہر معمر اور بزرگ شخصیت کو "کاکا" کے لفظ سے پکارا کرتے ہیں چونکہ آپ تمام پشتونوں کیلئے بمنزلہ روحانی باپ کے تھے۔ اور آپ کی ذات مرکز عقیدت تھی۔ اس لئے سب چھوٹے بڑے آپ کو "کاکا" کہکر پکارا کرتے۔ اور از روئے عقیدت و احترام "صاحب" کا لفظ بھی لگا دیتے۔ اور آپ کو "کاکا صاحب" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ پشتون عوام میں کاکا صاحب کے عرفی نام سے مشہور ہوئے۔ اور یہ نام اس قدر مروج و مقبول ہوا، کہ اب آپ کی اولاد بھی آپ کے اس عرفی نام کی مناسبت سے کاکا خیل کہلاتی ہے۔ اور جس مقام پر آپ کا مزار واقع ہے۔ وہ مقام بھی آپ کے اس عرفی نام پر "زیارت کاکا صاحبؒ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام نوشہرہ ریلوے سٹیشن سے بجانب جنوب دس کلو میٹر کے فاصلے پر پہاڑوں کے درمیان سطح سمندر سے تقریباً چار سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اور ساڑھے تین

سو سالوں سے مرجع خلائق ہے۔

"زیڑے کاکا" جس طرح آپ اپنی زندگی میں عوام وخواص میں "رحمکار" کے لقبی نام سے مشہور تھے، اسی طرح پشتون عوام آپ کو "زیڑے کاکا" (پیلے رنگ والا کاکا) کہکر پکارا کرتے۔ جیسا کہ اشرف خان سے منسوب شعر سے ظاہر ہے۔ پشتون عوام پیار کے طور پر اپنے بزرگوں کو "نسپین کاکا" (سفید رنگ والا کاکا) بھی کہتے ہیں۔ مگر آپ کو "زیڑے کاکا" کہا جاتا تھا۔ اسکی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ چونکہ آپ نے بہت زیادہ ریاضتیں اور مجاہدے کئے تھے۔ اور آپ نہایت کم خواب و کم خوراک تھے، اس لئے بدن میں خون کی کمی کے باعث آپ کا رنگ پیلا ہوتا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ کہ آپ کا اسم محضہ کستیر تھا اور "کستیر" زعفران کے پھول کو کہتے ہیں۔ جو پیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ اسلئے ممکن ہے کہ اسم محضہ کی مناسبت سے آپ کو "زیڑے کاکا" کہا جاتا ہو۔

نسب آپ حسینی سید ہیں، اور جیسا کہ شجرہ سے ظاہر ہے آپ کا سلسلہ تئیسوئیں ۲۳ واسطے سے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے چونکہ آپ کا سلسلہ حضرت امام جعفر صادقؒ کے بڑے صاحبزادے امام اسمٰعیل تک پہنچتا ہے اسلئے سیادت کی شاخ میں آپ اسمٰعیلی سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے آپ کو سیدنا امام کاظم کی اولاد میں سمجھا ہے، انکو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے آپ کی سیادت پر شبہات ظاہر کئے ہیں، انکے بارے میں آئندہ صفحات میں اپنے موقع پر مناسب روشنی ڈالی جائے گی۔

ولادت باسعادت حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کی ولادت سے کچھ عرصہ قبل کی بات ہے، کہ آپ کے والد حضرت قطب عالم شیخ بہادر قدس سرہ

ایک بہرہ تھے کشمیر نامی قوم خٹک کے۔ اتفاقاً اسی کشمیر کا ایک شیر خوار بچہ بہت بیمار ہوا۔ کشمیر خٹک اس بچے کو بغرض دعائے صحت حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب کی خدمت میں لایا۔ اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ کہ یا شیخ! بارگاہ خداوندی میں میرے اس بچے کی صحت و زندگی کیلئے دعا کیجئے۔ یہ بچہ اس وقت تقریباً حالتِ نزع میں تھا۔ حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب اس وقت جوش و جلال کی حالت میں تھے۔ اپنی اہلیہ سے فرمایا۔ کہ اپنے شیر خوار بچے کو نہلا دھلا کر پنگھوڑے میں ڈال دو۔ اور کشمیر کا بچہ بھی اسکے پہلو میں لٹا دو۔ اور دونوں پر چادر بچھاؤ۔ چنانچہ آپ کی اہلیہ محترمہ نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر بعد چادر ہٹائی گئی تو کشمیر کا بیمار بیٹا روبصحت ہونے لگا تھا۔ مگر شیخ بہادر صاحب کا اپنا شیر خوار بچہ فوت ہو چکا تھا۔ یہ حالت دیکھکر حضرت قطب عالم کی اہلیہ جزع و فزع کرنے لگی۔ اس پر حضرت قطب عالم نے اُسے فرمایا۔ کہ تم اللہ تعالیٰ کے کاموں پر صابر و شاکر رہو۔ اس بچے کے عوض اللہ تعالیٰ تمکو ایک ایسا بچہ عطا کر دیگا جس کا فیضان رہتی دُنیا تک جاری رہے گا۔ اور جو نہ صرف اپنے خاندان کے لئے باعث افتخار ہوگا، بلکہ ایک عالم کو بھی اس سے بے انتہا فیض پہنچیگا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ متولد ہوئے۔ حضرت شیخ رحمکار کے اس شیر خوار متوفی بھائی کی قبر حضرت مست بابا کے مزار میں موجود ہے۔

یہ روایت نہ صرف یہ کہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کے تمام مناقبوں میں مذکور ہے۔ بلکہ تاریخ مرصع میں بھی موجود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اس روایت کی مزید تائید ایک اور واقعے سے بھی ہوتی ہے۔ جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جناب [illegible] خان صاحب خٹک (ریسرچ آفیسر پشتو اکیڈیمی) (پشاور یونیورسٹی)

نے مجلہ پشتو خوشحال خان نمبر (مارچ اپریل مئی ۱۹۸۰ء) میں اپنے ایک مضمون (بعنوان مریدان شیخ رحمکار) میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ جس سے اس روایت کی مزید تائید ہوتی ہے۔ پوردل خان صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

علاقہ بارک خٹک میں قوم کاکاخیل کا ایک خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد "ظاہر شاہ کاکاخیل" نے دو افراد کو قتل کیا۔ علاقے کا تھانیدار میاں صاحب کا دوست تھا۔ تھانیدار نے میاں صاحب کو مشورہ دیا۔ کہ اپنے جرم کا اعتراف کرلو میں تمہیں صاف چھڑالونگا۔ چنانچہ میاں صاحب مذکور نے تھانیدار کے ورغلانے پر عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ اور عدالت سے اسے پھانسی کی سزا ملی۔ اور تمام اپیلیں بھی مسترد ہوگئیں۔ چنانچہ اس کے بعد علاقہ بارک کے چار معزز سفید ریش جو فوج سے صوبیدار میجر کے عہدوں سے ریٹائر ہوچکے تھے، ایک وفد کی شکل میں وائسرائے ہند کے پاس گئے، اور وائسرائے کی خدمت میں درخواست کی کہ ہمارے قبیلہ بارک کے پیرو مرشد حضرت قطب عالم شیخ بہادر قدس سرہ نے کشمیر نامی ایک خٹک کے بیمار بیٹے کی صحت اور زندگی کے لئے اپنے شیرخوار بچے کی موت کی دعا مانگی تھی اور جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر کشمیر کے بیمار بیٹے کو صحت دیکر زندہ رکھا۔ اور حضرت شیخ کا بیٹا اسی وقت فوت ہوگیا۔۔ چنانچہ ہم تمام خٹک کاکاخیلوں کے زیر احسان ہیں اور اس احسان کا بدلہ ابھی تک ہم نے نہیں دیا ہے اسلئے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ظاہر شاہ کی سزائے موت معاف کریں تاکہ ہم اس احسان کے بوجھ سے سبکدوش ہوجائیں۔ چنانچہ وائسرائے ہند نے ان معززین کی درخواست منظور کرکے ظاہر شاہ کو بالکل معاف کیا اور وہ چھوٹ گیا۔ مگر ساتھ ہی ان معززین کو بھی تاکید کی کہ آئندہ اس قسم کے احسانات لینے سے گریز کریں۔

اس واقعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہے، کہ یہ ایک سچا واقعہ تھا اور تقریباً چار سو سال سے پشت بہ پشت تواتر کے ساتھ لوگوں کو اس کا علم اور یقین تھا۔

متعدد روایتوں سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب کی پیدائش سے پہلے متعدد خوابوں میں آپ کی والدہ ماجدہ کو اس قسم کی بشارتیں دی گئی تھیں۔ کہ آنے والا مولود مسعود نہایت بابرکت ہوگا۔ چنانچہ ۳۰ شعبان یا یکم رمضان (یوم شک) کی درمیانی رات کو صبح صادق سے کچھ دیر پہلے آپ اس دُنیا میں تشریف لائے۔ اور حضرت قلب عالم شیخ بہادر صاحب کا کاشانہ آپ کے بابرکت وجود سے منور ہوا۔ یہ اکبر کے جلوس کا بیسواں سال (۹۸۳ھ) تھا۔ اس زمانے میں صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ رسمی طور پر اکبر کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم والیٔ کابل کے زیرِ تصرف تھا۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتسابِ فیض

جیسا کہ آئندہ صفحات میں تفصیل سے ذکر کیا جائیگا، کہ آپ مادر زاد ولی تھے۔ بالفاظِ دیگر آپ اُویسی تھے۔ اور نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آپ کی روحانی تربیت ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق اسی دن اور ایک دوسری روایت کے مطابق چالیسویں دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے ارواح پاک نے روحانی طور پر آپ پر ظہور فرمایا۔ اور آپ کو فیض بخشا۔ اسی طرح دوسرے صحابہ عظام اور اولیائے کرام کے ارواح نے بھی آپ سے ملاقات کی۔ اور آپ کو برکت دی۔ اور حضرت شیخ بہادر صاحب قدس سرہ نے جو خود بھی اسی راستے کے بہت بڑے شہسوار تھے، روحانی طور پر اس باطنی معاملے کو بچشم خود دیکھا۔ اور اس بارے میں اپنی اہلیہ محترمہ کو بشارت دی اور فرمایا "کمال اویا از حضور صلی اللہ علیہ وسلم

لے آپکی تاریخ ولادت "شہباز حقیقت" آیہ سے نکلتی ہے۔

حاصل شد. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر اصحاب کبار و اولیائے عظام از روئے شفقت و مہربانی ملاقات کردہ رفتند۔ (تتمہ مقامات قطبیہ ص۱۶)۔

ایامِ طفولیت میں کثرتِ گریہ۔

آپ کی والدہ ماجدہ سے منقول ہے کہ ایامِ طفلی میں آپ بہت رویا کرتے تھے۔ اس بات سے آپکی والدہ ماجدہ کو اندیشہ ہوا کہ شاید بچے پر کسی جن بھوت کا اثر ہے۔ چنانچہ یہ بات حضرت قطب عالم شیخ بہادر قدس سرہ کے علم میں لائی گئی۔ مگر حضرت قطبِ عالم نے اپنی اہلیہ سے فرمایا: اے عزیزہ! بختئی! (یہ حضرت رحمکارؒ کی والدہ ماجدہ کا نام ہے) یہ بچہ ابھی آئندہ زندگی میں جس بلند مرتبے پر پہنچنے والا ہے، اس کے نور کو دیکھکر فی الحال اپنے آپ میں اسکی برداشت کی طاقت نہیں پاتا لہٰذا وہ روتا رہتا ہے۔ اس بچے پر جن بھوت کا اثر نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ نیز آپ کے بارے میں یہ بھی منقول ہے۔ کہ ماہ رمضان میں آپ شیر خوارگی کے ایام میں صرف ایک بار ہی شام کو دودھ نوش فرمایا کرتے تھے۔ گویا دن کے وقت روزے سے ہوتے۔ نیز حضرت شیخ بہادر قدس سرہ نے آپ کے بارے میں فرمایا کہ اے عزیزہ! میرا صرف ایک مرتبہ ہے یعنی علم باطن کا۔ اور اس کے دو مرتبے ہیں۔ یعنی علم ظاہر و باطن ہر دو میں اوجِ کمال کو پہنچیں گے۔ نیز آپ کے بارے میں یہ بھی فرمایا، کہ اے عزیزہ! تم نے میرے سائے میں جو چیزیں نہیں کھائی ہیں اس کے وقت میں وہ تم کو مل جائینگی۔ نیز آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے، کہ یہ بچہ گنے کی طرح شیریں، لذیذ اور مرغوبِ عوام و خواص ہوگا۔ (مقامات قطبیہ ص۱۳۷)۔

حضرت شیخ رحمکارؒ کاکا صاحب کا مولد و مسکن

حضرت شیخ بہادر قدس سرہ موجودہ قصبہ زیارت کاکا صاحب سے بجانب جنوب مغرب

دس بارہ میل کے فاصلے پر موضع کناخیل، علاقہ خٹک کے نزدیک۔ ایک جنگل میں مقیم تھے۔ حضرت رحمکارؒ کی ولادت بھی اسی جگہ ہوئی۔ زمانہ طفولیت بھی وہاں گذارا۔ حضرت شیخ بہادر کے مزار کے قرب وجوار میں انکے رہائشی مکان اور مسجد کے آثار ابتک کچھ نہ کچھ باقی ہیں۔ حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحبؒ کی وفات ۱۰۲۷ھ کے بعد تین سال اور بھی آپ اس آبائی مسکن میں رہے۔ اسکے بعد یعنی ۱۰۳۰ھ کے لگ بھگ وہاں سے چل کر موجودہ قصبہ زیارت کاکا صاحب سے بجانب مغرب وجنوب میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اس جگہ قیام پذیر ہوئے، جسے آجکل "میلہ" کہاجاتاہے۔ اس جگہ پہاڑوں کے درمیان ایک چشمہ ہے۔ یہاں آپ نے رہائش اختیار کی۔ اور آپ کے ورود مسعود سے یہ غیر آباد جگہ بہت جلد مرجع خلائق بن گئی۔ اس ضمن میں صاحب مجمع البرکات لکھتے ہیں:-

"از حضرت جمال خان واز حضرت شمس الدین نقل است کہ صاحبان ما یان ہر یکے از پدر خود در مرتبہ ولایت زیادہ بود۔ پس ہر یک بدان سبب بہ جائے پدر خود نہ نشست۔ و دران رعایت ادب نیز ہست و در مرتبۂ ادب ہم ایشاں کامل تر اند۔ بنابرین آنحضرت پس سہ سال رحلت صاحب کلان از جائے ایشان روانہ شدند۔"

مجمع البرکات کی یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ حضرت رحمکارؒ کے اجداد کے مزارات ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر مختلف مقامات پر واقع ہیں۔ اور اس کا باعث یہی احترام اسلاف ہے۔

علوم ظاہری کی تحصیل وتکمیل

میاں محمد بادشاہ کاکاخیل مرحوم اپنے قلمی مسودہ میں لکھتے ہیں کہ کتاب "مرآۃ الخیال" (۱۱۰۶ھ) کے

مطابق حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ علماء و فضلاء کے بہت قدر دان تھے۔ اکثر علمائے وقت آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور آپ انکی بہت قدر افزائی اور دلجوئی کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ بہادر قدس سرہٗ نے اپنے عزیز فرزند کو قاضی ابوالفتح بلگرامی کے والد قاضی ابوالعلیٰ جو قاضی "بدھا" کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، بچپن میں سپرد کیا تھا۔ آپ نے چھوٹی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اور دوسرے علوم و فنون کی تحصیل میں مصروف ہوئے۔ آپ کے اساتذہ میں جناب عبداللہ انصاری سلطان پوری اور مولانا عبداللطیف سلطان پوری کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات علوم عصری میں بڑے باکمال تھے۔ مولانا عبداللہ انصاری سلطان پوری عالم بے بدل اور مشاہیر فقراء میں سے تھے۔ آپ شیر شاہ سوری کے عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ اکبر کے عہد میں شیعہ علماء آپ کے سخت مخالف ہو گئے اور اکبر نے ان کی ایماء پر آپ کو ہندوستان سے خارج کر دیا۔ چنانچہ آپ مکہ معظمہ چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے۔ واپسی میں ولایت افاغنہ میں آئے اور حضرت قطب عالم شیخ بہادر قدس سرہ کے پاس مقیم ہوئے۔ ۱۰۰۶ھ میں آپ دوبارہ ہندوستان چلے گئے۔ مگر بہت جلد دشمنوں نے زہر دیکر آپ کو شہید کر دیا۔

جناب عبدالحلیم صاحب اثر نے اپنی کتاب روحانی رابطہ میں حضرت رحمکارؒ کے اساتذہ میں قاضی ملان صاحب کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ قاضی ملان نے علم تجوید میں ایک رسالہ حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب کی ہدایت پر تالیف کیا تھا۔ اسلئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ علم قرأت و تجوید حضرت رحمکار نے اسی قاضی ملان صاحب سے حاصل کیا ہو۔ اس قیاس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہٗ کے فرزند حضرت شیخ عبدالحلیم

صاحب نے بھی اپنی کتاب مقالات قدسیہ میں ایک مقالہ علم قرأت وتجوید کے بارے میں لکھا ہے۔ اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے، کہ قرآن فہمی کیلئے آپ قرأت کی درستی کو بہت ضروری جانتے تھے۔ نیز آپ نے حضرت رحمکار قدس سرہ کے قرآن فہمی کے بارے میں بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس کا ذکر اپنے موقع پر کیا جائیگا۔

آپ کے زمرۂ اساتذہ میں شیخ اخ الدین یا اخون الدین سلجوقی (مزار اکوڑہ خٹک) کا نام بھی بہت مشہور ہے۔ اور مجمع البرکات میں حضرت رحمکارؒ کا آپ سے مشکوٰۃ شریف پڑھنے کا ذکر کیا گیا ہے، مگر یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب حضرت رحمکار کاکا صاحب علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہو چکے تھے۔ اور مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہو چکے تھے۔ جناب شیخ اخ الدین صاحبؒ بڑے عالم فاضل انسان تھے، اور روحانی فیض حاصل کرنے کی غرض سے حضرت رحمکارؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وطن جانے کی اجازت چاہی، مگر چونکہ حضرت رحمکار قدس سرہٗ کی یہ خواہش ہوتی تھی۔ کہ زیادہ سے زیادہ علماء انکے پاس رہا کریں۔ اس لئے آپ نے جانے کی اجازت نہ دی۔ مگر چونکہ آپ نے جانے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا۔ سلئے چند دن بعد بلا اجازت بیل پر سامان لاد کر چل پڑے مگر کچھ دور جا کر بیل زمین پر لیٹ گیا اور کوشش کے باوجود بھی نہ اٹھا۔ چنانچہ مجبوراً مولانا صاحب کو رات وہیں بسر کرنی پڑی، صبح ہوئی تو آپ نے حضرت شیخ کے پاس دوبارہ جانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ دل میں یہ خیال آتے ہی بیل بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور جناب اخ الدین صاحب واپس حضرت شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بلا اجازت جانے کے لئے معذرت کی، حضرت رحمکارؒ نے آپ کو تسلی دی اور فرمایا کہ آپ مستقل

طور پر یہاں رہیں۔ آپ کی اولاد میری اولاد کے ساتھ رہیگی۔ اور جو حال میری اولاد کا ہوگا۔ وہی آپ کی اولاد کا ہوگا۔ اس موقع پر مولانا صاحب نے عرض کیا کہ اگر آپ مجھ سے رسمی طور پر مشکوٰۃ شریف کے چند اسباق پڑھ لیں۔ تو بعد میں آنے والوں کے لئے ایک دلیل ہوگی۔ اور میری تسلی ہوجائیگی چنانچہ حضرت رحمکارؒ نے یہ بات منظور کرلی۔ اور مشکوٰۃ شریف کے چند اسباق آپ سے پڑھ لئے۔ اس طرح ان کے استاد ہونے کی حیثیت مسلم ہوگئی۔ اور اس واقعے کے سبب یہ بات مشہور ہوئی۔ کہ اخ الدین صاحب سلجوقی حضرت رحمکار کاکا صاحب کے اُستاد ہیں۔

صاحب مجمع البرکات نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک حدیث کے ضعف و قوت کے بارے میں حضرت رحمکار نے اپنے استاد سے بحث کی۔ اور ایسے دلائل پیش کئے کہ اُستاد صاحب لاجواب ہوگئے۔ اس پر اُستاد نے کہا کہ صاحب یہ سب کچھ باطنی اثر ہے۔ چنانچہ حضرت اخ الدین صاحب فیوض باطنی کے حصول کی خاطر ان سے بیعت ہوئے۔ اور حضرت شیخ المشائخ کی خاص توجہات کے باعث بہت جلد سلوک کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔

جناب مفتی سیاح الدین کاکاخیل اپنی کتاب تذکرہ شیخ رحمکار میں اس واقع کے بارے میں یہ لکھتے ہیں: کہ مشکوٰۃ شریف کا وہ نسخہ جو حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کے زیر مطالعہ تھا۔ اس میں یہ حدیث نشان زد کی گئی ہے اور حاشیہ پر یہ واقعہ بھی لکھا تھا۔ یہ کتاب حضرت اخ الدین صاحب کی اولاد میں ایک حید عالم دین مولانا منظہر الحق صاحب عرف گلاب آغا کے پاس موجود تھی۔ مگر نوابان ٹیری میں سے ایک نواب صاحب کو اس کتاب کا علم ہوا اور اُس نے مشکوٰۃ شریف کا یہ نسخہ بصد اصرار حاصل کرلیا۔ اور ممکن ہے کہ ان کے

کتب خانہ میں اب بھی موجود ہو۔

غرض حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ علوم ظاہری کی تکمیل وتحصیل میں تقریباً پچیس سال تک مصروف رہے۔ آپ نے تفسیر، حدیث اور فقہہ کا بطور خاص مطالعہ کیا تھا۔ اور ان علوم میں آپ کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ یہ بات حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کی تحریر سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "وحضرت شیخنا در دقائق اسرار و معانی قرآن سیرے و درکہ عظیم داشت۔" (مقامات صـ۱۲) یعنی ہمارے شیخ قرآن کریم کے اسرار و رموز سمجھنے میں بڑے ماہر تھے۔ علوم معقول میں بھی آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور اکثر اہل علم اپنے اشکالات آپ کے سامنے پیش کیا کرتے تھے۔ مجمع البرکات میں آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے:۔

"پس بہ ہر تقدیر استعال وتحصیل علوم ظاہری بست و پنج سال کردہ (صـ۲۳۸) یعنی آپ علوم ظاہری کی تکمیل وتحصیل میں پچیس سال تک منہمک رہے"۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے، کہ اگرچہ آپ علوم ظاہری کی تکمیل وتحصیل وتکمیل میں تقریباً پچیس سال تک مصروف رہے تھے مگر اس کے ساتھ آغاز شباب سے ہی آپ نے روحانی علوم کے اکتساب کی طرف بھی توجہ کی ہے اور اپنے والد گرامی قدر سے روحانی تربیت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ خان خوشحال خان خٹک اور فقیر جمیل بیگ صاحب ہزؒ کے بیانات سے یہ بات ظاہر ہے۔

حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ کی ریاضتیں اور مجاہدے

چونکہ شہوات دنیا کی لذتیں بدن سے متعلق ہیں اس لئے جب آپ

بدن کو مشغول نہ کیا جائے تب تک خواہشات نفس کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے تزکیہ قلب اور باطن کی صفائی کے لئے مجاہدات اور ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت شیخ حماد قدس سرہ ابتداہی سے دنیا سے بیزار تھے۔ آپ عموماً لوگوں سے دور الگ تھلگ خاموشی سے غور و فکر میں مستغرق رہتے۔ آپ نے ابتدائی عمر میں جہاد نفس میں جو حیران کُن مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں، ان کی کچھ تفصیل یہاں مقامات قطبیہ سے نقل کی جاتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں:۔

"وحضرت شیخ المشائخ شیخنا بسیار مرتاض وقت خود بود ونیرے ازبیشہ ریاضت ونہنگے از دریائے محنت بود۔ وحضرت الیشان درحالت صغر وخوردگی چنان ریاضت ہا ومحنت ہا کشیدہ بودند، کہ در شمار نمی آید ..... الخ"۔ (ترجمہ) اور ہمارے پیر و مرشد حضرت شیخ اپنے زمانے کے مرتاض ترین انسان تھے۔ گویا ریاضت کے جنگل کے شیر اور محنت کے دریا کے نہنگ تھے۔ اور حضرت نے طفولیت اور صغر سنی کے زمانے میں اتنی ریاضتیں کی ہیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں .....۔" اور ان مجاہدوں اور ریاضتوں کے باعث آپ حد درجہ کمزور ہو چکے تھے۔ چنانچہ جہاد نفس کے ان ایام کا واقعہ ہے، کہ ایک دن آپ کی والدہ گھر میں کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ انہیں مل نہیں رہی تھی حضرت کو معلوم تھا کہ وہ چیز کہاں ہے۔ مگر ان ایام میں آپ بالکل خاموش رہتے۔ اور ہر وقت ذکر و فکر میں مستغرق ہوتے۔ آپ والدہ کو پریشان دیکھ کر اس خیال سے اٹھنے لگے۔ کہ وہ چیز اٹھا کر والدہ کو دیدیں۔ مگر جونہی آپ کھڑے ہوئے۔ نقاہت اور کمزوری کے باعث آپ کا سر چکرایا اور تیورا کر گر پڑے۔ اور بیہوش ہو گئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ آپ کی یہ حالت دیکھ کر

پریشان ہوگئیں اور رونے لگیں انکو اندیشہ ہوا کہ آپ پر کسی جن بھوت کا اثر ہوگیا ہے،
لیکن کچھ دیر بعد ہوش میں آگئے۔ والدہ کو پریشان دیکھکر فرمانے لگے۔ اے پیاری
والدہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جو چیز آپ ڈھونڈ رہی تھیں وہ مجھے معلوم
تھی۔ میں اس خیال سے اٹھا کہ وہ چیز آپ کو دیدوں۔ مگر کمزوری کے
باعث میرا سر چکرا گیا اور میں گر پڑا۔ اس کے بعد آپ نے وہ چیز اٹھا کر اپنی
والدہ کو دیدی۔

عموماً آپ لوگوں سے بہت دور جنگل میں جاکر ذکر و فکر میں مصروف
رہتے۔ رات کے وقت آپ کی والدہ آپ کی تلاش میں آدمی
وہ آپ کو تلاش کرکے گھر لے آتے۔ ان دنوں میں یہ تمام علاقہ جنگلات
سے اٹا پڑا تھا۔ اور ان میں خونخوار درندے دن رات دندناتے پھرا کرتے
تھے۔ چوروں چکاروں کا بھی بڑا ڈر تھا۔ اور انسانی جان و مال کی کوئی
قدر و قیمت نہ تھی۔ مگر آپ تمام خطرات سے بے خوف ہوکر مجاہدہ نفس
میں مشغول رہا کرتے تھے۔

وسط حال میں آپ سخت سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی
میں بیٹھکر ذکر و فکر میں مصروف ہو جاتے۔ اور نماز تہجد کے وقت پانی سے
باہر آکر کپڑے نچوڑ لیتے۔ اور نماز تہجد کی ادائیگی میں مشغول ہو جاتے سردی
کی شدت کی وجہ سے آپ کے کھلے حصوں پر پانی جم جاتا۔ گرمی کے موسم
میں آپ گرم پانی میں بہت سا نمک ملا کر اس سے روزہ افطار کرلیتے۔
اور اس سے نفس کی گوشمالی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا
کہ آپ ٹھنڈے پانی میں بیٹھے ہوتے۔ تو وہ پانی اتنا گرم ہو جاتا، کہ
اسمیں ہاتھ نہ ڈالا جاسکتا تھا۔ اور آپ ذکر و اذکار میں ایسے

جوش وخروش میں ہوتے، کہ آپکی گرمی کے باعث آپکے سر کے اوپر دھوئیں اور بخارات کا ایک چھتر سا بن جاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا، کہ آپ سخت گرمی کے موسم میں تھر تھر کانپنے لگ جاتے۔ حضرت فقیر جمیل بیگ صاحب اور میاں شمس الدین صاحب نے اپنی اپنی کتابوں میں آپ کی اس حالت کا نہایت موزون اور پُر اثر الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اس ضمن میں میاں شمس الدین مرحوم اس طرح لکھتے ہیں:۔

چہ بہ دے کیناستو دروره ... یہ سرو اوبو کینے کوره !
شوے اوبۀ بہ وارہ گرمے ... یخ بہ لار شو شوے بہ ترمے
دے بہ میخ بہ داوبو کینے ... یارہ دو بہ جوشیدو کینے
هسے شان بہ لیشیدو ... دے بہ جوش بہ جوشیدو
چہ لوخرے بہ بے قیاسہ ... پہ دۀ چتر شوے دپاسہ
کماہ بہ اوری کینے بہ وروره ... ریبز دید و هسے پہ زوره
حد ائے عالم دے یہ دے کار ... د دوستانو پہ اسرار
زۀ او تہ یرے خبر نۀ یُو ... پہ دے راز چہ رھبر نۀ یُو

(ترجمہ) "اے بھائی جب آپ ٹھنڈے پانی میں بیٹھ جاتے، تو اُسکی ٹھنڈک غائب ہوجاتی۔ اور وہ پانی گرم ہوجاتا۔ اور پانی میں بیٹھے ہوئے آپ جوش محبت میں ایسے کھولتے رہتے کہ آپ کی گرمی سے پانی سے دھوار اور بخارات اٹھنے لگ جاتے۔ اور آپ کے سر کے اوپر دھویں اور بخارات کا ایک چھتر سا بن جاتا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا، کہ آپ سخت گرمی میں (سردی سے) تھر تھر کانپنے لگ جاتے۔

اللہ تعالیٰ ہی اپنے دوستوں کے کاروبار سے واقف ہے۔ ہم اور آپ

کیا جانیں کہ ان باتوں سے واقف نہیں ہیں۔

میاں محمد مبین مرحوم نے بھی اپنے منظوم مناقب میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے ہیں:

حضرت شیخ دانشمند قدس سرہ نے اپنے والد ماجد حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی ریاضتوں اور مجاہدات کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ جنہیں پڑھکر حیرت ہوتی ہے۔ ان کا بیان کرنا طوالت کا باعث ہے۔ اسلئے میں اس عنوان کو حضرت شیخ دانشمند ہی کے الفاظ میں ختم کرتا ہوں۔ آپ لکھتے ہیں:

"این سرمایۂ ریاضت است ہر کرا سرمایہ ریاضت روئے دادہ نعمت ابدی و دولت سرمدی نصیب او می گردد۔۔۔۔ الخ ؎

مردان زجد و جہد بجائے رسیدہ اند ؛ آنرا کہ جد و جہد نباشد کجا رسد"

ترجمہ: اور یہی ریاضت کا سرمایہ ہی تو ہے جس کسی کو ریاضت کا سرمایہ مل جائے اُسے گویا ابدی نعمت اور سرمدی دولت مل گئی۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے: کہ جوانمرد جد و جہد کے ذریعے منزل مقصود پالیتے ہیں اور جو جد و جہد سے کتراتے ہیں، وہ کب منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

کم خوراکی ہر چیز کا غلبہ قوت پر موقوف ہے۔ ہر لاغر اور کمزور مغلوب ہوتا ہے۔ فاقہ اور کم خوراکی جسم کو کمزور اور روح کو بیدار کرتا ہے۔ کھانا نفس کی اور بھوک روح کی غذا ہے، جو دل اللہ کے حضور میں حاضر ہو اس کا کسی دوسری طرف متوجہ ہونا ممکن ہی نہیں۔ اہل دنیا بھوک اور فاقے کو مصیبت سمجھتے ہیں، مگر اہل سلوک فاقے کو ایک بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔ اور اس پر صبر اور شکر کرتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ فرماتے ہیں: جب کبھی ...

دو دن متواتر کھانا مل جاتا۔ تو میری خواہش ہوتی کاش والدہ صاحبہ مجھے کہیں
کہ بابا محمد! آج ہم خدا کے مہمان ہیں یعنی بھوکے رہیں گے۔

حضرت سری سقطی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں: عارف وہ ہے جس کا کھانا
بیماروں کی طرح ہو۔ اور اُس کا سونا مارگزیدہ کی طرح ہو اور اس کا عیش
غرق شدہ کی طرح ہو۔

حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہٗ بھی نہایت کم خوراک تھے۔ اس
بارے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں۔ (ترجمہ):۔

حضرت شیخ جی صاحب شکم پُری اور بسیار خوری کو مکروہ جانتے تھے۔
اور اسے بہت ناپسند کرتے تھے۔ کیونکہ بزرگوں کا کہنا ہے، کہ جس طرح
آفتاب غروب ہو جانے کے بعد تاریکی چھا جاتی ہے۔ اسی طرح جب پیٹ
بھر جاتا ہے، تو باطن میں تاریکی پھیل جاتی ہے۔ اور باطن کو تاریک بنا دیتا
ہے۔ مگر حضرت شیخ صاحب کے اوقات شریف میں ایک وقت ایسا بھی آیا
تھا کہ پورا مہینہ یعنی تیس راتوں میں تیس سیر پختہ گھی روٹی کے ساتھ کھایا تھا۔
یعنی ہر رات ایک سیر پختہ گھی روٹی کے ساتھ تناول فرمایا تھا۔ اور اس تمام
مہینے میں ایک ہی وضو سے خفتن کی نماز پڑھ کر فجر کی نماز تک تمام رات نوافل
میں مصروف ہوتے۔ اور اس طریقے سے جب یہ مہینہ گذر گیا۔ تو حضرت شیخ
المشائخ نے ان الفاظ میں اس کی تعریف کی۔ کہ بہت اچھا وظیفہ تھا اس
مہینے کا جو گذر گیا۔

نیز یہ بھی منقول ہے کہ حضرت شیخ المشائخ نے ابتدائے حال میں
پورے اٹھارہ مہینے تک کھانا بالکل نہیں کھایا تھا۔ اور ایک سال تک
پانی بالکل نہیں پیا تھا۔ لیکن آخر حال میں بہت دفعہ دو دو مہینے کچھ نہیں

کھایا تھا۔ اور حضرت کے کھانے کا معمول یہ تھا کہ کبھی بہت عرصے تک جو کی روٹی تناول فرماتے۔ اور کبھی بہت عرصے تک باجرے کی روٹی اور کبھی کافی لمبے عرصے تک دوسرے غلوں کی پکی ہوئی روٹی تناول فرماتے مگر سالن اور نمک کے بغیر روکھی سوکھی۔ نیز آپ نہایت پتلی باریک مغز سے خالی روٹی نوش جان کرتے۔ لذیذ کھانوں سے قطعی پرہیز کیا کرتے تھے۔ مگر کسی دوسرے کی خاطر تھوڑا تناول کر لیتے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ کسی کی نظر اس پر نہ پڑی ہوتی۔ یعنی نظر زدہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ بازاری چیزوں سے بھی قطعی محترز رہتے تھے۔ اس ضمن میں حضرت عبدالحلیم صاحب ایک امیر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ

"ایک امیر ایک بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنے ساتھ بازار کی مٹھائیوں میں سے بھی کچھ اپنے ساتھ لایا، اور اسے حضرت کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا۔ کہ یا حضرت اس مٹھائی میں سے جو میں لایا ہوں تھوڑی سی بندہ کے سامنے تناول فرمائیں تاکہ میری تسلی ہو جائے۔ چنانچہ حضرت شیخ المشائخ نے اسکی دلجوئی کی خاطر تھوڑی سی مٹھائی منہ میں ڈالی، اور پھر تھوک دی۔ اس کے باوجود بھی حضرت بعد میں اپنی زبان کو کپڑے سے اس وقت تک رگڑتے رہے جب تک اس مٹھائی کا ذائقہ حلق سے دور نہ ہوا تھا۔ اور حضرت نے اپنی زبان کو اس شدت سے رگڑا تھا۔ کہ آپ کی زبان لہولہان ہو گئی تھی، بعد میں حضرت کو اس سے کئی دنوں تک بڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔ مگر اس امیر کو اس واقع کی خبر تک نہ ہوئی کیونکہ نماز خفتن کا وقت تھا۔ اور اندھیرا تھا۔ چونکہ حضرت شیخ المشائخ بازاری اور نظر زدہ چیزوں کے کھانے سے قطعی پرہیز کرتے تھے۔ اس لئے حضرت کو مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ اور

یہ بات صوفیان باصفا کی خاصیتوں میں سے ہے۔ کہ سچا صوفی نہ تو بازاری چیزیں کھاتا ہے اور نہ اُن کا نفس لذیذ کھانوں کی خواہش رکھتا ہے۔ حضرت سرّی سقطیؒ فرماتے ہیں: "میرا نفس چالیس سال سے شہد مانگتا ہے۔ مگر میں نے اسے شہد نہیں دیا۔ اور دن میں کئی کئی بار آئینہ دیکھتا ہوں، کہ کہیں شامتِ اعمال سے میرا منہ کالا تو نہیں ہو گیا ہے۔"

کم خوابی حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں: "دو خصلتیں انسان کے دل کو سیاہ کر دیتی ہیں۔ بہت کھانا اور بہت سونا۔"

حضرت سری سقطیؒ کا قول گذشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ کہ "سچے عارف کی نیند مار گزیدہ کی طرح ہوتی ہے۔" حضرت شیخ رحمکارؒ قدس سرہٗ کا سونا بھی مار گزیدہ کی طرح تھا۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں:-

"و حضرت شیخنا قلت المنام بود۔ کہ چون در روز وقت قیلولہ احیاناً خواب کردے، مقدار چہار یا پنج دم کشیدن خوابیدہ می بودے، بعدہ بیدار شدے۔ و چشم مبارک باز میکردے۔ واز حقیقت خوابِ شب تمام واقف نیستم ولیکن پندارم و ظن میکنم کہ برنمط روز خواب میکرد۔"

(ترجمہ) اور ہمارے حضرت شیخ قدس سرہٗ بہت ہی کم خواب تھے۔ دن کے وقت اگر کبھی قیلولہ کرتے، تو اسکی مقدار چار پانچ دفعہ سانس لینے سے زیادہ نہ ہوتی۔ بعد میں جاگ اٹھتے۔ اور آنکھیں کھول لیتے۔ اور رات کی نیند کی پوری کیفیت سے واقف نہیں ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں۔ اور گمان کرتا ہوں۔ کہ وہ بھی دن کے خواب کی طرح ہوگی۔

میاں شمس الدین مرحوم اپنے منظوم مناقب میں اس بارے میں

لکھتے ہیں :-

بل ولی شیخ جی آرام ۔۔۔ ھو مرہ خوب کاوو مدام
لکہ خوک چہ ساہ اخلی ۔۔۔ پنځہ څلہ دم راکنبلی
دائے خوب مم پہ غرمہ وو ۔۔۔ ھسے نہ چہ دا پہ شپہ وو
تل پہ شپہ بہ وو قائم ۔۔۔ او پہ ورځ بہ وو صائم

(ترجمہ) "حضرت شیخ جی صاحب دن کے وقت صرف اتنا سویا کرتے تھے۔ جتنا کوئی چار پانچ بار سانس لیتا ہے۔ یہ انکے دوپہر کی نیند تھی نہ کہ رات کی۔ رات کو وہ نوافل پڑھتے اور قیام میں مشغول ہوتے اور دن کو روزہ سے ہوتے۔"

تسلیم و رضا حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ ہر حال میں راضی برضائے الہٰی رہا کرتے تھے۔ اس ضمن میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہ لکھتے ہیں: "ویکے از خواص خاصیتہائے حضرت الیشان شکر بود۔ کہ دائماً در عناو در بلا شاکر و شکور مے بود۔ و ہیچ شکوہ در ہیچ زحمتے و در ہیچ محنتے در پیش نیاوردہ۔ و در ہیچ شدتے تغیر حال نہ شدے۔ و قدم برضائے حق نہادہ واز رضا و نفع خود برگشتہ و رضائے حق اختیار کردہ بود۔ و رضائے خود را در پس انداختہ مرضی الحال بود"۔

بلکہ بسیارے از مریدان حضرت شیخ باین مراتب اعلیٰ رسیدہ بودند۔ حتیٰ کہ یکے از مریدان حضرت شیخ از حال خود می فرمود۔ و مے گفت۔ و بر آن قسم یاد میکرد۔ کہ آن شب کہ در خانہ من چیزے نباشد و عیال من گرسنہ خسپید من در آن شب بسیار راضی الحال و مسرور مے باشم۔ واز گرسنگی و برہنگی ہیچ غمے و المے بر من نمے رسد۔ و نہ ہیچ ترسے و بیمے آزان دارم۔

"و نیز شیخ فتح خٹک مرید حضرت ایشان کہ ماران در خلوتگاہ او مے آمدند۔ وا و را می گزیدند وا و آن ماران را بدست خود نمی کشت۔ و نہ دیگران را حکم بکشتنِ ایشان مے کرد۔ واز زہر آن ماران خون قے میکرد۔ و بسیار ضرر بد می رسید۔ وا و از خدائے خود میدانست۔ واز وے دید۔ واز ایشان سراندازی نمے کرد۔ و نہ از آنجا گریخت۔ وخود را بر ایشان آمادہ ساخت"۔

"تا وقتے از اوقات او در نماز ایستادہ بود۔ یک مار اسود سیاہ در حجرہ او از سوراخ بیرون آمد۔ و بجائے سجدۂ او سر نہاد۔ وآن فقیر حقانی سر را بجائے سجدہ بے دریغ برد۔ و در وقت سجدہ سر بسجدہ گاہ فرود آورد و آن مار سر از آنجا بر داشت وجائے سجدہ را خالی گزاشت۔ باز چون او بہ جلسہ آمد، مار ہمانجائے اول سر نہاد و باز آن مرد حقانی در وقت سجدہ سر بر محل سجدہ گاہ برد۔ باز مار سر برداشت وبطرف مکان خود روان شد۔ و پنہان گشت۔ آنکہ از غیر نہ ترسد۔ وغیرے نہ بیند۔ واز غیرے نہ اندیشد مثل ایشان است"۔

"و نیز منقول است کہ شیخ فتح را پلنگان وسبعان از کوہ ہا مے آمدند۔ وا و را زیارت مے کردند۔ و باز بہ مکانہائے خود مے رفتند۔ پس بہ تامل نظر باید کرد۔ کہ چوں حال مریدان چنین وچنان باشد، حالِ پیر ایشان فوق آن تصور باید کرد۔ زیرا کہ پیر مثل دیگ است ومرید چمچہ۔ ہرچہ در دیگ باشد، در چمچ بیرون آید۔ وآن سوز وجذبات الٰہی کہ در سر وضمیر پیر مودع باشد، مریدان را ازان حظہا ونصیب ہا مے رسد۔ بقدر قسمت ایشان، دگر نہ در مردانِ خدا بخل نیست۔ ومنعِ نعمت ومحبت باطن ومنعِ تکمیل معرفت از مریدان در ضمیر ایشان نمی گنجد۔ و راہ نمی یابد۔ و بر ہمہ خلقِ خدا مشفق و مہربان می باشند۔ لیکن تعلق بہ قسمت ونصیب ازلی دارد"۔

حضرت شیخ دانشمند فرماتے ہیں کہ ۔

(ترجمہ) "حضرت شیخ المشائخ کی خصوصیتوں میں سے ایک خصوصیت یہ تھی۔ کہ آپ ہمیشہ رنج و راحت یعنی ہر حال میں شکر گزار رہتے تھے، اور کسی قسم کی مصیبت میں بھی شکوہ و شکایت نہ کرتے۔ اور کسی سختی اور تکلیف میں بھی آپ کی حالت متغیر نہ ہوتی۔ اور حضرت شیخ نے رضائے حق کے راستے میں قدم رکھا تھا۔ اور اپنے نفس کی مرضی اور رضا چھوڑ بیٹھے تھے۔ اور حق کی رضا اختیار کر چکے تھے۔ اور اپنی مرضی سے دستبردار ہو کر ہر حال میں راضی برضائے الٰہی تھے۔ بلکہ حضرت شیخ المشائخ کے بہت سے مرید بھی ان اعلیٰ مدارج پر پہنچ چکے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت شیخ کے مریدوں میں سے ایک مرید اپنی حالت بیان کرتا ہوا قسمیہ کہتا تھا۔ کہ جس رات میرے گھر میں کوئی چیز نہ ہو۔ اور میرا عیال بھوکا ہو جائے اس رات میں زیادہ خوش اور راضی ہوتا ہوں۔ بھوک اور تنگدستی کے بارے میں مجھے ذرہ بھر بھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اور نہ اس سے مجھے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے۔

"نیز شیخ فتح خشک جو حضرت شیخ المشائخ کے ایک مرید تھے، اس کی خلوتگاہ میں سانپ آیا کرتے تھے۔ اور ان کو ڈس لیا کرتے تھے۔ مگر وہ ان سانپوں کو نہ تو خود اپنے ہاتھ سے مارتے اور نہ دوسروں کو ان کے مارنے کا حکم دیتے۔ اور ان کے ڈسنے اور زہر کی وجہ سے وہ خون قے کیا کرتے۔ اور بہت تکلیف اٹھاتے لیکن یہ سب کچھ خدا کی طرف سے سمجھتے۔ اور اس پر راضی رہتے تھے۔ جزع فزع نہیں کرتے تھے۔ اور نہ حرفِ شکایت زبان پر لاتے۔ اور نہ کبھی اس جگہ سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ بلکہ ان تکالیف کے سہنے کیلئے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا تھا۔"

ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے، کہ ایک کالا ناگ ان کے حجرے میں گھس آیا۔ اور ان کی سجدہ گاہ پر سر رکھا۔ لیکن وہ حقانی فقیر بے دھڑک سجدے

کے وقت سجدہ کے لئے جھکے۔ مگر سانپ سجدہ گاہ سے ہٹ گیا۔ اور سجدہ کی جگہ خالی چھوڑی۔ پھر جب آپ جلسہ کرنے لگے۔ تو سانپ نے پھر سجدہ گاہ پر سر رکھ لیکن دوسری بار بھی وہ حقانی فقیر بے دھڑک سجدہ کرنے لگے۔ سانپ نے اس دفعہ بھی سجدہ گاہ خالی کیا۔ اور اس کے بعد حجرے سے نکل گیا" پس وہ جو غیر سے نہیں ڈرتے، اور نہ غیر کو دیکھتے ہیں۔ نہ غیر کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ ایسے ہی درویش ہوتے ہیں۔"

"نیز یہ بھی منقول ہے کہ چیتے اور درندے پہاڑوں سے اتر کر شیخ فتح کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور پھر واپس چلے جاتے۔ غرض جب حضرت شیخ المشائخ کے مریدوں کا حال یہ تھا۔ کہ ہر حال میں صابر و شاکر رہتے۔ پس دیکھنا اور سوچنا چاہیئے۔ کہ ان کے پیر کا حال تو ان سے بدرجہا بڑھ کر ہوگا، کیونکہ پیر کی مثال تو ایک دیگ کی سی ہوتی ہے۔ اور مرید کی مثال ایک چمچے کی۔ پس دیگ میں جو کچھ ہوتا ہے، چمچے کے ذریعے باہر آتا ہے۔ اور پیر کے ضمیر اور سر میں محبت الٰہی کے جو جذبات سوز ہوتے ہیں۔ ان میں سے مریدوں کو ان کی قسمت کے مطابق حصہ ملتا ہے، کیونکہ مردان خدا میں بخل نہیں ہوتا۔ اور ان کے ضمیر میں یہ خیال ہی نہیں آسکتا۔ کہ اپنے مریدوں سے نعمت باطنی کو روکے رکھے۔ اور ان کے تکمیل معرفت میں بخل سے کام لے۔ کیونکہ وہ تو تمام مخلوقِ خدا پر مشفق و مہربان ہوتے ہیں۔ مگر ان باتوں کا تعلق قسمت ازلی سے ہے۔"

ترک دنیا

حضرت ابن عطار قدس سرہ فرماتے ہیں: جو چیز بندے کو آخرت سے باز رکھنے والی ہے، وہ دنیا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں، جوانمردوں کا کام یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے دل نہ لگائیں۔

حضرت جنید بغدادی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ: قیل و قال اور جنگ و پیکار سے یہ درجہ مجھے نہیں ملا ہے بلکہ بھوک و پیاس، ترکِ خواب اور ترک دُنیا سے ملا ہے۔

ان اقوال کی روشنی میں حضرت رحمکار قدس سرہ کی ترک دُنیا کا جائزہ لیتے ہیں۔

جناب شیخ دانشمند عبدالحلیم صاحب، حضرت شیخ المشائخ قدس اللہ سرہ العزیز کی ترک دُنیا کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"حضرت الیشان از تارکانِ دُنیا بود بلکہ تارک ماسوا اللہ بود۔۔۔۔الخ"

(ترجمہ) "حضرت شیخ جی صاحب تارکانِ دُنیا بلکہ تارکان ماسویٰ اللہ میں سے تھے اور ترک دُنیا کے سلسلے میں تمام عالی ہمتوں سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ آپ نے ہر غیر حق سے آنکھیں موند لی تھیں۔ اور حق کے سوا کسی اور سے سروکار نہیں رکھتے تھے۔ نہ غیر اللہ سے کوئی چیز مانگتے تھے۔ نہ کوئی چیز ذخیرہ کرتے۔ آپ نے ترک ماسویٰ اللہ کیا تھا۔"

اور اے بھائی آپ اس بات سے کبھی پریشان نہ ہوجیئے، کہ اگر میں دُنیا کو چھوڑ دوں تو دُنیا والے بھی مجھ کو چھوڑ دیں گے۔ نہیں، جو خدا کی خاطر لوگوں سے توقع نہیں رکھتا۔ لوگ اُسے ہرگز نہیں چھوڑتے۔

نیز آپ کی ابتدائی زندگی کا یہ واقعہ آپ کی والدہ مشفقہ سے منقول ہے (وہ فرماتی ہیں) کہ:۔

ایک دن ایک عورت کچھ دہی اور سوت کا ایک گچھا بطورِ نذر لے آئی۔ دہی تو لنگر میں صرف ہُوا۔ اور سوت کا گچھا میں نے اِس

خیال سے رکھا۔ کہ اس سے حضرت شیخ جی صاحب کی گدڑی سی لونگی۔
جب حضرت شیخ جی صاحب مسجد سے حجرے میں آئے، تو داخل ہوتے ہی پھر فوراً باہر نکل گئے اور حیران و پریشان دروازے میں کھڑے ہو گئے۔ میں جلدی سے آپ کے پاس آئی۔ اور پوچھا اے میرے بیٹے! کیا بات ہے، کہ آپ اس طرح پریشان کھڑے ہیں، حجرے میں کیوں نہیں جاتے؟ آپ نے فرمایا، "اے مادرِ مشفقہ، حجرے سے مردار کی بو آرہی ہے"۔ میں نے کہا بیٹے آپ کے حجرے میں مردار کا کیا کام؟ آخر میں نے سوچ بچار کے بعد کہا۔ گندگی تو آپ کے حجرے میں کیوں ہوتی، البتہ میں نے سوت کا ایک گچھا آپ کے حجرے میں اس خیال سے رکھا ہے کہ بوقت ضرورت اس سے آپ کی گدڑی سی لونگی۔ اس پر آپ نے فرمایا: اے میری پیاری والدہ! یہ سوت اس وقت محتاجوں کو دیدیں، جب ہمیں سوت کی ضرورت ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ اس کا انتظام کردیگا۔" چنانچہ آپ کی والدہ ماجدہ نے وہ سوت اُسی وقت محتاجوں کو دیدیا۔ اس کے بعد آپ حجرے میں داخل ہوئے۔ اور عبادت میں مصروف ہو گئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ کا بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن اپنے حجرے میں آپ کو عبادت کا لطف نہ آیا۔ آپ نے اپنے خادم سے پوچھا۔ دیکھ گھر میں کیا چیز ہے، اس نے دیکھا تو انگور کا ایک خوشہ نظر آیا۔ فرمایا: "یہ کسی کو دیدو، کیونکہ ہمارا گھر کسی بنیئے کی دُکان تو نہیں"۔

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ جس طرح خود دُنیا کی محبت سے بیزار تھے۔ اسی طرح آپ اپنے خاص مریدوں اور معتقدین کو بھی یہی تلقین

فرمایا کرتے تھے۔ کہ دُنیا کے دھندوں سے دور رہیں۔ اور آخرت کی فکر کریں

حضرت شیخ عبدالحلیم قدس سرہ لکھتے ہیں: "حضرت ایشان بعض اصحاب خود را در باطن از کار دُنیا منع مے کردند کہ در بودنِ دنیا ہیچ فائدہ نیست" (ر ۱۵۹) یعنی آپ باطنی طور پر اپنے بعض مریدوں کو دنیا کے کاروبار سے منع فرمایا کرتے تھے۔ کہ دُنیا کے دھندوں میں زیادہ انہماک کا کوئی فائدہ نہیں۔

اسی طرح شیخ دانشمند یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ شیخ دریا خان قدس سرہٗ جو آپ کے مخلص مریدوں میں سے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے ساتھ کچھ مٹھائی بھی لائے تھے۔ جو حضرت کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے فرمایا:۔ "مرتبۂ دیگر این میارکہ عاشقانِ خدا را باین خاشاک کار نیست" (۱۲۲)۔ یعنی دوبارہ ایسی چیزیں نہ لایا کریں کہ خداوند تعالیٰ کے عاشقوں کو اس کوڑے کرکٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔"

حضرت مولانا رومی قدس سرہٗ اس مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

دیدۂ آن زندہ خاشاک ار جہد	آنکہ آرامد کہ بیرونش کند
در ہزاران لقمہ یک خاشاک خورد	چوں در آید حسِّ زندہ پے برد
حسِّ دنیا نردبانِ این جہان	حسِّ عقبیٰ نردبانِ آسمان
صحتِ این حس بجوئید از طبیب	صحتِ آن حس بجوئید از حبیب
صحتِ این حسّ ز معموری تن	صحتِ آن حس ز تخریبِ بدن

ایک اور موقع پر حضرت دانشمند لکھتے ہیں: "حضرت ایشان ترکِ حبِ دُنیا کردہ بودند۔ و یک مریدے را از زبان مبارک خود بہ قسم یاد ظاہر نمود۔ کہ زر سرخ و سفید در دلِ من برابر سنگ است۔ (مقامات ۱۱۱)

لہ (پیغمبر عارف) لہ ریاضت وغیرہ

یعنی حضرت شیخ المشائخ دنیا کی محبت سے قطعی بیزار تھے۔ اور ایک مرید کے سامنے قسمیہ کہا، کہ سونا چاندی میری نظر میں پتھر کے برابر ہے۔ سچ ہے ؎

آنان کہ ہر دو کون بہ یک جو نمے خرند
ایشان دم از محبت دُنیا کجا زنند

غرض حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ ہر اس چیز سے بیزار اور متنفر تھے جو اللہ تعالیٰ سے ذرہ بھر بھی روکنے والی ہو۔"

اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب مزید لکھتے ہیں:۔

"وحضرت شیخ المشائخ شیخنا از زہاد عصر خود بود۔ و زہد سہ حرف است۔ یعنی "ز" - "ہ" - "د"، "ز"، اشارت بترک زینت است، و "ہ" اشارت بہ ترک ہوا۔ و "د" اشارت بہ ترک دُنیا۔ وحضرت ایشان موصوف بدین صفات بود"۔

وحضرت شیخ المشائخ شیخنا قدس سرہ را حق تعالیٰ توفیق عزلت دادہ بود۔ اگرچہ صحبت نیک بغایت خوب است۔ مرد چون بکمال رسد۔ نہ او صحبت کسے را گزیند۔ و نہ کسے را گزارد کہ صحبت او گزیند۔ نیز محققان گفتہ اند، عزلت سالک بہتر از صحبت خضر۔ وحضرت شیخنا ترک ہوائے نفس خود کردہ تا بمطمئنہ موصوف شدہ بود۔ وحضرت شیخنا ہمیشہ مستغرق در دمحبت بود و سرمست جرعہ الست بودہ۔ پس کسے کہ مستغرق در یاد محبوب است زندہ است۔ اگرچہ بمیرد۔ و آنکہ از یاد محبوب غافل و بے بہرہ است مردہ است۔ اگرچہ بہ ظاہر صورت زندگی دارد۔ وحضرت شیخنا مومن برحق بود و صفت مومن حقیقی داشت۔

(ترجمہ) اور ہمارے حضرت شیخ قدس سرہٗ اپنے زمانے کے زاہد تھے۔

انسان تھے۔ اور لفظ زہد تین حرفوں یعنی ز۔ ہ اور د سے بنا ہے۔ "ز" سے مراد ترک زینت "ہ" سے مراد ترک ہوا "د" سے مراد ترک دُنیا ہے۔

اور ہمارے حضرت شیخ ان تمام صفات سے متصف تھے۔ یعنی انہوں نے زیب و زینت، ہوا و ہوس اور دنیوی مال و دولت اور شان و شوکت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور ہمارے حضرت شیخ قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے عزلت کی توفیق بخشی تھی۔ اور اگرچہ نیک صحبت بہت اچھی ہوتی ہے لیکن جب انسان کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ (تب) نہ وہ کسی دوسرے کی صحبت اختیار کرتا ہے۔ اور نہ کبھی دوسرے کو اپنی صحبت میں آنے دیتا ہے۔ اور محققوں نے کہا ہے کہ "سالک کی عزلت خضر کی صحبت سے بہتر ہے"۔

اور ہمارے حضرت شیخ قدس سرہٗ ہمیشہ دردِ محبت میں مستغرق رہتے تھے۔ اور جُرعہ الست کے مدہوش تھے۔ پس جو شخص یادِ محبوب میں مستغرق رہتا ہے۔ وہ زندہ ہوتا ہے۔ خواہ (ظاہرًا) فوت بھی ہو جائے۔ اور جو کوئی محبوب کی یاد سے غافل اور بے بہرہ ہوتا ہے۔ وہ مردہ ہے خواہ ظاہری صورت میں وہ زندہ ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت جنید بغدادی قدس سرہ فرماتے ہیں۔ "جس کی زندگی نفس سے ہے۔ اسکی موت جان نکلنے سے ہوتی ہے۔ مگر جس کی زندگی خدا تعالیٰ سے ہے، وہ طبعی زندگی سے اصلی زندگی کی طرف انتقال کرتا ہے"۔

حضرت ابوالحسن خرقانی قدس سرہ فرماتے ہیں "عافیت تنہائی میں ہے۔ اور سلامتی خاموشی میں"۔

جود و سخا! حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں:

"جس نے نعمت پائی، سخاوت کی بدولت پائی"۔ نیز فرمایا "عارف کی علامت یہ ہے کہ وہ خاموش ہو اور اس کے چہرے پر غم کے آثار ہوں"۔ نیز فرمایا کہ محبت کی راہ میں عارف وہ ہے جس نے دونوں جہانوں سے قطع تعلق کر لیا ہو۔ اور اس کا دل بجز یادِ مولا کسی میں نہ لگے۔ اس بارے میں کسی نے یہ کیا اچھا شعر کہا ہے ؎

از بہرِ وصال تو ز ہر چیز گذشتم
خواہی نہ اگر وصل از آں نیز گذشتم

حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: "جس کسی کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست بناتا ہے اس کو اپنی تین خصلتیں عطا کر دیتا ہے۔ یعنی دریا جیسی سخاوت، زمین جیسی عاجزی اور آفتاب جیسی عوام پر شفقت"۔

صوفیائے عظام کے مندرجہ بالا اقوالِ زرین کی روشنی میں حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی سخاوت و فیاضی کے بارے میں یہاں کچھ نذرِ قارئین کیا جاتا ہے:۔

صاحب مجمع البرکات حضرت جمیل بیگ صاحب شیخ عبدالحلیم صاحب اور میاں شمس الدین صاحب کے حوالوں سے لکھتے ہیں کہ "حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ نے اپنے والد ماجد حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے بعد ان کا تمام ترکہ راہ حق میں خیرات و تصدق کیا۔ اور ایک ہی بار ان اموال و املاک سے اپنے آپ کو فارغ کر دیا۔ (بہ یکبارگی نفسِ خود را فارغ کرد ص۲۱۷) یہ بات مقامات میں بھی لکھی ہوئی ہے۔

آپ کے جود و سخا کے بارے میں حضرت جمیل بیگ قدس سرہٗ لکھتے

ہیں۔ آپ اپنے زمانے میں حسن بصریؒ ثانی تھے۔ آپ سخاوت کے ناپیدا کنار سمندر تھے۔ خود نہ کھاتے مگر دوسروں کو کھلاتے۔ آپ عام وخاص کے مقبول تھے۔ حق تعالیٰ نے دونوں جہانوں کو آپ پر نثار کر دیا تھا۔ آپ زندگی بھر مالک نصاب نہ ہوئے۔ آپ نے اس مردار دنیا کی آلائشوں سے اپنے آپ کو پاک وصاف رکھا۔ آپ فقیروں محتاجوں یتیموں اور بیواؤں اور قرضداروں کو بہت کچھ دیا کرتے تھے۔ غریبوں اور قیدیوں کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ اور ان کو کپڑے دیا کرتے تھے۔ نقد امداد بھی ان کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ان کو کھانا کھلاتے تھے۔ آپ بہت زیادہ مقدار میں چاول پکانے کا حکم دیتے۔ بڑی بڑی چٹائیاں بچھا کر ان پر چاول ڈھیر کر لیا جاتا۔ اس میں شکر بھی ملا دیتے اور غریب اور محتاج بلا روک ٹوک اُسے کھا لیتے۔"

کھانے اور پکانے کے برتن مٹی کے ہوتے تھے۔ آہنی اور تانبے کے برتنوں کے استعمال سے احتراز کرتے۔ اور ہم کو بھی ارشاد فرمایا کرتے، کہ لوہے اور تانبے کے برتنوں اور دیگوں کے استعمال سے احتراز کرو۔ آپ خدا کی محبت کی خاطر فقیروں اور مسکینوں کے ساتھ نہایت شفقت اور فیاضانہ برتاؤ کرتے رہتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہ اپنے والد حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے جود وسخا کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

(ترجمہ) "حضرت شیخ المشائخ ہمارے شیخ کو بلند ہمتی سے وافر حصہ ملا تھا۔ اور عالی ہمتی کا ہما اُن کے سر پر بیٹھا تھا۔ آپ عالی ہمتوں سے سبقت لے گئے تھے۔ اور اپنے ہم عصروں میں عالی ہمتی کا تاج آپ

ہی کے سر پر رکھا گیا تھا اور سخاوت کے میدان میں تمام شہسواروں سے بازی جیت چکے تھے، اور اس میدان میں آپ سب سے آگے تھے۔ اور اپنے زمانے میں یکتا تھے۔"

"اور ہمارے حضرت شیخ جو عمل اور طاعت بھی کرتے تھے۔ وہ درد محبت کی وجہ سے کرتے تھے۔ اور گویا بعض امور میں، ان کو الہام ہوتا تھا۔ یا مردانِ خدا کی جانب سے ان کو حکم مل جاتا تھا تب اس پر عمل کرتے۔ اور اُسے معمول بناتے۔ چنانچہ ایک وقت میں آپ پر حد درجہ جذبہ شوق و محبت غالب ہوا تھا۔ آپ نے تمام علاقہ خٹک میں حکم بھیجا، کہ ہر ایک گھر کے حساب سے مجھے ایک ایک گائے دے دیں۔ تاکہ میں اسے خدا کی خاطر ذبح کر کے تصدق کروں، بعد میں، آپ کو منہ مانگی قیمت دی جائے گی۔ اور حضرت شیخ صاحب کے حکم سے کوئی بھی سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اتنی گائیں جمع ہو گئیں، کہ ہر روز کم و بیش بیس تیس بلکہ چالیس تک۔ اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ گائیں ذبح کی جاتی تھیں۔ اور یہ سلسلہ کم و بیش سال بھر تک جاری رہا۔

اس سلسلے میں شیخ دانشمند صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ان دنوں وہاں ایک عالم تھا۔ وہ ہر روز جو اتنی گائیاں کو ذبح ہوتے دیکھتا تو اس کے دل میں خیال گذرا کہ یہ تو بڑا ظلم ہے، جو حضرت شیخ صاحب کر رہے ہیں۔ وہ عالم کہتا ہے کہ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں حضرت شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اور حضرت شیخ صاحب ایک مجلس میں تشریف رکھتے ہیں جس میں آپ کے علاوہ آٹھ صاحبان اور بھی موجود ہیں۔ حضرت شیخ بابا صاحب نے مجھ سے پوچھا اے فلاں! ان صاحبوں کو جانتے ہو؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں

حضرت شیخ صاحب نے فرمایا۔ کہ ان میں سے ایک صاحب حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ اور یہ باقی بھی سب انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور میں جو خیرات و صدقات کرتا ہوں۔ میں انہی کے حکم سے کرتا ہوں۔ اپنے خیال اور مرضی کے مطابق کچھ نہیں کرتا۔ جب وہ عالم خواب سے بیدار ہوگیا۔ تو سمجھ گیا کہ حضرت کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ پس اپنے مال میں سے دو گائیں بطور ہدیہ حضرت کی خدمت میں پیش کیں۔ اور حضرت نے ان کو بھی ذبح کرنے کا حکم دیا۔"

پ ان دنوں کے ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک دن حضرت شیخ صاحب پر عشق الہی کے جذبات بہت غالب آچکے تھے۔ اس دن ساٹھ گائیں ذبح کی گئی تھیں، اور آپ فرط محبت سے گرم دیگ کی طرح جوش میں تھے۔ کہ اس اثنا میں شہباز خان امیر خٹک (خوشحال خان کے والد) بھی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور قدم بوسی سے مشرف ہوئے۔ جب شہباز خان نے حضرت کو جوش محبت اور غلبہ جذبات میں دیکھا۔ تو وہ خود بھی بہت متاثر ہوئے تو اپنی سواری کا عراقی گھوڑا جسے ایک ہزار روپے میں خریدا تھا (جو کہ آجکل کے بیس پچیس ہزار بنتے ہیں) حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت شیخ صاحب نے اُسے بھی ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں بعض علماء نے جو مجلس میں حاضر تھے، عرض کیا کہ یا حضرت! اس گھوڑے کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔ اگر اسے بیچا جائے۔ تو اس کی قیمت سے بہت سی گائیں خریدی جاسکتی ہیں۔ اور یہ فقیروں کے لئے زیادہ فائدہ مند بات ہوگی۔ لیکن حضرت شیخ صاحب نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے

مجھے تجارت اور خرید و فروخت کے لئے پیدا نہیں کیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے، کہ گھوڑا بیچنے سے کہیں سوداگر اور تاجر نہ سمجھا جاؤں، لہذا اسے ذبح کیا جائے۔ چنانچہ خان شہباز خان نے خود اپنے ہاتھوں اسے ذبح کیا اور اُس کا گوشت جنگلی جانوروں کے لئے جنگل میں ڈال دیا گیا۔

ساٹھ ذبح شدہ گایوں کا گوشت کچھ پختہ اور کچھ کچا پڑا تھا۔ اسی اثنا میں ایک شخص کے ہاتھ سے گوشت کی ایک ہانڈی ٹوٹ گئی۔ شہباز خان نے اس شخص کو جھڑکا۔ اس پر حضرت شیخ صاحب نے اس شخص کی دلجوئی کی خاطر حکم دیا۔ کہ اچھا سب ہانڈیوں کو توڑ ڈالو۔ پس آپ کے حکم کی دیر تھی، کہ حاضرین ہانڈیوں کے توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ اور تمام پختہ اور خام گوشت لوگ لُوٹ کر لے گئے۔ اور میدان صاف ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ حضرت شیخ صاحب نے ایسا حکم کیوں دیا ؎

کارِ پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شِیر

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں۔

"آپ کے لنگر خانے میں کھانے والوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا۔ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اکثر اوقات دنبوں اور گایوں کی چربی ہانڈیوں میں جمع کر لی جاتی اور جب پچاس ساٹھ ہانڈیاں چربی سے بھر جاتیں۔ تو آپ فقراء و مساکین کو طلب کر کے اُن کو وہ چربی دے دیتے۔ کبھی کبھی علاقے کے عوام اور غلاموں کو بلا کر ان کو گھی اور چربی سے سیر کراتے۔ آپ کی زیادہ تر شفقت غریبوں، مسکینوں اور فقیروں پر ہوا کرتی تھی۔ جتنا زیادہ غریب اور بدحال ہوتا، اتنا ہی حضرت

ناتواں کے حال پر زیادہ شفقت فرماتے۔ آپ عموماً ہر وقت خیرات وصدقات
کیا کرتے تھے۔ لیکن قحط کے دنوں میں زیادہ صدقات وخیرات اور
داد و دہش میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ چونکہ علاقہ خٹک اِس
بیسویں صدی میں بھی نہایت پس ماندہ اور غلے میں خود کفیل نہیں
ہے، تو آج سے چار سو سال پہلے تو یہ علاقہ اور بھی پس ماندہ ہوگا۔
یہاں زرعی زمین بہت کم ہے۔ اس لئے جس سال بارش نہ ہوتی
تو غلے کی بہت قلت پیدا ہوجاتی۔ اور تمام علاقے میں قحط جیسی کیفیت
چھا جاتی۔ ایسے موقعوں پر حضرت رحمکارؒ زیادہ اہتمام وکثرت سے
خیرات و صدقات کیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ نے ایک ہزار روپے کے چاول
خرید کر اُسے رات کو پکانے کا حکم دیا۔ اور آپ نوافل پڑھنے میں
مشغول ہوئے۔ جب صبح صادق ہوئی تو اُن چاولوں میں سے بہت
تھوڑے بچ گئے تھے۔ اکثر لوگ پختہ اور خام چاول لے گئے تھے۔ اِس
صورت حال کو دیکھکر ایک شخص نے عرض کیا۔ یا حضرت! وہ سب
چاول تو لوگ لُوٹ کرلے گئے۔ اور بہت تھوڑے چاول رہ گئے ہیں۔
آپ نے فرمایا: میرا مطلب بھی یہی تھا۔ اس لئے رات کو پکانے کا حکم دیا۔
حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں، کہ ان خیرات و صدقات
کے لئے ہمارے حضرت شیخ اکثر اس قدر قرض رقومات لیا کرتے تھے،
کہ عقل کی رد سے اسکی ادائیگی ناممکن معلوم ہوتی۔ مگر اللہ تعالیٰ
اپنے فضل وکرم سے تھوڑے دنوں میں ادائیگی کا انتظام کردیتا تھا۔
اور حضرت پھر اسی طرح قرض لیا کرتے اور خیرات کیا کرتے۔ اور تادم وفات

حضرت کا یہی معمول رہا۔ کہ قرض لیکر تصدق کرتے۔ اور اکثر اوقات قرض کی رقومات اتنی زیادہ ہو جاتیں کہ ادائیگی ناممکن معلوم ہوتی۔ مگر جس کا بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے، اللہ ہی اس کے لئے کافی ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک بار ایسا اتفاق ہوا۔ کہ آپ نے علاقے کے امراء و خوانین سے ہزاروں روپے قرض لئے۔ اور خیرات کئے۔ یہ حالت دیکھکر آپ کی والدہ ماجدہ کو اندیشہ ہُوا۔ اور اس اندیشے میں آپ کے بعض خاص مرید بھی شامل تھے۔ چنانچہ آپ کی خدمت میں اُس وقت کے چند فاضلوں کے ذریعے یہ بات عرض کی گئی۔ کہ خوانین و امراء سے آپ کے لئے قرض لینا اچھا نہیں ہے۔ مبادا اس قرض کی عدم ادائیگی کے باعث آپ کے اہل وعیال کو نقصان پہنچائیں۔ لیکن حضرت کی طبیعت اس بات سے منغص ہوئی اور ان فاضلوں سے فرمایا:۔ صاحبو! آپ بے فکر رہیں، میرے لئے میرا خدا کافی ہے۔ اسے ہر بات کا علم ہے۔ اور وہی بہتر جاننے والا ہے۔ ان میں سے ایک فاضل نے عرض کیا۔ یا حضرت شیخ! اس جرأت کیلئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ اِس کے لئے ہم آپ کی والدہ ماجدہ کی اصرار پر آمادہ ہوگئے تھے۔ اِس میں ہماری اپنی مرضی شامل نہیں۔ ورنہ حقیقت تو یہی ہے جو آپ فرما رہے ہیں۔

غرض آپ اسی طرح قرض لیتے رہتے تھے۔ اور پھر سب کو پائی پائی ادا کیا جاتا تھا۔ کسی کو ظاہری سبب کی اطلاع نہیں ہوتی تھی۔ کہ حضرت یہ کہاں سے ادا کر رہے ہیں۔ مگر عوام و خواص سب کا مشاہدہ اور تجربہ یہ تھا، کہ کسی قرض خواہ کا ایک حبہ بھی باقی نہ رہنے دیتے۔ ہزاروں کی رقمیں اسی طرح ادا کی جاتی تھیں۔

صاحب مجموع البرکات لکھتے ہیں کہ صاحب بار بار بر زبان مبارک فرمودہ :۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تا يفقهون ۝

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں :۔ قرضوں کی اس قدر زیادتی سے ہمیں پریشانی رہتی تھی۔ کیونکہ حقیقتِ حال کا تو ہمیں علم نہ تھا۔ اس لئے اپنی ظاہر تنگدستی کو دیکھتے ہوئے ہمیں فکر دامنگیر رہتی تھی۔ کہ آخر حضرت شیخ صاحبؒ ان قرضوں کی ادائیگی کیسے کریں گے۔ کیونکہ کبھی کبھی آپ غریبوں اور محتاجوں پر اس قدر بے دریغ رقومات صرف کرتے تھے کہ ہماری محدود عقلوں میں اسکی ادائیگی کی کوئی صورت معلوم نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک دن حضرت شیخ جی صاحب نے میری اس قلبی پریشانی کو دیکھکر فرمایا: بیٹا! عبدالحلیم! میں قضائے حاجت کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ استنجا کیلئے کوئی ڈھیلا لے آؤ۔ چنانچہ میں ڈھیلا اٹھانے کے لئے جھکا، تو دیکھا کہ ہمارے چاروں طرف سونا ہی سونا ہے۔ اور ساری زمین سونے سے بھری ہوئی ہے۔ میں حیران و ششدر ہو کر کھڑا ہی کھڑا رہ گیا۔ آپ نے فرمایا، ڈھیلا کیوں نہیں لاتے؟ میں نے عرض کیا۔ یا حضرت! یہاں تو سونا ہی سونا ہے۔ اور سونے کے ساتھ استنجا جائز نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ پھر تمہیں یہ تردد کیوں ہے۔ کہ لوگوں کے یہ قرضے کیسے ادا کئے جائیں گے۔ اور پھر فرمایا، اے بیٹے اس بات سے پریشان نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اس کی روزی فراخ ہوتی ہے۔

آپ کے لنگر خانے میں عموماً موسم گرما میں صبح کے وقت مہمانوں کو چاول کھلایا جاتا۔ اور شام کو روٹی گوشت۔ اور موسم سرما میں صبح کے وقت روٹی گوشت اور شام کو چاول پکایا جاتا تھا۔ مہمانوں کو ان کے مزاج اور خواہش کے مطابق کھانا بنیا حتیٰ کہ میوے بھی مہیا کئے جاتے تھے۔ آپ ہر حاجت مند کی حاجت پوری کیا کرتے تھے۔ اور کسی سائل کا سوال رد نہ کرتے اول سے آخر تک آپ نے کسی سائل کو اپنے در سے خالی ہاتھ جانے نہ دیا۔ آپ کے لنگر خانے میں کھانے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔ خصوصاً قحط اور تنگی کے ایام میں یہ تعداد بہت زیادہ ہوتی۔

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کی جود و سخا کا یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ اور حضرت شیخ جی صاحبؒ کی خانقاہ کے لنگر خانے میں آج تک مہمانوں کو قیام و طعام کی سہولتیں حاصل ہیں۔ خواہ یہ تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اور نہ صرف حضرت رحمکارؒ کے خانقاہ میں بلکہ آپ کے والد مکرم حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحبؒ اور اُن کے والد ماجد حضرت مست بابا قدس سرہٗ اور ان کے والد گرامی قدر حضرت غالب بابا قدس سرہ کے مزارات پر بھی روزانہ سینکڑوں زائرین کو قیام و طعام کی بہترین سہولتیں حاصل ہیں۔ اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو برصغیر پاک و ہند میں اولیائے عظام کے اس سلسلے کے ساتھ مخصوص ہے۔

غلاموں کو آزاد کرنا

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں:۔ "ہمارے حضرت شیخ غلاموں پر خصوصی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ اور اُن کی بہت دلجوئی کیا کرتے۔ اور اُن کو آزاد کرانے میں بہت سعی اور کوشش فرماتے۔ اور پشتو نخوا کے جس علاقے سے بھی

کوئی غلام فریادی بنکر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ آپ اس کے مالک کو بلا کر اسے منہ مانگی قیمت دے کر غلام کو آزاد کرا دیتے۔ ویسے تو آپ ہر وقت غلاموں کو آزاد کرانے میں ساعی رہتے مگر تین سال تک خصوصیت کے ساتھ آپ نے ہزاروں غلاموں کو ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد کرالیا تھا۔ آپ کے خادم خاص شیخ ملی قدس سرہٗ سے منقول ہے کہ:۔

"اس عرصے میں آپ نے تین ہزار غلاموں کو اپنے اپنے مالکوں سے خرید کر اُن کو آزاد کرلیا۔ نیز اُن کو کمال تک بھی پہنچا دیا۔ حضرت شیخ ملیؒ انہی دنوں کے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ ایک غلام آپ کی خدمت میں فریادی ہو کر حاضر ہوا۔ آپ نے اُسکے مالک کو بلایا۔ اور کہا منہ مانگی قیمت مانگو میں دوں گا۔ یہ غلام مجھے دے دو۔ مگر مالک راضی نہیں ہوتا تھا۔ حضرت شیخ نے بار بار اصرار کیا۔ جب وہ شخص مجبور ہوا، تو کہنے لگا۔ اگر حضرت واقعی خدا کی خاطر اس غلام کو آزاد کرانا چاہتے ہیں، تو مجھے دو سو اسی روپے کابلی سکے میں ادا کریں۔ اس سے کم قیمت ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ حضرت شیخ صاحبؒ نے جب دیکھا، کہ یہ شخص اپنی ضد پر قائم ہے۔ تو اپنے گھر چلے گئے۔ اور دو سو اناسی روپے کابلی سکے میں لے آئے۔ اور اُسکے مالک کو دیدئیے۔ اور پھر شیخ ملیؒ سے فرمایا۔ کہ یہ ایک روپیہ بھی گاؤں میں جا کر کہیں سے پیدا کر دو۔ شیخ ملیؒ صاحب تمام گاؤں میں پھرا، لیکن کسی کے پاس بھی کابلی سکہ نہیں ملا۔ اب یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ ایک روپیہ بھی شیخ ملی نے کہیں سے پیدا کیا، یا وہ حضرت شیخ اپنے گھر سے لے آئے۔ بہر حال اس شخص کا مطالبہ پورا کر کے اس غلام کو آزاد کرالیا۔ اور یہ واقعہ حضرت شیخ کی ایک کرامت ہے کیونکہ

حضرت شیخ صاحبؒ کے پاس رقم بالکل نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کارساز حقیقی ہے۔ اور تمام زمینوں اور آسمانوں کے خزانے اُس کی ملکیت ہیں۔

عبدیّت حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ حق تعالیٰ کے شیدائی اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کامل متبع تھے۔ اور ان پر شان عبدیت کا نہایت غلبہ تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں:۔

"روزے از حضرت شیخنا التماس نمودم، وعرض کردم کہ یا حضرت شیخ! پیر شما کیست؟ در جواب گفت درد تو نہ خواہم دید۔ داین لفظ از خواص حضرت ایشان بود کہ از روئے مہربانی بابسیار مردم مے گفتندے:۔ ہر کہ شیخی بہ شیخان و پیری بہ پیران و سلوک بہ سالکان وتصوف بہ صوفیان بخشیدم۔ ومن برآنم کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آن زنجیر بندگی از گردن من بدر نہ گرداند۔ ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
مے برد آنجا کہ خاطر خواہِ اوست

پس این مقام عبودیت است، وعبودیت را درجہائے بسیار است ؎

با دو قبلہ در رہ توحید نتوان رفت راست
یا رضائے دوست باید یا رضائے خویشتن

(ترجمہ) ایک دن میں نے اپنے پیر و مرشد قبلہ گاہ صاحب سے التماس کیا۔ کہ یا حضرت! آپ کا پیر کون ہے؟ اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا۔ اسے میرے بیٹے خدا تمہارا درد مجھے نہ دکھائے۔ اور یہ جملہ حضرت کے خصوصی الفاظ میں سے تھا جو از روئے مہربانی اکثر لوگوں

فرمایا کرتے تھے۔ کہ میں نے مشیخیت شیخوں کو، پیری پیروں کو، سلوک سالکوں کو اور تصوف صوفیوں کو بخش دیا ہے۔ اور میرا مسلک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غلامی کی جو زنجیر میری گردن میں ڈال رکھی ہے یہ زنجیر اللہ تعالیٰ میری گردن سے نہ نکالے، میری گردن میں تو دوست نے زنجیر ڈال رکھی ہے۔ جہاں اس کا جی چاہتا ہے۔ وہاں لے جاتا ہے۔ پس یہی مقام عبودیت ہے۔ اور عبودیت کے بہت سے درجے ہیں۔ دو قبلوں کے اختیار کرنے سے توحید کے راستے پر سیدھا چلنا ناممکن ہے۔ (اس لئے) یا تو دوست کی مرضی پر چل اور یا اپنی مرضی پر۔

ایک اور موقع پر حضرت شیخ دانشمند عبدالحلیم صاحب، حضرت رحمکار قدس سرہٗ کے عبودیت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت شیخ المشائخ شیخنا را طے مقام عبودیت حاصل شدہ و یقین کامل و صدق دل اورا روئے دادہ و راہِ حقیقت براو کشادہ و شہباز اوج عشق و محبت بود" (مقامات قلمی ص۱۲۵)۔

اسی طرح ایک اور مقام پر لکھتے ہیں۔ "حضرت شیخ المشائخ شیخنا قدس سرہ شہسوارِ میدانِ عبودیت بودہ و حضرت ایشان را مقام عبودیت مے بود و مے دانست۔ و یقین کامل و صدق دل تمام می داشت و نصیب او بود۔"

یعنی میرے پیر و مرشد حضرت قبلہ گاہ صاحب کو مقام عبودیت حاصل تھا۔ اور ان کو صدق دل اور یقین کامل حاصل ہوا تھا۔ اور کہ میرے پیر و مرشد مقام عبودیت اور صداقت یقین کے میدان میں اپنے ہم عصروں میں سب سے بڑے شہسوار تھے۔ (م ص۱۶۱)

اسی طرح آپ کے ایک اور مخلص مرید اور خلیفہ خاص حضرت دریاخان صاحب قدس سرہٗ سے منقول ہے:-

"روزے بحضرت الیشان التماس نمودم کہ یا حضرت شیخ! قدس سرہٗ پیر شما کیست؟ در جواب گفت، بشنو، کہ حق تعالیٰ را ایک بندہ بود، بر آن بندہ ہاتف آواز داد کہ بادشاہیٔ روئے زمین قبول می کنی یا بندگیٔ من؟ آن بندہ عرض کرد کہ الٰہی! من بندگی تو قبول می کنم واز بادشاہیٔ روئے زمین اعراض می ورزم ونمی خواہم۔ پس ازین معلوم شد کہ حضرت شیخ المشائخ شیخنا از بادشاہیٔ روئے زمین اعراض کرد و بر بندگی حق گردن نہادگی کرد، وپیش دستی کرد" (ونعم ماقیل) ؎

زندگی آمد برائے بندگی ؛ زندگی بے بندگی شرمندگی

(ترجمہ) حضرت شیخ رحمکارؒ قدس سرہٗ کے ایک مرید وخلیفہ خاص شیخ دریاخان صاحب فرماتے ہیں، کہ ایک دن میں نے اپنے پیر ومرشد سے التماس کیا کہ یا حضرت! آپ کا پیر کون ہے؟ جواب میں فرمایا سنو، اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ تھا۔ ہاتف غیبی نے اس سے کہا، کہ روئے زمین کی بادشاہی منظور ہے یا اللہ کی بندگی؟ اس پر بندہ نے عرض کیا، کہ الٰہی! میں تیری بندگی قبول کرتا ہوں اور روئے زمین کی بادشاہی سے انکار کرتا ہوں اور نہیں چاہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے شیخ پیر ومرشد نے اللہ کی بندگی قبول فرمائی تھی اور روئے زمین کی بادشاہی سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ زندگی کا مقصد ہی اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ اور اطاعت وبندگی کے بغیر زندگی تو

شرمندگی ہے۔

حضرت شیخ عبد الحلیم صاحب فرماتے ہیں کہ "وہ بندہ جس نے بادشاہی لینے سے انکار کیا، اور اللہ کی بندگی اختیار کی روایت سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون تھا، مگر وہی بندہ شیخ رحمکار صاحبؒ ہی تھے، جس نے بادشاہی کے بدلے اللہ کی بندگی قبول فرمائی تھی"۔ اس مضمون کو عارف شیرازی نے بڑی خوبی کے ساتھ ایک شعر میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

مرا گدائے تو بودن ز سلطنت بہتر

کہ ذلِ جور و جفائے تو عزّ و جاہ من است

ان شہادتوں کو دیکھا جائے، تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ حقیقی معنوں میں جامع الکمالات تھے۔ اگرچہ آپ نے خود کو جذبہ عشق و عبدیت میں کچھ نہ سمجھا تھا، لیکن در حقیقت یہ تمام صفات و کمالات آپ کی ذات میں موجود تھے۔ بلکہ اُس زمانے میں اطراف و جوانب میں جس کسی کو بھی ان کمالات و فضائل میں سے جو کچھ بھی ملا ہے، وہ آپ کی توجہ اور فیض صحبت سے ہی ملا ہے۔ مولانا رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

گر تو سنگ خارا و مرمر شوی

چون بہ صاحبدل رسی گوہر شوی

اور یہ صرف دعویٰ نہیں بلکہ ایک روشن حقیقت ہے کیونکہ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب ؛ گر دلیلت باید از وے رو متاب

جس کا جی چاہے آزما کر دیکھ لے۔ البتہ خلوص و نیازمندی شرطِ اول ہے۔

بہتر ہوگا کہ عبدیت کی کچھ تشریح کی جائے۔ تاکہ قارئین کرام اس آئینے میں حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز کی زندگی کی پوری تصویر دیکھ سکیں۔

اور یہ اندازہ لگائیں، کہ اس بلند وارفع مقام تک پہنچنے میں آپ کو کتنی پابندیوں اور شدید تکالیف سے گذرنا پڑا ہوگا۔

عبدیت کی تفسیر وتشریح عبدیت اور عبودیت کی ان شرعی اصطلاحات کی تشریح حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنی کتاب "التکشف عن مہمات التصوف" میں اور دوسرے مواعظ میں اس طرح کی ہے:۔

"شریعت کی اصطلاح میں عشقی اور طبعی حال یا ایمان وعمل کے کمال کا نام عبدیت یا غلامی ہے۔ یعنی خدا اور رسول کی ہر بات کو بلا چون وچرا ماننا اور کرنا۔ اور اسکی رضا اور خوشی میں اپنی رضا اور خوشی دیکھنا۔ شریعت مطہرہ کے احکام واطمر کے ساتھ ہمارا طرز و انداز وطریق کار بالکل ایسا ہونا چاہیئے، جو ایک عاشق کا معشوق کے ساتھ اور مملوک یا غلام کا اپنے مالک کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسی نے ایک غلام خریدا۔ پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا جو آپ مقرر کریں پھر پوچھا تو کیا کھاتا ہے؟ جواب دیا جو آپ کھلائیں گے۔ اسی طرح لباس کے بارے میں پوچھا تو کہا جو آپ پہنائیں گے۔ غرض غلامی کی حقیقت یہ ہے، کہ مالک ومولیٰ کی مرضی اور حکم کے سامنے اپنی مرضی اور حکم کو فنا کر دیا جائے۔

جب مجازی غلامی کا اقتضا یہ ہے تو کیا خدا کے ساتھ ہمارا جو علاقہ ہے۔ وہ غلامی نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو خدا کے ساتھ تو ہمیں حقیقی غلامی کا تعلق ہے۔ انسانی غلامی سے تو انسان آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ برخلاف خدا کی غلامی کے، کہ اس کا طوق ہماری گردن سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی صورت تو یہی ہے کہ نعوذ باللہ ہم عبد نہ رہیں اور خدا خدا نہ رہے۔"

انسان کی پیدائش کا مقصد ہی عبادت ہے۔ (اور ہم نے انسان وجنات

کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ خدا کی بندگی کریں۔ القرآن)۔ پس ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو جس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے۔ وہ یہی عبدیت ہے۔ اوامر و نواہی کا زیادہ تر تعلق اعمال و افعال سے ہے، خواہ وہ اصطلاحی عبادات ہوں، یا معاملات و معاشرت یا اخلاق سب کو پورا کرنا ہی عبدیت یا بندگی ہے۔ اسی طرح عبد کی حیثیت سے ہم کو اوامر و نواہی کے مصالح معلوم کرنے کا بھی نہ حق ہے اور نہ اس کی فکر کرنی چاہیئے۔ بس ہم کو جو حکم ہو بے چون و چرا مان لینا چاہیئے۔ اور اسکو عین مصلحت و حکمت جاننا چاہیئے۔ بلکہ بالفرض اگر خلاف مصلحت بھی ہو، تب بھی ہم کو دم مارنے کی گنجائش نہیں، کیونکہ ہم عبد و غلام ہیں۔ بلکہ اس نیت کی بھی مجال نہیں۔ کہ یہ ہمارے لئے مصلحت ہے۔ ہماری حیثیت ہی کیا ہے۔ کہ ہم دخل دیں ؂

بہ دُرد و صاف ترا کار نیست دم درکش
کہ ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است

حضرت حکیم الامت نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ وحدت الوجود سے بھی اصل میں عبدیت ہی کا حال و کمال مطلوب ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے مرضیات کے سامنے نہ صرف نفس کی خواہشات فنا ہو جائیں بلکہ اس حال کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ حق کے مقابلے میں اپنا یا خلق کا وجود سرے سے نظر ہی نہ آئے۔ حضرت حکیم الامت نے "التکشف" میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

"یہی وہ کیفیت ہے، جسکو اہل فن نے وحدت الوجود کہا ہے۔ یہ معنے نہیں جو عوام میں مشہور ہیں۔ کہ میں بھی خدا تو بھی خدا اور در و دیوار بھی خدا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اور بعض جو یہ سمجھتے ہیں، کہ خدا کے سوا بالکل نیست

موجود ہی نہیں۔ یہ بھی غلط ہے، اور قرآن و سنت کے خلاف ہے۔
ارشاد خداوندی ہے: اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ۝
درحقیقت یہ مسئلہ حالی ہے قالی نہیں۔ وہ حال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات مدنظر ہوتی ہے تو دوسروں کا اور دنیا کا وجود کالعدم معلوم ہوتا ہے۔ بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی خیال میں منہمک ہو۔ تو اسکو دوسری چیزوں کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا۔ اگر کوئی آواز دیتا ہے، تو سنتا ہی نہیں۔ بلکہ بعض اوقات انہماک کی کیفیت یہ ہوتی ہے، کہ کوئی پاس آکر کھڑا بھی ہوجائے، تو اسے مطلق خبر نہیں ہوتی۔

عبدیت یعنی قرب: غرض تصوف کی اصطلاح میں وہی وحدۃ الوجود ہے۔ وہی وحدۃ الشہود ہے۔ وہی فنا ہے وہی قرب ہے۔ وہی وصال ہے۔ جو شریعت کی اصطلاح میں عبدیت یا بندگی ہے۔ جسے مشہور احادیث کے اتباع میں قرب نوافل اور قرب فرائض کے عنوانات سے صوفیائے کرام نے تعبیر فرمایا ہے۔ جس کی تفصیل حضرت حکیم الامت کے ارشاد کے مطابق یہ ہے: "جب بندہ ریاضت و مجاہدہ کرتا ہے۔ تو اس کے صفات اور شہوت وغضب کے دواعی اور محرکات زائل ہوجاتے ہیں۔ اور نفس میں مرضیات سے محبت اور نامرضیات سے بغض کا ایک راسخ ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جس سے اعمال حسنہ اور اعمال محمودہ بے تکلف صادر ہونے، اور اعمال قبیحہ اور افعال ذمیمہ قریب قریب معدوم ہوجاتے ہیں۔ ایسے شخص کی نسبت حدیث میں آیا ہے: "میں (اللہ) اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں۔ جس سے وہ سنتا، دیکھتا، پکڑتا اور چلتا ہے۔"

جب وہ مرضی حق کے خلاف نہ کان سے سنتا ہے، نہ آنکھ سے دیکھتا ہے

کے خلاف ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے۔ بلکہ جو کچھ بھی دیکھتا، سنتا یا کرتا ہے بالکل حق تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے تابع رہ کر کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کے یہ کان آنکھ ہاتھ اور پاؤں اس کے اپنے کہاں ہوئے، عملاً خدا ہی کے ہوئے۔ ورنہ ظاہری معنیٰ شرعاً اور عقلاً محال ہے۔ مطلب یہ کہ چونکہ اس کے اعضا وجوارح سے ہمارے افعال اللہ ہی کی مرضی کے موافق سرزد ہوتے ہیں۔ اس لیے یوں فرمایا کہ گویا میں ہی اس کے اعضاء (کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں) بن جاتا ہوں۔ ع

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

حضرت حکیم الامت اس مسئلے میں مزید فرماتے ہیں:۔

چونکہ مجازاً اس حدیث میں حق تعالیٰ کو آلہ اور عبدؔ کو فاعل کہا گیا ہے اس لئے حضرات صوفیائے کرام نے اس کا اتباع کر کے یہ عنوان مقرر کیا ہے۔ کہ بندہ فاعل اور اللہ تعالیٰ آلہ بن جاتا ہے۔ اور چونکہ حدیث میں اس مرتبے کا حصول تکثیر نوافل پر وارد ہے۔ اور مجاہدہ اور ریاضت میں تکثیر نوافل لازم ہے، خواہ نماز ہو روزہ ہو یا کثرت مراقبات، یا تقلیل شہوات۔ اس لیے حضرات صوفیہ حدیث کی پیروی میں، اس مرتبہ کو قرب نوافل کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں صفات و افعال رذیلہ کا ازالہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے فنائے ذات سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایک دوسرا درجہ قرب فرائض کا ہے۔ جو قرب نوافل سے بھی اعلیٰ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ کہ عبد کی ہستی ایسی مضمحل ہو جائے کہ اپنی قدرت و ارادہ کو حق کی قدرت و ارادہ کے سامنے ذاتی طور پر کالعدم جاننے لگے۔ اور اعمال و افعال میں محض بمنزلہ آلہ حق کے ہو جائے۔ اور حق کی مستقل مؤثریت پیش نظر ہو جائے

چونکہ یہ اول سے اعلیٰ ہے، کیونکہ اول میں صرف فنائے رذائل تھا، فنائے اختیار نہ تھا۔ اس لئے اس سے اعلیٰ ہوا۔ اور حدیث میں تقرب بالفرائض کو تقرب بالنوافل سے اعلیٰ وافضل کہا گیا ہے۔ اور چونکہ تقرب بالفرائض میں سالک کو اپنی ذاتی صفات قدرت واختیار پر نظر نہیں ہوتی اس لئے اس کو فنائے ذات سے تعبیر کرتے ہیں۔ (التکشف ص۴۵)۔

تفویض اس عبدیت کا ایک اور عنوان تفویض الی اللہ بھی ہے تفویض کا خلاصہ بھی وہی بندگی، غلامی یا عبدیت ہے کہ مالک کے سامنے ہماری ذات و صفات کچھ بھی ہمارا نہیں۔ بلکہ سب کچھ اسکی ملکیت ہیں۔ اور ہم نرے غلام ہیں۔ اور تفویض الی اللہ کے اس درجے میں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ تفویض کے یہ معنی نہیں کہ مانگے نہیں، بلکہ عزم رکھے کہ مانگنے پر بھی نہ ملا تو اس پر راضی رہونگا۔ ورنہ مانگنے کا امر نہ فرمایا ہوتا۔ اس لئے خوب مانگے اور اچھی طرح سے الحاح وزاری کے ساتھ مانگے۔ مانگنا ہرگز تفویض کے منافی نہیں۔ بعض لوگ دعا کو تو مقصود سمجھتے ہیں۔ لیکن جس حاجت کی دعا مانگتے ہیں۔ اس کو مقصود نہیں سمجھتے۔ یہ غلطی ہے۔ اور درحقیقت بڑی غلطی جس کو لوگ تفویض سمجھ بیٹھے ہیں، اسلئے کہ یہ استغنا ہے۔ حق تعالیٰ کے سامنے جو عبدیت کے سراسر خلاف ہے۔ خود حضورؐ کھانا کھانے کے بعد دعا میں یہ اضافہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ "ہم اس کھانے کو رخصت نہیں کرتے اور نہ اس سے مستغنی ہیں"۔

صدہا حدیثیں ہیں جن میں حاجتوں کا مانگنا ثابت ہے۔ تو ایسی چیز تفویض کے خلاف کیسی ہو سکتی ہے؟

پس معلوم ہوا کہ شریعت و طریقت دونوں کا کمال مقصود بندگی

وعبدیت ہے۔ جس کو قرب و رضا بھی کہا گیا ہے۔ اور تفویض بھی۔ یعنی مرضیات نفس کو مرضیات حق میں فنا کر دینا اور اپنے اختیار کو بالکلیہ حق تعالیٰ کے احکام کے تابع کر دینا۔ عشق و محبت، قرب و حقیقت، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، سب ہی دراصل (ایک ہی) حقیقت یعنی عبدیت (جو خالص کتاب و سنت کا نچوڑ ہے) کی تعبیر و تفہیم کے مختلف عنوانات و اسالیب یا فنی اصطلاحات ہیں اور تقریب فہم کے لئے نئی نئی تعبیرات، عنوانات یا اصطلاحات دینی و دنیاوی کسی علم و فن میں مناسب وقت و موافق حاجت اختیار نہیں کر لی جاتی ہیں؟ ورنہ بڑا منشا و مدعا ان سب عنوانات و اصطلاحات کا عبد و رب کے اس منصوص تعلق عبادت و عبودیت پابندگی و سرافگندگی کو واضح کرنا اور عملی زندگی میں اس کو پیوست کرنا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ سے ہمارا وہی تعلق پیدا ہو جائے۔ جو کسی ہمہ وقت بے عذر غلام کو اپنے مالک سے ہوتا ہے۔ اور اسکی زندگی میں وہ احسانی رنگ پیدا ہو جائے جو کسی غلام کو اپنے مالک کی عین حضوری میں حاصل ہوتا ہے، کہ اس کے چھوٹے بڑے احکام سے سرمو تجاوز نہیں کرتا۔ اور یہی عمل اطاعت کا کمال ہے۔

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں۔ مجھ سے ایک بہت بڑے ندوی فاضل نے نصیحت کی درخواست کی۔ میں نے دل میں کہا کہ ایک ایسے فاضل شخص کو میں کیا نصیحت کر سکتا ہوں، کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ مضمون ڈال دیا۔ میں نے اُن سے کہا، میں نے اپنی تمام عمر میں ساری طریق کا جو حاصل سمجھا ہے، وہ عرض کئے دیتا ہوں۔ وہ حاصل جو میں سمجھا ہوں فنائے عبدیت ہے۔ پس جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو مٹایا جائے۔ بس اس کے لئے یہ سارے ریاضات و مجاہدات کئے جاتے ہیں۔ پس اپنی ساری عمر فنائے عبدیت کی تحصیل میں گذار دینی چاہیے۔

(اشرف السوانح حصہ دوم ۲۰۶)

اور حقیقت یہی ہے کہ سارے بزرگ اور اولیاء اللہ اسکی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں۔ خصوصاً حضرات چشتیہ کے ہاں تو بس یہی ہے۔ کہ ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن
پروانہ زمن، شمع زمن گل زمن آموخت

حضرت ابوالحسن ہجویری (داتا گنج بخش) قدس سرہٗ کے نزدیک فنا سے مراد شہوات و لذات کو ترک کر کے خصائص بشریت سے اس طرح علیحدہ ہو جانا ہے کہ پھر محبت و عداوت، قرب و بعد، وصل و فراق اور صحو و سکر میں کوئی تمیز باقی نہ رہے۔ اور جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو یہی بقا ہے۔ اسکو مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ انسانیت کے تعلقات سے کنارہ کش ہونے کا نام فنا ہے۔ اور تلاش و عبودیت کا نام بقا ہے۔ یا علائق دنیوی سے علیحدہ ہونا فنا ہے۔ اور خدا کا جلال دیکھنا بقا ہے۔ اس غلبہ جلال سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ سالک دین و دنیا کو فراموش کر دیتا ہے۔ حال و مقام سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زبان حق تعالیٰ سے ناطق ہو جاتی ہے۔

غرض ان تفصیلات کے پڑھنے سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے، کہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی عملی زندگی کیسی ہوگی اور آپ کا رنگ کیسا عاشقانہ ہوگا ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ درین راہ فلان ابن فلان چیزے نیست

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ طبقہ اہلِ فکر میں سے تھے

حضرت شیخ دانشمند لکھتے ہیں کہ اسرارِ شریعت کے ماہرین لکھتے ہیں :-

"ذکر و فکر دو اہم بنیادی چیزیں ہیں۔ اور حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ جس طرح ذاکرین۔ ذکر قلبی میں ہمہ وقت مصروف رہا کرتے تھے اسی طرح آپ رحمۃ اللہ اہل فکر میں بھی داخل تھے۔ عشقِ الٰہی اور محبتِ خداوندی میں اس قدر استغراق اور تفکر میں ہوتے کہ گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی غم و اندوہ کی وجہ سے محزون و ملول ہیں"۔ (ملفوظات میں)

فارسی: "و حضرت ایشان دائماً مستغرق فکرے بودے۔ و تفکر بدرجہ از عبادت اولیٰ تر است۔ (ص۳۸)، و حضرت ایشان را خوف و اندوہ از دردِ عشق بحدے بود، کہ گوئی ماتم زدہ است" (ص۳۸) و چنین گویند پیرانے کہ سالک با درد در یک روز قطع می کند سالک بے درد در یک ماہ قطع می کند۔ پس در عہدے یک اندوہگین باشد کہ عالم در پناہ وجود او مے گذارند۔

(ترجمہ) "اور حضرت شیخ المشائخ ہمیشہ فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ اور تفکر عبادت سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور حضرت شیخ صاحب کو دردِ عشق میں اس قدر خوف و درد لاحق تھا کہ وہ ماتم زدہ معلوم ہوا کرتے تھے۔ بزرگ لکھتے ہیں: کہ ایک دردمند سالک جو راستہ ایک دن میں طے کرتا ہے، بے درد سالک اُسے ایک ماہ میں طے کرتا ہے۔ پس ہر زمانے میں ایک اندوہگین سالک ہوتا ہے۔ جس کی پناہ میں ایک دُنیا زندگی بسر کرتی ہے"۔ حضرت مولانا رومی قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت وناموس ما

اے تو افلاطون وجالینوس ما

جسم خاک ازعشق برافلاک شد

کوہ در رقص آمد وچالاک شد

عشق جان طور آمد عاشقا

طور مست وخرَّ مُوسیٰ صَعِقًا

حضرت شیخ دانشمند لکھتے ہیں: "وحضرت شیخ المشائخ شیخنا غواص بحر پردۂ کبریا بود و درین زمانہ قطب وحدت الٰہی بود وثانی بایزید بسطامیؒ"۔ (۵۸) یعنی حضرت شیخ قدس سرہٗ پردۂ کبریائی کے سمندر کے غواص (ماہر تیراک) تھے۔ اور اس زمانے وحدت الٰہی کے قطب تھے۔ اور اپنے زمانے کے بایزید بسطامیؒ۔ نیز آپ لکھتے ہیں (ترجمہ) "آپ واصلین حق میں سے تھے۔ اور اللہ کے سوا کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ اور نہ اللہ کے سوا کسی اور کو مقصود ومطلوب رکھا۔ ان کے قلب مبارک میں اللہ کے سوا کسی دوسرے مقصد کا گزر تک نہیں ہوا۔ اور خدا کے وجود کے سوا اور کوئی موجود ان کی نظروں میں سمایا ہی نہ تھا۔ اور نہ کسی اور موجود کا وجود سمجھتے تھے۔ اور حقیقی دوست (اللہ) کی دوستی سے نوازے گئے تھے۔"

حضرت حسن بصری قدس اللہ سرہ العزیز کا قول ہے: "جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے، کہ اسے بہرحال ایک نہ ایک دن خدا کے حضور

میں پیش ہوتا ہے، وہ کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ اس کے حزن والم کی کیفیت تو برابر ہی بڑھتی جائیگی"۔ اسی طرح یہ بھی ان کا قول ہے، کہ "دُنیا میں آدمی جتنی ملول وغمگین زندگی بسر کرے گا۔ اسی مناسبت سے اسکے عمل صالح کی آبیاری ہوگی"۔

حضرت احمد مسروق قدس سرہٗ فرماتے ہیں: "معرفت کے درخت کو تفکر کا پانی دیا جاتا ہے۔ اور توبہ کے درخت کو ندامت کا پانی"۔

غرض وحدت الوجود کہیئے یا وحدت الشہود، مرتبہ قرب ووصال کہیئے یا مرتبہ عبدیت وعبودیت۔ آپ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی نظر رکھتے تھے۔ اور غیر اللہ کا وجود آپ کی نظروں میں ہیچ تھا۔

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں: "طلب میں ایسی حالت ہونی چاہئے کہ لوگ دیوانہ سمجھیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اتنی یاد کرو کہ لوگ تم کو پاگل کہیں۔ جو لوگ آنکھ، کان اور جان سب کچھ محبت میں فنا کر دیتے ہیں، ان کی حالت تو ایسی ہوتی ہے۔ کہ ؎

یعنی ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے ؛ تیری ہستی کی رنگ وبو نہ رہے

جتنا تعلق ذات حق سے بڑھتا ہے۔ اور سب کو فنا کرتے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کی توجہ ہر وقت حق کی طرف رہتی ہے اس لئے ان پر ہر وقت ایک استغراق کا عالم طاری ہوتا ہے۔ اور جب توجہ ہی کسی اور طرف نہیں ہوتی، تو بہت سی باتوں میں بھول ہو جاتی ہے۔ محبوب حقیقی کے سوا ان کو کچھ اور یاد ہی نہیں ہوتا۔

حضرات صحابہؓ میں بھی اس رنگ کے ایک بزرگ گزرے ہیں، حضرت ابوذر غفاریؓ۔ ایک دن آپ کی صاحبزادی آپ کے ہمراہ جا رہی تھیں۔ لوگوں نے پوچھا۔ یہ لڑکی آپ کی ہے؟ تو آپ بہت غور سے اُسے دیکھکر فرماتے ہیں کہ

ماں، گھر والے تو یہی کہتے ہیں کہ یہ لڑکی میری ہے، یعنی یہ بھی یاد نہ تھا، کہ واقعی یہ میری اپنی لڑکی ہے۔ گھر والے کے قول سے استدلال کیا۔

حضرت شیخ عبدالحق ردولوی کے استغراق کا یہ عالم تھا، کہ آپ ہمیشہ نماز جامع مسجد میں باجماعت ادا کیا کرتے تھے۔ لیکن راستہ کبھی یاد نہ رہا۔ یہ کیفیت تھی استغراق کی، حضرت کے ایک خادم تھے بختیار نام، وہ آگے آگے چلتے اور حق حق کہتے چلے جاتے۔ اور آپ اس آواز پر چلتے رہتے اور مسجد تک پہنچ جاتے کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ تیس برس تک ایک ہی مسجد میں نماز پڑھی مگر راستہ تک یاد نہ رہا۔ اس قدر تو استغراق تھا۔ مگر اتباع سنت کا یہ حال تھا کہ کسی معمولی سنت کو بھی ترک نہیں کیا۔

ایک دل میں دو چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ والوں کے دل میں ایک ایسی چیز بس گئی ہے، کہ کسی دوسری چیز کی اس میں گنجائش ہی نہ رہی۔ اگر عقلاً ایسوں کو مجنون نہ کہیں تو کیا کہیں۔ جنکو نہ راستہ یاد ہو نہ اولاد۔ نہ خادم۔ یہ اُن کے دماغ ہی کی قوت و صحت ہے۔ کہ اس قدر ضبط ہے۔ چنانچہ حضرت مخدوم عبدالحق ردولوی قدس سرہٗ باوجود اس قدر مغلوب الحال ہونے کے فرماتے ہیں:-

"منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بہ فریاد آمد۔ اینجا مردانند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند"۔ یعنی منصور ایک بچہ تھا۔ کہ ایک قطرے میں شور مچانے لگا۔ یہاں مرد ہیں، کہ سمندر کے سمندر چڑھا جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ لیکن اس قدر استغراق کے باوجود استقامت ایسی تھی کہ نماز تو نماز جماعت بھی کبھی نہ چھوٹی۔ یہ تھا اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اور اسی اتباع ہی کی برکت سے اس درجے کو پہنچے۔ اور یہ نمبر پایا۔

کیمیائیست عجب بندگیٔ پیر مغان
خاک او گشتم و چندین درجاتم دادند

یہ ہے وہ کیمیا اور دولت جو حاصل ہو جاتی ہے، تو اس کے حصول کے بعد جوش میں آکر کہتے ہیں۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
واندران تیرہ شبم آب حیاتم دادند

دوسروں کو کیا خبر اس دولت کی، اندھے مادر زاد کو کیا خبر کہ نظر کسے کہتے ہیں، اور روشنی کیسی ہوتی ہے۔ ارے عاشقوں کے چہرے پر تو وحشت ہی زیب دیتی ہے۔ واللہ وہ عاشق ہی نہیں جو سوٹ بوٹ سے آراستہ ہو۔ خدا کی قسم جنکے دلوں میں محبت گھس گئی ہے، انہیں اپنے سر اور پاؤں کی خبر نہیں ہوتی۔ اور اگر ان کے پاس پھٹی جوتی اور پھٹا ہوا لباس ہو گا، تو انہیں عار نہ ہو گا۔

نشاید عشق را کنج سلامت ؛ خوشا رسوائی کوئے ملامت

حضرت شیخ المشایخ قدس سرہٗ کی دیوانگیٔ عشق

(التکشف ص۵۲)

حضرت شیخ عبدالحلیم قدس سرہٗ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:-

(ترجمہ) "حضرت شیخ المشایخ قدس سرہٗ عشق خداوندی کے دیوانے تھے۔ اور اپنے بعض مریدوں کو بھی عشق حق کی دیوانگی کا راز بتا دیا تھا۔ اور وہ دیوانے ہو چکے تھے۔ ایک مرید سے کہا: "جب تک لوگوں کے ساتھ دیوانگی اختیار نہیں کرو گے، حق کے ساتھ نزدیک نہیں ہو سکو گے"، (وہ مرید) درد عشق سے پریشان حال ہوا، ننگ و ناموس کے دائرے سے نکل آیا۔"

اور عشق کسے کہتے ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ معارف الٰہی موجزن ہوئے

اس کا نام عشق رکھا۔ اور عقل بالکل غائب ہو چکی"۔

ایک اور عارف حضرت وارث علی شاہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔ عشق تین حرفوں سے مرکب ہے ع، ش، اور ق۔ عین سے مراد عبادت الٰہی، شین سے پابندی شرع اور قاف سے قربانی نفس۔ فرمایا" عاشق کی ابتدا میں 'ع' ہے اور شرع کے آخر میں 'ع' ہے یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو کوئی شرع شریف کے درجات کو آخر تک طے نہ کرے وہ عشق میں کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ کمال عشق یہ ہے کہ عاشق سے معشوق ہو جائے۔ عاشق وہی ہے، جو ذاتِ معشوق میں محو ہو جائے۔ فرمایا: علم اور چیز ہے اور عشق اور چیز۔ جہاں حضرت عشق آئے وہاں علم و عقل کا کام نہیں رہتا" فرمایا" تمام صفات عشق ذات میں فنا ہو جاتے ہیں۔ اس میں گم ہو جانے ہی کو وصال کہتے ہیں۔ اور خودی میں نہ رہنا کمال ہے۔ عشاق جب اس درجے پر پہنچتے ہیں، تو اپنی ہستی کو نیست کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے، کہ جب آفتاب فلک پر نور افشاں ہو جاتا ہے۔ تو ستارے مخلوق کی نگاہ سے کالعدم ہو جاتے ہیں۔ جس طرح کواکب کا وجود آسمان پر ہے۔ اسی طرح عشاق کا وجود معشوق میں ہے۔ (جو اللہ کا ہُوا اللہ اس کا ہُوا) عاشق و معشوق ایک ذات ہو جاتے ہیں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کہ وہ آفتاب حقیقی تمام انوار و اوصاف عشاق کو اپنے میں جذب کر لے"۔

اور حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ واصلان حق میں سے تھے۔ کسی دوسرے کی طرف مشغول نہیں ہوتے تھے۔ اور اللہ کے بغیر ان کا اور کوئی مقصود نہ تھا۔ ان کے سر اور ضمیر میں حق کے ساتھ اور کسی مطلوب کو دخل نہ تھا۔ اور ان کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بغیر اور کسی کی ہستی نہیں سماتی تھی۔ اور ان کا

تمام ہست دنیست دوست حقیقی کا وصال تھا۔ اور حق کی دوستی کے بغیر باقی سب کی دوستی سے دست بردار ہو چکے تھے۔ اور دوست حقیقی کے وصال سے نوازش یافتہ، اور اسکی برکت سے معظم و مکرم ہو چکے تھے۔ اور درحقیقت آپ پیر تربیت بھی تھے۔ اور پیر ارادت بھی، قدس اللہ سرہ العزیز

اے بسا کافر شدہ از عقل خود
ہیچ دیدی کافر از دیوانگی ؟
چون شدی مجنون و عاشق اے دلم
زود بستان ساغر از دیوانگی (قلمی نسخہ ص ۲۲۵)

حضرت شیخ المشائخ قدس اللہ سرہ العزیز ایک درویش کامل تھے

حضرت شیخ دانشمند لکھتے ہیں: "دیگے از خاصیتہائے حضرت الیشان فقر است۔ در ابتداء و انتہا حال او فقر بود، ظاہراً و باطناً گویا نہنگ دریائے فقر بود۔ عزیز من عالمے را باید کہ درویش باشد و درویش را باید کہ عالم بود۔ و عالمے کہ درو چاشنی فقر نیست سبعیت ضاری، و درویشے کہ درو حلاوت علم نیست عالمے است در بیکاری۔

(ترجمہ) اور حضرت شیخ المشائخ قدس سرہ کی دوسری خاصیتوں میں سے ایک خاصیت فقر کی تھی۔ ابتداء سے انتہا تک وہ فقیری کی حالت میں تھے۔ ظاہر و باطن ہر دو لحاظ سے۔ گویا فقر کے سمندر کے ماہر تیراک تھے۔"

"اور اے میرے پیارے! عالم کو چاہیے کہ وہ فقیر ہو۔ اور فقیر کو چاہیئے کہ وہ عالم ہو۔ اور وہ عالِم جس میں فقر کی چاشنی نہیں وہ ایک مضر درندہ ہے۔ اور وہ فقیر جس میں علم کی مٹھاس نہیں وہ ایک

بے کار عامل ہے۔ (قلمی نسخہ مقالات ص۱۷۶)

حضرت داتا گنج بخشؒ فقر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ " فقر کا مرتبہ خدا کے نزدیک بہت بڑا اور افضل ہے۔ اور فقیر کی تعریف یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور اس کی کسی چیز میں بھی خلل نہ آئے نہ دُنیاوی ساز و سامان ہونے سے مالدار ہو جائے۔ اور نہ اُس کے نہ ہونے سے محتاج ہو جائے۔ یعنی اُس کا ہونا اور نہ ہونا اُس کے نزدیک برابر ہو۔ بلکہ نہ ہونے سے اور بھی زیادہ خوش ہو۔ کیونکہ فقیر جتنا تنگدست ہوگا۔ اسی قدر اس پر حال زیادہ کشادہ ہوگا۔ اور اسرار زیادہ منکشف ہونگے۔ وہ جس قدر دُنیا کے مال و متاع سے بے نیاز ہوتا ہے، اتنا ہی اسکی زندگی الطاف خفی اور اسرار روشن سے وابستہ ہوتی جاتی ہے۔ اور رضائے الٰہی کی خاطر وہ دُنیا کی تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایک فقیر کا کمالِ فقر یہ ہے کہ اگر دونوں جہاں اس کے فقر کے ترازو کے پلڑے میں رکھے جائیں۔ تو وہ ایک مچھر کے برابر بھی نہ ہوں۔ اور اسکی ایک سانس دونوں عالم میں نہ سمائے "۔

حضرت ہجویریؒ مزید فرماتے ہیں: " جو کچھ فقیر کے دل پر گذرے، اس کو ظاہر نہ کرے۔ اور جس کا ظہور ہو جائے اُسکو چھپائے نہیں۔ اور نہ اسرار کے غالب ہو جانے سے ایسا مغلوب ہو جائے کہ شریعت کے احکام ادا نہ کر سکے "۔

حضرت ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں: " فقیر کی صفت یہ ہے کہ نہ ہونے کی صورت میں سکوت کرے۔ اور ہونے کے وقت خرچ کرے اور خرچ کے لئے بے چین ہو۔ حضرت ہجویریؒ اس کی تشریح

بیان کرتے ہیں کہ: "نہ ہونے کے وقت سکوت سے مراد خداوند تعالیٰ کی رضا کی دلیل ہے۔ اور اگر اس کے پاس کچھ ہو تو اس کو خداوند تعالیٰ کی جانب سے خلعت عطا ہوا۔ مگر خلعت فرقت کی نشانی ہے۔ کیونکہ محب خلعت قبول نہیں کرتا۔ اسلئے فقیر کو جو کچھ ملتا ہے، اس کو وہ جلد تر دوسروں کو دیکر اپنے سے جدا کر دیتا ہے"۔ ان تصریحات کی روشنی میں حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے فقر کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کتنی عظیم شخصیت اور درویش کامل تھے۔

حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ کی عالی ہمتی۔

(ترجمہ) اور حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ عالی ہمتی سے وافر حصہ رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ عالی ہمت وہ ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو کرتا ہے اور اس کا بدلہ نہیں چاہتا۔ پس اے میرے دوست! جب اللہ تعالیٰ نے تم کو بے عوض پیدا کیا تو انصاف کا تقاضا یہ ہے، کہ تم بھی بغیر عوض کے اُس کی پرستش کیا کرو۔

حضرت رابعہ عدویہ قدس سرہا اپنے مناجات میں اللہ تعالےٰ سے عرض کرتی ہیں:۔

"اگر میں تیری عبادت جہنم کے ڈر سے کرتی ہوں تو مجھے نار جہنم کا لقمہ بنا دے۔ اور اگر میں تیری عبادت جنت کے لالچ میں کرتی ہوں۔ تو تُو مجھے اُس سے ہمیشہ کیلئے محروم رکھ۔ اور اگر میں صرف تجھ سے، تیری ذات سے تیرے لئے محبت کرتی ہوں، تو اے میرے مولا مجھے اپنے جمال ازل سے محروم نہ رکھ"۔

حضرت امام غزالی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: حضرت رابعہ عدویہ نے

بس خالص حب الٰہی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے، دیدار الٰہی اور جمال خداوندی کی محبت جس کا نظارہ ان کے دل کی آنکھوں نے کیا۔ اور یہی محبت سب سے بہتر اور برتر ہے۔ جمال ربوبیت بجائے خود سب سے بڑی چیز ہے۔ اسکے بارے میں حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے، کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "میں اپنے نیک اور صالح بندوں کو وہ چیز دیتا ہوں جسے نہ (عام) آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، نہ (عام) کان سن سکتے ہیں۔ اور نہ جس کا خیال کسی انسان کے دل میں گزر سکتا ہے۔"

حضرت شیخ رحمکارؒ کی قرآن فہمی

حضرت شیخ عبدالحلیم قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔ اور ہمارے حضرت شیخ قدس سرہٗ قرآن مجید کے اسرار و معانی کی باریکیوں کے بارے میں علم لدنی رکھتے تھے، اور اس بارے میں انکو بہت بڑی واقفیت حاصل ہو چکی تھی۔ اور حضرت قدس سرہٗ قرآن مجید کے بحر معانی کے ماہر تیراک تھے۔ (قلمی نسخہ ص۲۱۱)۔

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی خاکساری، تواضع شفقت و رأفت

حضرت اویس قرنیؒ کا قول ہے: "سربلندی عاجزی میں ہے۔ سرداری سچائی میں ہے۔ فخر فقر میں ہے۔ نسبت پرہیزگاری میں ہے۔ بزرگی قناعت میں ہے۔ استغنا توکل میں ہے۔"

حضرت بایزید بسطامیؒ قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔ جس کسی کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست بناتا ہے اسکو اپنی تین خصلتیں عطا کر دیتا ہے۔ دریا جیسی سخاوت، زمین جیسی تواضع اور آفتاب کی طرح شفقت۔

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کو ان صفات بالا کے بارے میں شیخ

محمد عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں :-

"ہمارے شیخ قدس سرہ نہایت منکسر المزاج اور نہایت متواضع تھے۔ تکبر اور خود پسندی سے کوسوں دور تھے۔ لوگوں کی دلجوئی اور خاطر داری میں کوشاں رہتے تھے۔ نہ صرف انسانوں پر شفقت فرماتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی چیونٹیوں کے بلوں میں بھی غلہ اور دانے دنکے ڈال دیا کرتے تھے۔ اور کبھی جنگل کے درندوں کے لئے بھی جنگل میں گوشت ڈالا کرتے۔ اور کبھی کبھی کتوں پر بھی مہربانی فرمایا کرتے۔ سانپ اور بچھو کو کبھی نہ مارتے۔ اور نہ اُن کو تکلیف پہنچاتے۔ ایک بار ایک بچھو نے آپ کو ڈس لیا تھا۔ مگر آپ نے اُس کو نہ مارا۔ اور دوسروں کو بھی اُس کے مارنے سے منع کیا۔ ایک دفعہ دو جونکیں پانی کے ذریعے آپ کے حلق میں گھس کر گلے میں چمٹ گئی تھیں، اور کچھ عرصہ تک آپ کو اس سے بڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔ تا آنکہ وہ خون چوس چوس کر خود باہر نکل آئیں۔ تب حضرت نے فرمایا کہ ان جونکوں کو پانی میں ڈال دو۔ اور ان کو ضرر پہنچانے سے لوگوں کو منع فرمایا۔

غرض آپ کی شفقت و رأفت آفتاب کی طرح عام تھی یہ صرف انسانوں کے لئے مخصوص نہ تھی، بلکہ آپ ہر ذی روح کے لئے سراپا شفقت تھے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مچھر بھی آپ کے جسم مبارک پر بیٹھ جاتا تو آپ اُس وقت تک اُسے نہ اُٹھاتے، جب تک وہ خود خون چوس کر نہ اُٹھتا۔ اس کے بعد آپ اس جگہ کو آہستگی کے ساتھ مل لیتے۔ (مقامات ۵۹)

ذوق سماع

اکثر اولیائے کرام و صوفیائے عظام ذوق سماع رکھتے رہے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش ہجویری قدس سرہ کے نزدیک سماع ...

نگران کے خیال میں اس کے لیے حسب ذیل شرائط ہیں: یعنی یہ کہ سالک بلاضرورت سماع نہ سنے۔ اور طویل وقفہ کے بعد سنے۔ تاکہ اس کی تعظیم دل میں قائم رہے۔ محفل سماع میں مرشد موجود ہو۔ عوام شریک نہ ہوں۔ قوال فاسق فاجر نہ ہوں۔ سماع کے وقت دل دنیاوی علائق سے پاک ہو۔ طبیعت لہو ولعب کی طرف مائل نہ ہو۔ اگر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے، تو اُس کو تکلف کے ساتھ نہ روکے۔ اور یہ کیفیت جاتی رہے، تو تکلف کے ساتھ اسکو جذب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وجد کے وقت کسی کے مساعدت کی امید نہ رکھے۔ کوئی مساعدت کرے تو اُسکو نہ روکے۔ قوال کے گانے کی اچھائی برائی کا اظہار نہ کرے۔ محفل سماع میں لڑکے موجود نہ ہوں۔

حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ بھی ذوق سماع رکھتے تھے۔ اس ضمن میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں:۔

"و حضرت ایشان در مبدأ حال گاہے گاہے سماع مے شنیدے۔ و برآن وجد ہا مے کردندے، بمجرد صوت حسن بغیر دف و غیر آن از آلات ملاہی بسیار شنیدے۔ و بدان استغراق محبت افزودے۔ کہ آنرا بلفظ افغانی شعر و نثرے می خوانند کہ جملگی و تمامی نصیحت بترک دُنیا و تعلق بمولیٰ در آن مندرج مے بود۔ و در پیش حضرت ایشان در کثیر الاحوال گفتہ مے شدے"

(قلمی مسودہ، مقامات ربانی)

(ترجمہ) "ابتدائے حال میں حضرت شیخ الشیوخ کبھی کبھی سماع سنا کرتے تھے۔ اور اس پر وجد کیا کرتے تھے۔ اور آلات ملاہی یعنے دف وغیرہ کے بغیر محض خوش آوازی کے ساتھ بہت ذوق سے سنتے رہتے تھے۔ اور اس کے ذریعے استغراق محبت میں افزائش ہوتی تھی۔ اور جسے پشتو زبان میں شعر اور

مصرعے کہتے ہیں۔ اور جس میں ترک دُنیا، اور اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے کے خیالات ظاہر کیے گئے ہوتے تھے۔ اکثر اوقات حضرت شیخ صاحب کی خدمت میں سنائے جاتے تھے۔"

سلسلۂ طریقت

حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز مادرزاد ولی تھے۔ بالفاظ دیگر آپ کا طریقہ اویسی تھا۔ یعنی آپ نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے باطنی طور پر فیضان حاصل کیا تھا۔ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی روحانی تربیت فرمائی تھی۔ اور مدارج کمال پر پہنچایا تھا۔ بہت سے اولیاء اللہ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو کسی مرشد کامل سے ان کی وفات کے بعد روحانی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اس طریقے کو اویسی طریقہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت اویس قرنی نے بھی براہ راست باطنی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پایا تھا۔ چنانچہ سلسلہ نقشبندیہ حضرت ابوالحسن خرقانی قدس سرہٗ (المتوفی ۴۲۴ھ) نے اویسی طریقے پر حضرت بایزید بسطامی قدس سرہ (المتوفی ۲۶۱ھ / ۸۷۴ء) سے روحانی تربیت حاصل کی تھی۔ اسی طرح خواجہ بہاء الدین نقشبندی قدس سرہ (المتوفی ۷۹۱ھ) نے بیعت تو حضرت سید امیر کلال قدس سرہٗ المتوفی ۷۷۲ھ سے کی تھی لیکن آپ نے اسی اویسی طریقے پر خواجہ عبدالخالق غجدوانی قدس سرہٗ المتوفی ۵۷۵ھ سے بھی تربیت حاصل کی تھی۔ اسی اویسی طریقے پر خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ نے حضرت سید علی ہجویری (داتا گنج بخش) کے مزار پر چلہ کشی کرکے فیض پایا تھا۔ اور آپ کا یہ شعر زبان زد خلائق ہے ؎

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

غرض اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ اسی اویسی طریقے پر حضرت شیخ المشائخ سید رحمکار قدس سرہ نے بھی سرکار دو جہاں سے روحانی فیض حاصل کیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ آپکے عہد طفولیت سے شروع ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ اس طرح لکھتے ہیں :۔

"و طریقۂ شیخ اویسی بود و نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مربیٔ او۔ و از قولِ صریح او قدس سرہ این طریقہ اویسی معلوم شدہ است۔ و حضرت ایشان این طریقہ اویسی بہ ہر کسے ظاہر نے کرد و نے گفت از جہت آنکہ از اسرار است۔"
(مقامات ص۴۷)

(ترجمہ) اور حضرت شیخ جیو صاحب کا طریقہ اویسی تھا۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ان کا مربی تھا۔ اور آپ کے صریح قول سے آپ کا طریقہ اویسی ہی معلوم ہوا ہے۔ (لیکن) آپ ہر ایک پر اس طریقے کا اظہار نہیں فرمایا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک راز ہے اور راز کا چھپانا ہی بہتر ہوتا ہے"۔

حضرت شیخ دانشمند عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ نے متعدد مواقع پر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ آپ کا طریقہ اویسی تھا۔ چنانچہ ایک جگہ آپ لکھتے ہیں :۔

"پس طریقہ ایشان اویسی بود و مربی او نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم در جمیع درجہ او از فضل و لطف احد صمدی بود۔ و ہر چہ از محبت و سعادت بدو روئے نمودہ و میرسد ہمہ از قسمت ازلی بود۔ و معاملہ ایشان با مریدان و اصحاب ہمہ بتوجہات باطنی و صاحب نظری بود"۔
(مقامات قلمی نسخہ ص۱۲۳)

(ترجمہ یعنی ان کا طریقہ اویسی تھا۔ اور نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ان کا

مربی۔ اور آپ کے درجات اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ تھے۔ اور جمعیت وسعادت میں سے جو کچھ بھی آپ پر ظاہر ہوتا اور آپ کو مل جاتا سب کچھ قسمت ازلی کا نتیجہ تھا۔ اور حضرت شیخ المشائخ اپنے مریدوں اور ساتھیوں کی تربیت بھی باطنی طور پر توجہات کے ذریعے کیا کرتے تھے۔"

اس سلسلے میں صاحب مجموع البرکات نے تفصیلاً لکھا ہے کہ آپ کا طریقہ اویسی تھا لیکن اپنے والد ماجد حضرت قطب عالم شیخ بہادر قدس سرہٗ سے سلسلہ سہروردیہ میں بھی بیعت تھے۔ آپ نے تصریحاً لکھا ہے کہ دوسرے اولیاء اللہ سے اگرچہ آپ نے ملاقاتیں کی ہیں لیکن بیعت اور روحانی فیض کسی اور سے نہیں پایا ہے"۔ صاحب مجموع البرکات کے اس بیان کی تائید خوشحال خاں خٹک مرحوم اور جناب فقیر جمیل بیگ قدس سرہ کی واضح اور صریح شہادتوں سے بھی ہوتی ہے جن کا ذکر اپنے موقع پر کیا جائے گا۔

اپنے والد ماجد حضرت قطب عالم شیخ بہادر قدس سرہٗ سے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے بیعت ہونے کے بارے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب اس طرح لکھتے ہیں :-

"واز قولِ حضرت ایشان نشنیدہ ام لیکن از آداب و مدح بسیار و رفتن بسوئے مزار پُرانوار او۔ بخاطر می رسد کہ بطریق سہروردی از جانب پدر خود حضرت شیخ بہادر رہم نسبتے دارد"۔ (مقامات ص۲۱)

"یعنی میں نے حضرت شیخ المشائخ سے ہمیشہ اپنے والد ماجد کی تعریف وتوصیف ہی سنی ہے۔ آپ عموماً اپنے پدر بزرگوار کے مزار پُرانوار پر حاضری دیا کرتے تھے۔ اور خود اُن سے سُنا تو نہیں لیکن میں ایسا سمجھتا ہوں کہ سلسلہ سہروردیہ میں اپنے والد بزرگوار سے نسبت رکھتے ہوں گے۔

ایک اور موقع پر حضرت شیخ دانشمند اپنے والد حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کا انکے والد ماجد حضرت شیخ بہادر قدس سرہٗ کے مزار پر حاضری دینے کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں :-

(ترجمہ) ایک بار حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ اپنے والد ماجد قطب عالم حضرت شیخ بہادر قدس سرہٗ کے مزار پر حاضری دینے کیلئے ایک انبوہ کثیر کے ساتھ تشریف لیگئے۔ آپ نے فرمایا کہ چلتے وقت ہر ایک شخص یہ دعا کرے کہ اے اللہ! ان کے درجات کو بلند کردے۔ کیونکہ ان کی سربلندی ہماری سربلندی ہے۔ اور جب مزار کے قریب پہنچے تو سب لوگوں کو ایک وادی میں ٹھہرا کر کے ایک شخص کو پہاڑی پر کھڑا کیا۔ اور اسے ہدایت کی کہ ہر آنے والے شخص کو روکے رکھے۔ اور حضرت شیخ المشائخ اکیلے مزار پر حاضری دینے کے لئے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وادی میں ٹھہرائے لوگوں کو بھی بلایا اور وہ سب قطب عالم کے مزار پر حاضر ہوئے۔ بعد میں اس شخص سے جو پہاڑی پر کھڑا کیا گیا تھا۔ پوچھا گیا۔ تو اُس نے کہا۔ کہ حضرت شیخ جی صاحب برہنہ سر اپنے والد ماجد کے مزار کے پاس بائیں طرف کھڑے تھے۔ اور یہ بات حکمت سے خالی نہ تھی۔ کیونکہ نہ اس سے پہلے اور نہ بعد میں حضرت شیخ المشائخ سے اس قسم کا کوئی واقعہ صادر ہُوا۔

"اور جب آپ اپنے والد ماجد قطب عالم کا ذکر کرتے تو نہایت ادب سے نام لیتے اور اُن کو "راستینے" یعنی راست گو اور صادق القول کہکر پکارتے تے"۔

پس معلوم ہوا کہ ظاہری طور پر آپ سلسلۂ سہروردیہ میں اپنے والد ماجد سے بھی بیعت تھے۔ اور اسکے علاوہ چونکہ آپ کے اجداد

سلسلوں میں بھی مجاز تھے۔ لہٰذا اپنے والد کے ذریعے آپ تمام دوسرے سلسلوں میں بھی مجاز ہوں گے۔

جناب قاضی عبدالحلیم صاحب اثر نے اپنی کتاب روحانی رابطہ کے ص۵۷۹ پر حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کے سلسلۂ طریقت کے بارے میں لکھا ہے کہ عام تذکروں کے مطابق حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ کے عرفان و تصوف کا طریقہ سہروردیہ اور چشتیہ تھا لیکن میاں حمیم گل ولد میاں عبدالرحیم ولد عبدالجسیم ولد محمد فہیم ولد دلدارالدین ولد ضیاءالدین شہید ابن شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ کی ایک قلمی یادداشت کے مطابق حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ چاروں سلسلوں یعنی قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور سہروردیہ میں بھی پیر طریقت تھے۔[1]

طریق اویسیہ کے بارے میں حضرت شیخ دانشمند قدس سرہٗ اس طرح لکھتے ہیں۔ (فارسی سے ترجمہ)

تمکین کی دو قسمیں ہیں، کسبی اور اصطفائی۔ کسبی یہ ہے کہ ایک شخص انسانی کمالات حاصل کر کے خدمات شائستہ بجا لاتا ہے اور اپنے بادشاہ اور آقا کی تعمیل حکم میں مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کرتا رہتا ہے۔ دن رات

---

[1] یہ بات کہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہ چاروں سلسلوں کے پیر طریقت تھے میں نے ۱۹۱۲ء میں ایک فاضل اور بزرگ شخصیت سے بھی سنی تھی۔ مگر اس وقت میں اپنی کم عمری اور ذہنی ناپختگی کے باعث اس بزرگ شخصیت سے اس کا ماخذ دریافت نہ کر سکا۔ یہ بزرگ شخصیت اس زمانے میں اکوڑہ خٹک میں رہنے کی وجہ سے اکوڑہ کے فقیر صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ بعد میں ڈاگ اسمٰعیل خیل چلے گئے تو پھر ڈاگ والے فقیر کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ وہاں سے پھر بالاکنڈ ایجنسی کے قصبہ بدرگہ میں مقیم ہوئے اور غالباً وہیں فوت ہوئے تھے۔ (ظفر)

اپنے آقا کی خدمت میں کمر بستہ رہتا ہے۔ پس اگر آقا کا منظور نظر ہو جائے تو اُسے عزت و مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور یہ کام مرشد کامل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور حدیث لَا یَزَالُ عَبْدِی (الخ) یعنی تقرب بالنوافل کا بھی یہی مطلب ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے، کہ بادشاہ کسی کو اعلیٰ مرتبے پر پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے۔ پس بذات خود اسکی تربیت کرنے لگ جاتا ہے۔ اور جب کمال حاصل کر لیتا ہے، تو اعلیٰ مرتبہ اسے تفویض کرتا ہے۔ اس طریقے میں مرشد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ خود نور محمدیؐ کے ذریعے اسکی تربیت فرماتا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اس قسم کے تربیت یافتہ ہیں۔ اور اولیاء اللہ میں سے بعض مثلاً بی بی مریمؑ، اویس قرنیؓ، ابوالحسن نوریؒ وغیرہم بھی اسی قسم کے تربیت یافتہ تھے۔ اور حضرت شیخ رحمکارؒ قدس اللہ سرہ العزیز بھی اسی قسم کے تربیت یافتہ تھے کسی سے طریقہ نہیں کیا تھا۔ اور اویسی کا مطلب بھی یہی ہے، کہ اسکی تربیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، اور ظاہری مرشد نہیں رکھتا۔ اور حضرت رحمکارؒ بھی کسی کو قادریہ یا چشتیہ وغیرہ طریقوں کے طرز پر وظائف نہیں دیتے تھے، بلکہ آپ کیمیا نظر تھے۔ باطنی توجہ اور صرف نظر ہی سے حالت خواب یا حالت بیداری میں فیض یاب کرتے تھے۔ اور اب بعد از وفات بھی فیض یاب کر رہے ہیں، صرف قسمت کی بات ہے، اگر ازل میں سعید ہے، تو شیخ المشائخ سے فیض پا لیتا ہے، بلکہ بدبخت بھی نیک بخت بن جاتے ہیں۔ کیونکہ شیخ تو وہی ہو سکتا ہے، جو صرف باطنی توجہ سے بدبخت کو نیک بخت بنا دے۔" (مقامات ص۲۶)۔

غرض یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے، کہ آپ کا طریقہ اویسی تھا۔ اور ظاہری طور پر آپ اپنے والد ماجدؒ کے مرید تھے، جیسا کہ شیخ عبدالحلیم صاحب

قدس سرہٗ، خان خوشحال خان خٹک مرحوم اور مجموع البرکات کے مصنف نے یہ بات صریحاً لکھی ہے۔ اور جن لوگوں نے آپ کو حضرت اخون پنجو قدس سرہٗ یا پیر سباک صاحبؒ یا حاجی بہادر صاحبؒ کوہاٹی کا مرید ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ایک من گھڑت اور خود ساختہ کہانی ہے۔ جو ان حضرات کے پس ماندگان نے حضرت رحمکار قدس سرہٗ کی مقبولیت کو دیکھکر اپنے من پسند پیروں سے حضرت شیخ المشائخ کو وابستہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ جب ان حضرات کا مرید اتنے بلند درجے پر پہنچا ہوا ہے تو ان کے پیر کی بلندئ درجات کا کیا ٹھکانا ہوگا! ۔ اس ضمن میں مزید تفصیل میں آئندہ اپنے موقع پر بیان کروں گا۔

مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوجانا

جیساکہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوئے تھے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد تین سال تک حضرت رحمکار اپنے آبائی مقام پر سکونت پذیر رہے۔ اس کے بعد خاندانی روایات کے مطابق ۱۰۳۰ھ یعنی آپ وہاں سے چل کر موجودہ قصبہ زیارت کاکا صاحب سے بجانب غرب جنوب میں ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک چشمے کے پاس مقیم ہوئے۔ اس مقام کو آجکل "میلہ" کہا جاتا ہے۔ مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوجانے کے بعد حضرت شیخ المشائخ کی خواہش تھی۔ کہ عوام کو انکی حالت معلوم نہ ہونے پائے تاکہ لوگوں کی آمد و رفت اور ہجوم سے ذکر و فکر اور عبادت میں خلل نہ آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تھوڑا عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ لوگ خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اور یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا۔

ابتداء میں آپ نے لوگوں کو روکنے کے لئے کئی اقدامات کئے۔ آس پاس کے لوگوں کو ہدایت کی کہ آنے والے لوگوں کو روٹی وغیرہ نہ دی جائے، اور ان کے کھانے پکانے اور رہائش کا انتظام بھی نہ کیا جائے۔ مقصد یہ تھا، کہ لوگ تنگ آکر آنے سے گریز کریں۔ مگر اس کے باوجود بھی لوگ آتے رہے، یہ لوگ اپنے ساتھ کھانے پینے کے اشیاء بھی لاتے تھے۔ چنانچہ مختلف اقدامات کے باوجود بھی لوگوں کی حوصلہ شکنی نہ ہوئی اور زائرین کی تعداد میں کمی آنے کی بجائے اسمیں دن بہ دن اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آپ کی ذات میں کچھ ایسی کشش اور محبوبیت تھی، کہ لوگ ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل کرتے بھوکے پیاسے رہتے۔ مگر کسی طرح بھی روکنے سے نہ رُکتے۔ کیونکہ بقول شاعر ؎

تو خواہی آستین افشاں وخواہی دامن اندر کش
مگس ہرگز نخواہد رفت از دُکان حلوائی

اسی طرح اس کشمکش میں کچھ عرصہ گزرا۔ اور پھر آپ نے فرمایا:-

"قصد آن داشتم کہ انبوہ خلق را از خود منع کنم۔ اما چون حق تعالیٰ عزوجل در پئے ما گماشت و وجہٗ خلاصی را نمی بینم۔ و چارہ ندارم"۔ پس ازاں حضرت رخصت داد کہ ہر کہ خواہد آید خدمت ایشان کند۔ و خود ہم احیاناً ایشان را چیزے خوردنی مے داد۔ و بعض از مخلصان حضرت ایشان را چنان حال روئے داد کہ بطعام خوردن حاجت نہ داشت۔ و بعض احیاناً بسیار خوردے' و احیاناً نمے خوردے و در خوردن و نہ خوردن مخالفت نفس مے کردند و مے دانستند"۔ (مقامات قلمی ص ۲۲)

(ترجمہ) "میرا ارادہ تھا، کہ لوگوں کے ہجوم و انبوہ کو روکوں لیکن جب اللہ تعالیٰ ان کو میرے پیچھے لگا دیا، اور چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور کوئی چارہ

دکھائی نہیں دیتا" اس کے بعد لوگوں کو اجازت دی، کہ آنے والوں کی خدمت کی جائے۔ اور خود بھی ان کو کبھی کبھی کھانے کی چیزیں دے دیتے۔ اور حضرت کے بعض مخلص مریدوں کی حالت تو ایسی ہوئی، کہ ان کو کھانے پینے کی ضرورت ہی پیدا نہ ہوتی اور بعض کبھی کبھی بہت زیادہ کھا لیتے۔ اور کبھی بالکل نہ کھاتے اور کھانے نہ کھانے میں ان کے مدنظر نفس کی مخالفت ہوا کرتی تھی۔

اس کے بعد حضرت شیخ المشائخ نے ۱۳۲۲ھ میں زائرین کے لئے باقاعدہ کھانے کا انتظام کیا۔ اور عوام وخواص کو دریادلی سے کھلانے لگے۔ اور جو انتظام حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ نے اپنی زندگی میں مہمانوں کی سہولت، خوراک و رہائش کے سلسلے میں شروع کیا تھا، وہ آپ کی وفات کے بعد چار سو سال گذر جانے کے باوجود بھی آج تک جاری ہے۔ اور رہتی دُنیا تک جاری رہیگا۔ انشاء اللہ۔ اس قسم کے انتظامات حضرت شیخ رحمکار کے آباؤ اجداد کے مزارات پر بھی موجود تھیں۔ اسلئے بقول شاعر ؎

مبین حقیر گدایانِ شہر را کیں قوم
شہان بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

حضرت شیخ رحمکارؒ کے علمی مشاغل

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے، حضرت شیخ المشائخ علوم منقولی ومعقولی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ تقریباً چھبیس سال تک علوم ظاہری کی تحصیل وتکمیل میں مصروف رہے تھے۔ تفسیر حدیث، فقہ اور اصول فقہ وحدیث کی اٹھارہ کتابیں عموماً ہر وقت آپ کے زیر مطالعہ رہا کرتی تھیں، تفسیر بحر المعانی زیادہ تر زیر مطالعہ رہتی تھی۔ ان کتابوں کے بارے میں آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ "یہ اس فقیر کا ظاہری علم ہے"۔ نیز فرماتے کہ یہ کتابیں میرے لئے چراغ راہ ہیں۔ ان کی روشنی میں زندگی کا سفر طے کر رہا

ہوں۔ اور میں وہی کرتا ہوں۔ جو کچھ اس میں کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اور جو
باتوں کی ان میں ممانعت کی گئی ہے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں"۔
آپ کے پاس مختلف علوم و فنون کی صدہا کتابیں اور قرآن کریم کے صد
نسخے آئے۔ مگر آپ نے ان میں سے چند کتابیں اور ایک قرآن کریم اپنے لئے مخصوص
کرلیا تھا۔ یہ کتابیں بعد میں آپ کے حسب وصیت حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب
دانشمند کو مل گئیں۔ باقی جتنی کتابیں بھی آپ کو پہنچتی رہیں، وہ یا تو آپ اہل علم
کو بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ یا فی سبیل اللہ وقف فرماتے۔ ان کتابوں کے علاوہ
آپ نے کثیر تعداد میں خود بھی کتابیں خرید خرید کر اہل علم میں تقسیم کردی تھیں
(مجمع البرکات ص ۳۲۹)

حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کی نگرانی اور سرپرستی میں سات مدرسے
جاری تھے۔ ان میں سے تین مدرسوں میں تو قرآن کریم کی تدریس و تعلیم ہو
کرتی تھی۔ اور چار مدرسوں میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھائی جاتی
تھیں۔ ان مدارس و مکاتب سے متعلقہ کتب خانوں میں ایک روایت کے
مطابق بارہ ہزار، ایک دوسری روایت کے مطابق اکیس ہزار کتابیں موجود
تھیں، جب کسی مسئلے میں تحقیق کی ضرورت پیش آتی، تو آپ مسئلے سے متعلق
کتابیں منگوا لیتے۔ اور مسئلہ زیر بحث نکال لیتے۔ اس بارے میں مجموع البرکات
کا بیان ہے۔ کہ یہ گویا آپ کی کرامت تھی کہ جس مسئلے کی تحقیق مدنظر ہوتی، کتاب
کھولتے ہی وہی مسئلہ نکل آتا۔ اور تلاش کی ضرورت نہ ہوتی۔
آپ کا عام معمول یہ تھا، کہ جب کسی علمی مسئلے پر بحث ہوتی تو آپ علما
کے سامنے اس مسئلے کے متعلق تمام نکات واضح کردیتے اور اس کے ہر پہلو
پر روشنی ڈالتے ہوئے کتابیں منگوا کر ان کے حوالے بھی دکھاتے۔ اور ان کو مطمئن کرتے

اور جب تک ان کو اطمینان نہ ہوتا، آپ مختلف طریقوں سے اس مسئلے کی وضاحت فرماتے تا آنکہ علماء مطمئن ہو جاتے۔

ان مدارس و مکاتب میں صدہا طالب علم پڑھا کرتے تھے۔ اور ان کتابوں سے استفادہ کرتے۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد صاحب مجموع البرکات نے حضرت قبلہ عالم شیخ بہادر قدس سرہٗ کا وہ قول نقل کیا ہے جو آپ نے حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کی شیرخوارگی کے زمانے میں اُن کی والدہ ماجدہ سے فرمایا تھا "کہ مرا یک مرتبہ است وا ورا دو"۔ اور پھر اس کی تشریح یوں کی۔ کہ اسکو علم ظاہر و باطن دونوں بدرجہ اتم حاصل ہونگے۔ (ص۲۳۰)۔

علماء کرام سے علمی صحبتیں

آپ کی مجلس میں اکثر علماء و فضلاء حاضر ہُوا کرتے تھے۔ اور عموماً مختلف علمی مسائل زیر بحث آتے۔ مگر آپ ان مباحث میں اکثر خاموش رہتے۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آکر کوئی مسئلہ پوچھتا۔ اور میں موجود ہوتا تو آپ مجھے فرماتے، کہ اسکو جواب دوں کبھی کسی دوسرے عالم کو جواب دینے کے لئے کہہ دیتے۔ ویسے آپ کا معمول یہ تھا۔ کہ جواب سائل دوسرے علماء کے حوالے کر دیتے۔ مگر علماء آپ کی موجودگی میں جواب دینے میں ادب واحترام کی وجہ سے ہچکچاتے۔ پھر کبھی آپ اصرار کر کے ان سے فرماتے، آپ ہی علماء ہیں آپ ہی حکم ارشاد فرمائیں۔ اسکے بعد وہ جواب دے دیتے۔ بار ہا ایسا ہُوا کہ طلبہ علم دین اور علماء و فضلاء علمی شبہات اور کتابوں کے مشکل مقامات کے حل کرنے کی تمنا لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اور اپنے اشکالات پیش کرتے۔ اور اپنی مراد کو پہنچ جاتے۔ بلکہ کبھی کبھی اپنے شبہات واشکالات بیان کئے بغیر ہی، بوجہ آپ کی توجہ سے انکو شافی جوابات خود بخود مل جاتے۔

اوران کے بند سینے کھل جاتے۔ صاحب مجموع البرکات نے اس قسم کے متعدد واقعات بیان کئے ہیں۔ (ص۲۴۱)

اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ خود اپنا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں، (لکھتے ہیں) :-

ترجمہ :- ایک دن ایک شخص نے حضرت شیخ المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوکر ایک مسئلہ پوچھا۔ حضرت شیخ جی صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا بیٹا عبدالحلیم ! اس مسئلے کا جواب دو۔ میں نے اُس مسئلے کا جواب دیا۔ اُس شخص نے دوسرا مسئلہ پوچھا۔ حضرت نے دوبارہ مجھے جواب دینے کیلئے کہا۔ اور میں نے اس مسئلے کا بھی جواب دیا۔ اب اُس شخص نے تیسرا مسئلہ بھی پوچھا جس کا جواب مجھے یاد نہ تھا۔ اسلئے مجھے اندیشہ ہوا، کہ اگر حضرت اس بار بھی مجھے جواب دینے کیلئے فرمائیں تو میں جواب نہیں دے سکوں گا۔ لیکن حضرت نے از خود ہی اس کا جواب ارشاد فرمایا۔ اور مجھے نہ کہا۔ اُس شخص نے چوتھی بار بھی ایک مسئلہ پوچھا۔ اس کا جواب بھی مجھے یاد نہ تھا۔ اس لئے میرے دل میں کھٹکا رہا لیکن حضرت شیخ جی صاحب نے اس کا جواب بھی خود ارشاد فرمایا۔ اور مجھے نہ کہا۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ حضرت شیخ جی صاحب کو میرا حال معلوم تھا۔ اس لئے دو مسئلوں کے بارے میں تو مجھے جواب دینے کے لئے کہا۔ اور باقی دو مسئلوں کا جواب خود ارشاد فرمایا۔ اس کے علاوہ مجھے یاد نہیں، کہ حضرت جی صاحب نے خود کسی مسئلے کا جواب دیا ہو، مگر سوائے ان مسئلوں کے۔ ہاں ایک اور سوال کا جواب بھی حضرت نے خود دیا تھا۔ یعنے ایک دفعہ ایک امیر حضرت شیخ جی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور جناب شیخ ملی صاحب جو حضرت کے خاص

خادم تھے، ذکر جہر میں مصروف تھے۔ اور بار بار اللہ اللہ کہتے جاتے تھے۔ اس امیر نے شیخ علی کو ذکر جہر سے منع کیا۔ اور کہا کہ اس طرح سننے والوں پر بھی اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن حضرت شیخ جی صاحب نے فرمایا کہ آپ اس کے جواب دینے میں مشغول ہو جائیں۔ ذکر سے منع نہیں کرنا چاہیے۔ اور ایک دوسرے عالم نے جواب دیا اور کہا کہ ایک بار اللہ کے نام کی تعظیم کافی ہے۔ اور اس طرح کہہ دینا چاہیے کہ "بِعَدَدِ مَا ذَكَرَ اللّٰهَ الذَّاكِرُوْنَ وَبِعَدَدِ مَنْ غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ"۔ پس وہ امیر مطمئن ہو گیا۔ (مقامات قلمی نسخہ ص ۲۰۹)

تاثیر وعظ حضرت شیخ المشائخ کے وعظ میں ایک خاص تاثیر تھی حاضرین مجلس پر آپ کی تقریر کا نمایاں اثر ہوتا تھا۔ مجموع البرکات میں حضرت شیخ دانشمند کے حوالے سے لکھا ہے: "دگاہے یک اذاں دراں وقت محروم نماندہ و پرتو وعظش دراں زمان تا ہنگام رحلت ہمچناں بودہ" (ص ۲۴۲) یعنی آپ کے وعظ کے فیض سے کوئی بھی محروم نہ رہتا۔ اور آپ کے وعظ کی یہ تاثیر وقت وصال تک قائم رہی"۔

آپ جب کبھی علیل ہو جاتے، تو اور دنوں میں خواہ شدید تکلیف ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی سے پنجشنبہ اور جمعہ کو ضرور کچھ افاقہ ہو جاتا۔ اور حسب معمول پند و وعظ ارشاد فرماتے۔ اور اس کے دوران میں کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی۔ جس سال آپ کا انتقال ہوا ہے۔ ماہ رجب سے قبل آپ اسی طرح اپنے وعظ و ارشاد سے لوگوں کو مستفید فرماتے رہے۔ ماہ رجب کے اوائل میں بھی اسی طرح باقاعدگی کے ساتھ آپ وعظ کرتے رہے، لیکن وفات سے ایک ہفتہ قبل شدت بیماری کے باعث آپ وعظ ارشاد نہ فرما سکے۔ اور حضرت شیخ ضیاء الدین شہید قدس سرہ نے آپ کے ارشاد کے مطابق پنجشنبہ کو وعظ

ارشاد فرمایا۔ جمعہ کے دن حضرت شیخ جی صاحب منبر پر تشریف لائے۔ مگر ضعف ونقاہت کے باعث زیادہ دیر تک وعظ نہ کرسکے۔ اور آپ کی ہدایت کے مطابق شیخ گلنور صاحب قدس سرہٗ نے خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد اگلے پنجشنبہ کو ناغہ ہوا۔ اور وعظ نہ ہوسکا۔ اور جمعہ کے دن آپ واصل بحق ہوئے۔

مجلس میں آپ عموماً دھیمی آواز سے اور ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتے۔ دور بیٹھے ہوئے لوگ تکلیف کیساتھ سن سکتے تھے۔ لیکن وعظ کی صورت میں کچھ ایسی کیفیت طاری ہوجاتی کہ آپ کی آواز معمول سے کچھ زیادہ بلند ہوجاتی۔ اور دور بیٹھے ہوئے لوگ بھی بآسانی سن سکتے تھے۔ (ص۳۴۴)

حضرت دانشمند فرماتے ہیں :-

"میں سفر سے آیا تو یہ آرزو تھی کہ اگر حضرت شیخ جی صاحب کچھ وعظ ارشاد فرمائیں تو مجھے علمی فائدہ ہوجائیگا۔ چنانچہ ایک دن خود حضرت شیخ نے مجھ سے فرمایا بیٹا عبدالحلیم! اُٹھو اور کچھ وعظ کہو۔ میں حسب ارشاد اٹھا اور اپنے خیال کے مطابق ایک زوردار تقریر کی۔ لیکن حاضرین ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر میں دل گرفتہ ہوا۔ اور وعظ ختم کرکے منبر سے اُتر آیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ جی صاحب منبر پر تشریف لائے۔ آپ نے حمد وصلوٰۃ کے بعد فرمایا "اے نادانو! ایک خاص لہجے سے اس لفظ کا زبان مبارک سے نکلنا تھا، کہ سب لوگ لوٹ پوٹ ہوگئے۔ اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ گریباں آنسوؤں سے تر ہونے لگے۔ اور آہ و فغان کا شور بلند ہونے لگا۔ بہت سے لوگوں پر وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اور کافی دیر تک یہ اثر باقی رہا۔"

"اس کے بعد اگلے ہفتے پھر وعظ فرمایا حمد وثنا کے بعد فرمانے لگے: میرے

دوستو! میرے بچپن کا واقعہ ہے کہ میری والدۂ مشفقہ نے طاقچہ میں ایک برتن میں دہی رکھا تھا۔ ایک بلّی آئی، اور اُس نے وہ برتن طاقچے سے نیچے گرا دیا۔ معلوم نہیں اس سے آگے آپ کیا کہنا چاہتے تھے، اور کہ یہ بات کس مقصد کی تمہید تھی۔ کیونکہ وعظ کے ساتھ ان باتوں کی کوئی مناسبت نہ تھی۔ مگر لوگ ان الفاظ کے سنتے ہی حسب سابق بہت متأثر ہوئے۔ رات کو میں نے عرض کیا۔ یا حضرت! کیا وجہ ہے، اگر گزشتہ ہفتے میں نے زور دار الفاظ میں وعظ کیا۔ اور اس قدر علمی نکات و دقائق بیان کئے کہ شاید ہی کوئی اور بیان کر سکے لیکن سامعین پر ذرہ بھر بھی اثر نہ ہُوا۔ اور حضرت نے دونوں دفعہ چند ہی الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ حاضرین کی حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔

فرمانے لگے "اے فرزند! تو ہر چہ گفتی و گوئی سخنانِ خود گوئی، وا بزبانِ خود مے گوئی۔ و فقیر بزبان غیر گوید" (ص ۳۲۲)

یعنی "اے میرے بیٹے! تم نے جو کچھ کہا یا کہتے ہو، اپنی زبان سے کہتے ہو۔ اور یہ فقیر (میں) کسی اور کی زبان سے کہتا ہے۔"

بعینہٖ ایک ایسا ہی واقعہ حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز کے بارے میں بھی منقول ہے۔

حضرت غوث پاک ہفتے میں تین بار وعظ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے صاحبزادے ابو عبد اللہ عبد الوہابؒ سیاحتِ ممالک اور حصول علوم و فنون کے بعد واپس آئے، اور اپنے والد گرامی سے منبر پر وعظ کہنے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے اجازت دیدی۔ صاحبزادے کا بیان ہے کہ میں نے فصاحت و بلاغت کے دریا

بہا دئے۔ اور اپنی طرف سے پند و نصائح میں کوئی کمی نہ کی۔ خود حضور غوث پاک بھی وعظ میں تشریف فرما تھے، مگر میں نے محسوس کیا، کہ حاضرین پر ذرہ بھر اثر نہ ہوا۔ یہ رنگ دیکھکر میں منبر سے اُتر آیا۔"

"اُس کے بعد حضرت خود منبر پر تشریف لے گئے۔ اور ان جملوں سے ابتدا کی:۔

"کل میں روزے سے تھا۔ اُمِّ یحییٰ نے کچھ انڈے بھون کر ایک کورے مسکورے میں طاق پر رکھدئے تھے۔ ایک بلّی نے اس مسکورے کو طاق سے نیچے گرا دیا۔ مسکورا ٹوٹ گیا۔ اور انڈے خاک مال ہو گئے۔ حضور اتنی تقریر کر پائے تھے، کہ مجلس میں ہر طرف ہو حق کا شور بلند ہُوا۔ اور آن کی آن میں محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔"

"خلوت میں حضور نے فرمایا۔ میاں تم کو معلوم بھی ہے، کہ تمہارے عالمانہ وعظ کا اثر کیوں نہ ہوا۔ اور میرے ان معمولی الفاظ نے یہ ہنگامہ کیوں برپا کیا۔ سنو! تم کو اپنے سفر پر ناز ہے۔ مگر تم نے علم باطنی کا سفر نہیں کیا ہے۔ میں جب کلام کرتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ کی تجلیاں اتر لے کر آتی ہیں۔ کیونکہ میری نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ میں خودی میں گم ہو کر کلام کرتا ہوں۔ اور تم خودی میں قائم ہو کر کلام کرتے ہو۔"
(انوار الاولیاء، صفحہ ۲۴)

حضرت شیخ المشائخ کا عام معمول یہ تھا۔ کہ جمعہ اور پنجشنبہ کے دن اشراق سے ضحیٰ تک خاص اہل علم و اہل سلوک کے لئے خاص وعظ ہوتا تھا۔ اس میں عام لوگوں کو شرکت کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اسلئے حضرت کبھی اپنے خاص ہمراہیوں کے ساتھ پہاڑ کی بلندی پر جاکر ان کو

وعظ فرماتے۔ کبھی اپنے مکان پر علیحدہ ہوکر ان کے سامنے تصوف و سلوک کے مسائل بیان فرماتے۔ پنجشنبے کا دن تصوف و سلوک کے مسائل بیان کرنے کے لئے مخصوص تھا۔ اور اہل علم و اہل سلوک کی مشکلات حل کیا کرتے تھے۔ جمعہ کے دن وقت اول میں نماز ادا کرنے کی کوشش فرماتے۔ نماز کے بعد آسان زبان میں عوام کے فہم کے مطابق وعظ فرماتے ہاور وعظ کا سلسلہ کبھی کبھی عصر کی نماز تک اور کبھی اس سے ذرا پہلے ختم ہوجاتا۔ وعظ میں آپ تفصیلی طور پر دینی مسائل بیان فرمایا کرتے۔

صاحب مجموع البرکات کا بیان ہے۔ کہ زود نویس کاتبوں نے آپ کے ملفوظات اور وعظ و نصائح کو بالالتزام لکھکر محفوظ کرلیا تھا۔ اور اس طرح کی تین کتابیں تیار ہوچکی تھیں۔ جمعہ کے دن کے مواعظ سلیس فارسی زبان میں مرتب ہوئے تھے۔ اور اس کا نام نصیحت نامہ تھا۔ پنج شنبہ کے دن کے مواعظ یعنی تصوف وسلوک کے اسرار و رموز عربی زبان میں مفتاح السلوک کے نام سے مرتب کئے گئے تھے۔ اور پنجشنبہ اور جمعہ کے دن کے خاص حقائق کشف الحقائق کے نام سے عربی میں لکھے گئے تھے۔ اس طرح حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ نے آیت وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ الآیۃ کے بارے میں جو حقائق و معارف اہل علم و سلوک کے سامنے بیان فرمائے تھے۔ ان ملفوظات کو "قواعد العارفین" کے نام سے عربی زبان میں مرتب کیا گیا تھا۔ (طا۳۲)

لیکن یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ بد قسمتی سے یہ نایاب کتابیں حضرت شیخ المشائخ کی اولاد کی بے پروائی اور عدم توجہی کے باعث دستبرد زمانہ سے ضائع ہوچکی ہیں۔ ورنہ ان کی موجودگی میں اس بات کا باسانی اندازہ لگایا جاسکتا تھا، کہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کا علمی مقام کتنا بلند

وارفع تھا۔ اور آپ نے تصوف و سلوک کے کیسے کیسے دُرہائے آبدار اپنے ہمراہیوں پرنچھاور کئے تھے۔

اہلِ علم کی مشکل کشائی

صاحبِ مجموع البرکات نے ایسے بہت سے واقعات لکھے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ علمائے کرام دور دور سے آکر آپ سے علمی اشکالات بیان کرتے۔ اور حضرت شیخ جی صاحب ان کے اشکالات کو بڑی عمدگی سے حل کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ لکھتے ہیں:

"کہ ایک دفعہ ایک بہت بڑے عالم کو فلسفہ کے ایک مسئلے میں علمی اشکال پیدا ہوا۔ اور "شرح حکمۃ العین" کی ایک عبارت جو نہایت مغلق اور پیچیدہ تھی۔ اور اس کا مطلب حل نہ ہوسکتا تھا، اسلئے وہ عالم کتاب لیکر آپ کے پاس حاضر ہوا۔ حضرت نے اس مقام کو نہایت عمدگی سے حل کیا۔ اور اُس کا مطلب واضح کرکے اس عالم کی تسلی کرادی۔

آخوند زُفر کہستانی جو آپ کے خلفاء میں بڑے پائے کے عالم و فاضل تھے۔ اپنے ایک عربی مکتوب میں اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کہ "میں زمانہ طالب علمی میں علاقہ یوسف زئی کے ایک گاؤں "غلامان" میں تحصیل علم کی خاطر ایک جید عالم کے پاس مقیم تھا۔ ان دنوں میں میں اپنے اُستاد سے شرح عقائد جلالی کا حاشیہ "اخون یوسف" پڑھا کرتا تھا۔ میرے اُستاد کا باطنی تعلق حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ سے تھا۔ اور بار بار وہ آپ کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ "حاشیہ اخون یوسف" پڑھتے وقت ایک مقام ایسا آیا جو بہت مشکل تھا، اور میرے فاضل استاد اسے حل نہ کرسکے، چند روز تک سبق اس غرض سے ملتوی رہا، کہ سوچ کر اس مقام کو حل کر لیا جائیگا۔ مگر مسئلہ بدستور حل نہ ہوا۔ انہی دنوں میں میرے استاد مکرم

جب معمول اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے روانہ ہوئے۔ اسس بار میں بھی ساتھ ہولیا۔ ارادہ یہ تھا، کہ وہاں پہنچکر کسی مناسب موقع پر حضرت شیخ جیو صاحب سے اپنی اس مشکل کا ذکر کروں گا۔ اور اگر وہ واقعی ولی کامل اور خدارسیدہ بندہ ہوئے تو وہ ضرور اس کو حل کرلیں گے۔ (آگے لکھتے ہیں) "میں جب اپنے اُستاد کے ہمراہ حاضر خدمت ہوا، تو وہ پنج شنبے کا دن تھا۔ اور حضرت شیخ جیو صاحب حسب معمول اپنے خاص مریدوں کو تصوف وسلوک کے متعلق وعظ ارشاد فرماتے تھے۔ اثنائے وعظ ہی میں میرے اور میرے اُستاد مکرم کا خیر مقدم کرتے ہوئے پھر سلسلہ وعظ و ارشاد جاری رکھا۔ آپ پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ سلوک کے مسائل بیان فرما رہے تھے۔ باتوں باتوں میں آپ نے علم کلام اور علومِ معقول کے مسائل بیان کرنے شروع کئے۔ اور پھر کلامی مسائل کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرمانے لگے۔ اور ان مسائل کے بارے میں آپ نے ایسی فصیح و بلیغ تقریر کی، کہ حاشیہ "اخون یوسف" کا وہ لاینحل مسئلہ اس سے خود بخود بڑی آسانی کے ساتھ حل ہوگیا اور آپ کی توضیح و تشریح سے میرے تمام شکوک و اشکالات دور ہوگئے۔ پھر حضرت شیخ جیو صاحب نے میری طرف متبسم ہوکر دیکھا۔ جس کا مطلب میں یہ سمجھا کہ حضرت شیخ کو میری اس پریشانی کا علم تھا۔ اور اب آپ کی اس تقریر سے وہ پریشانی دور بھی ہوگئی۔ چنانچہ حضرت شیخ صاحب کی عقیدت میرے دل میں اور بھی بڑھ گئی۔ (۲۵۵)

کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال ۞ مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

غرض حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی مشاغل و

مصروفیات کے یہ چند واقعات "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر اس غرض سے بیان کئے گئے، کہ اس سے قارئین کرام یہ اندازہ لگا سکیں کہ حضرت شیخ المشائخ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے کس قدر اعلیٰ وارفع علمی اور روحانی مقام پر فائز کیا تھا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ کامل درویشی علم کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس موقع پر حضرت شیخ دانشمند کا یہ قول ذہن میں لائیے کہ:-

"فقراء ہمہ وقت اقتدا بہ علما کنند، یعنی فقراء ہمہ وقت علمی مسائل میں علماء کی پیروی کرتے ہیں۔" (اور) "عزیز من! عالمے را باید کہ درویش باشد، و درویش را باید کہ عالم بود" (مقامات صفحہ ۲۴)۔

یعنی اے میرے عزیز! عالم کو فقیر ہونا چاہئے اور درویش کو چاہئے کہ وہ عالم ہو۔

لیکن یہ نہایت تعجب خیز بلکہ افسوسناک بات ہے کہ آجکل حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی اولاد اور ان کے معتقدین و مریدین کی نظروں سے حضرت شیخ المشائخؒ کا یہ اعلیٰ اور ارفع مقام بالکل اوجھل ہے اور وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے، کہ حضرت شیخ المشائخؒ کا علمی مقام کس قدر بلند وارفع تھا ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہوئے ہیں آستینوں میں

حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہٗ العزیز کا عام سیرت و کردار

حضرت شیخ دانشمند عبدالحلیم صاحب قدس سرہ نے حضرت شیخ المشائخ کے سیرت و کردار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

آپ نہایت راست گو، خوش خلق، مہربان، فراخ حوصلہ، کریم النفس وعدہ وفا اور نہایت شفیق تھے۔ بلا ضرورت گفتگو نہ فرماتے۔ بے مقصد کاموں سے احتراز کرتے۔ معمول یہ تھا کہ دین کی کوئی بات فرماتے، ورنہ خاموش رہتے۔ اور ذکر و فکر میں منہمک رہتے۔ سنت نبوی کے کامل متبع تھے۔ حق و صداقت اور صراطِ مستقیم پر گامزن تھے۔ ہوا و ہوس سے کوسوں دور تھے۔ آپ ہر قسم کے اخلاق فاضلہ کے مالک تھے معرفتِ الٰہی آپ کو بدرجۂ کمال حاصل تھا۔ اور اس راستہ کی تمام منزلیں طے کر چکے تھے۔ (مقامات ظلی ص ۲۱)

حزن و الم کو دوست رکھتے تھے۔ راتوں کو جاگتے اور عبادت کرتے تھے۔ دن کو ریاضت اور مجاہدہ میں مصروف رہتے۔ آپ عالم بھی تھے اور زاہد بھی، عابد بھی تھے، اور دنیا سے بیزار بھی۔ دنیا کی زینت کو ہیچ اور ناکارہ سمجھتے تھے۔ نفس کی خواہشات سے بغاوت کے خوگر تھے۔ وہ نہ صرف نفس کی ایذا رسانی کو کافی سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تصفیہ قلب اور تصفیہ کردار کے بھی عامل تھے۔ وہ دل کی صفائی اور کردار کی درستگی صرف مجاہدہ اور ریاضت سے نہیں کرتے تھے۔ فکر و تامل کے ساتھ کرتے رہتے تھے۔ اور ان کا فکر و تامل آپ کے زہد و پرہیز گاری پر مستزاد تھا۔ وہ دنیا کی آلائشوں سے اپنا دامن بچائے رکھتے۔ اور انجام و عواقب کے خوف سے لرزہ براندام رہتے۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ عمل صالح کی تربیت،

نشو ونما اور تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ہنسی اور سرور نشاط سے پرہیز کرے۔ اور حزن وملال کو حرز جان بنائے۔ اور یہ جان لے کہ ہنسی میں وہ لذت نہیں ہے جو گریہ میں ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ تقویٰ کے ارتقا اور تکمیل میں سب سے زیادہ جو چیز ممد و مددگار ثابت ہوسکتی ہے بلکہ اساسی اور بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے، وہ صرف خوفِ خدا اور خشیت الٰہی ہے۔

جناب خان خوشحال خان خٹک مرحوم نے حضرت شیخ المشائخ رحمکار قدس سرہٗ کے بارے میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے (پشتو سے ترجمہ) "کہتے ہیں کہ ابتدائے بلوغ سے حضرت شیخ جی صاحب اپنے والد گرامی حضرت شیخ بہادر قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ اول سے آخر تک (اور اس طرح) انکی عزیز عمر ضائع نہ ہوئی۔ نیز کہتے ہیں، کہ حضرت شیخ کا طریقہ اویسی تھا۔ آپ کے والد گرامی قدر کی کرامات بے شمار ہیں۔ اور ان کی وجہ شاید یہی ہے، کہ حضرت شیخ جی صاحب ان سے تولد ہوئے تھے۔ اور یہ ان کی برکت کا نتیجہ تھا"

"اور حضرت جی صاحب کی عادت یہ تھی، کہ رمز میں گفتگو فرماتے۔ اکثر خاموش رہتے۔ اور گوشہ نشین تھے۔ بات چیت نرمی اور دھیمی آواز سے کرتے نہ کہ اونچی آواز سے۔ کھلکھلا کر کبھی نہ ہنستے، بلکہ آواز نکالے بغیر کبھی ہونٹوں میں مسکرا دیتے۔ اور آپ نہایت حلیم اور بُردبار تھے۔ یہاں تک کہ اگر مچھر بھی آپ کے جسم مبارک پر آبیٹھتا، تو جب مچھر خود اُڑ جاتا تو آپ بہت آہستگی کے ساتھ وہ جگہ ہلا لیتے۔ دیکھنے اور سننے میں ملائم تھے۔ اور کبک رفتار تھے۔ دو قدم

دچلتے، تیسرا قدم ان کا نہ تھا۔ ایک مسجد کو اور ایک پھر مسجد سے
پہنچے خلوت خانے کو اور خلوت خانے میں نماز کے لئے مصلےٰ بچھا رہتا تھا،
فرض نماز مسجد میں اور نوافل خلوت خانے میں پڑھا کرتے تھے۔ اور اللہ
تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ فقیروں اور مسکینوں
کے ساتھ سخاوت کرنے کے بھوکے تھے۔ اور اس سے کبھی سیر نہ ہوئے، مسلکِ
اہل سنت والجماعت کے پابند تھے۔ اور صبح صادق سے پہلے ہی مسجد
میں تشریف لاتے، اور کبھی کبھی صبح صادق طلوع ہونے کے بعد بھی مسجد میں
آجاتے۔ اور آپ سے پہلے مسجد میں آنے والا کوئی نہ تھا۔ کبھی کبھی نماز فجر ادا
کرنے کے بعد مسجد ہی میں ٹھہر جاتے۔ علم معرفت یا تلاوتِ کلام پاک یا فقہ
یا حدیث کے مطالعہ میں مشغول رہتے۔ سورج کافی بلند ہوجانے تک مطالعہ
خاموشی سے کیا کرتے۔ اور کبھی کبھی ہونٹ بھی ہلاتے۔ اور آہستہ آہستہ
مطالعہ فرماتے۔ ظہر کی نماز کے بعد گھر تشریف لیجاتے۔ نماز عصر کے لئے پھر
مسجد میں تشریف لے آتے۔ نماز عصر اور نماز شام پڑھکر پھر نوافل
میں مشغول ہوجاتے۔ صبح صادق تک۔ اور کبھی کبھی آپ خاموش بیٹھے
ہوتے۔ اور آپ کے رفیق اور مرید ذکر میں مصروف ہوتے۔ آپ حرکت
نہ کرتے۔ جب تک زندہ رہے عبادت سے فرصت نہ پائی۔ ابتدا میں
ذکر جلی میں حرکت بھی کی ہے۔

اور ان کا یہ حال تھا، کہ اگر کوئی کوشش کرلیتا، تو اسکی ضیافت
قبول فرمالیتے۔ کبھی کبھی رہوار گھوڑے کی طرح تیز و تند چلتے۔ دوسرے
لوگ دوڑ دوڑ کر آپ کے ساتھ چلتے رہتے، ورنہ پیچھے رہ جاتے اور
چند دن کچھ بھی نہ کھاتے۔ چند دن عمرات کو نوش فرمالیتے۔ کہ ...

کے بعد دن کو بھی تناول فرمایا ہے۔ گھی بھی استعمال میں لایا کرتے تھے۔ گرمی میں نمکین پانی سے نفس کی گوشمالی کرتے رہتے آپ کا رہائشی مکان گھاس پھوس سے بنا ہوا تھا۔ آپ کے کپڑے پرانے اور کھدر کے ہوتے تھے۔ پگڑی ہلکی۔ کبھی کبھی ایک پرانی چادر اوڑھ لیتے۔ کبھی کوئی ریشمی یا سوتی کپڑا سر پر ڈال دیتے۔ چپلیاں مزری کی بنی ہوتی تھیں۔ اگر کوئی شخص نیا لباس بطور ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔ تو آپ کچھ وقت اُسے پہن لیتے بعد میں اُسے اُتار کر کسی فقیر کو دیدیتے اور اپنا پرانا لباس زیب تن فرما لیتے۔ سردیوں میں آپ کے پاؤں اکثر پھٹ جاتے۔ غرض یہ کہ اپنے آپ کو فقر کے لباس میں مخفی رکھتے۔ اور زہد و عبادت میں مشغول رہتے۔ جب تک زندہ رہے اسی حال میں رہے۔"

جناب خان خوشحال خان خٹک مرحوم نے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، تقریباً یہی باتیں آپ کے ایک اور خلیفہ اور مرید خاص جناب فقیر جمیل بیگ قدس سرہ نے بھی لکھی ہیں۔ البتہ حضرت فقیر صاحب نے یہ اضافہ بھی کیا ہے:۔

"وگاہ لون مبارکِ او زرد شدے معہ اندام ہائے مبارک، و باز بہ لون خود آمدے، حق تعالیٰ عزوجل با دوستان خود سر دارد و بجز دوستان دیگران را برآن اطلاع نیست"

یعنی "کبھی کبھی آپ کے چہرے اور تمام اعضاء کا رنگ پیلا ہو جاتا۔ اور پھر اپنی حالت پر آجاتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے ساتھ راز رکھتا ہے اور سوائے دوستوں کے دوسروں کو اس بارے میں کچھ بھی آگاہی نہیں ہوتی"

حضرت فقیر جمیل بیگ قدس سرہٗ کے اس بیان کی تصدیق مقامات قطبیہ سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت شیخ دالت مند لکھتے ہیں :۔ (ترجمہ)

ایک دفعہ حضرت شیخ قدس سرہ حالت استغراق میں تھے۔ اور ان کا وجود فنا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور اس حال میں ان کا تمام وجود سونا بن گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس ایک مرید بھی حاضر تھا۔ حضرت کی یہ حالت دیکھ کر متعجب ہوا۔ لیکن پاس ادب کی وجہ سے پوچھ نہ سکتا تھا۔ بعد میں جب حضرت شیخ اپنی اصلی حالت پر آئے تو حضرت شیخ نے رمزو ایما میں اس مرید سے فرمایا، کہ اگر اللہ نے چاہا، تو یہ حالت آپ کو بھی نصیب ہو جائیگی اور کچھ عرصہ بعد وہ مرید بھی اس مقام پر پہنچ گیا۔ اور اس سے مشرف ہوا۔

مقامات کے جس قلمی نسخے میں یہ واقعہ ذکر ہے۔ اسکے حاشیے پر یہ لکھا ہوا ہے :۔

"از معائنہ کتاب تاریخ مرصع افغانی من تالیف شریف خان محمد افضل خان مرحوم رئیس خٹک معلوم و مفہوم مے شود کہ آن مرید کہ در کتاب ہذا مذکور رفت، فقیر جمیل بیگ بود۔ کہ در خدمت حضرت شیخنا در آن وقت حاضر و بحالت مکالمت ہمراہ او مخاطبہ فرمودند۔"

تاریخ مرصع اب چھپ چکی ہے۔ اور اس میں محمد افضل خان مرحوم نے فقیر جمیل بیگ صاحب کی زبانی اس واقعے اور پھر خود فقیر صاحب کو اس حالت کے حاصل ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔ قارئین تاریخ مرصع میں بھی اس واقعے کو موجود پائیں گے۔ سچ ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ✤ ہر زمان از غیب جانے دیگر است

غرض حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ کے اخلاق حمیدہ اور کمالات باطنیہ کو دیکھ کر حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات کی تصدیق

ہوتی ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے تلاش حق کے ایک طویل سفر اور انسانی طبقات کے مختلف گروہوں کے مطالعے کے بعد کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں:۔

"مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیا ہی اللہ تعالیٰ کے راستے کے سالک ہیں۔ ان کی سیرت بہترین سیرت ہے، جن کے اسوۂ حسنہ پر چل کر روح اور قلب کو زیادہ سے زیادہ ارتقا سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے، اور صوفیا کا بتایا ہوا طریقہ ہی بہترین اور افضل ترین طریقہ ہے، جو حصول مقصد یعنی تزکیۂ قلب و روح کا بہترین وسیلہ ہے، اور صوفیا، کے جمیع حرکات و سکنات، ان کا ظاہر و باطن، ان کی صورت و سیرت، ان کے اخلاق و عادات ان کے اوضاع و اطوار، ان کے اقوال و اعمال، یہ سب مشکوٰۃ نبوت کے نور سے روشنی اور فیض پا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کوئی اور نور ایسا نہیں جس سے وہ مستفید ہو سکیں۔

حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ کا مقام

اس سلسلے میں حضرت شیخ دانشمند یہ لکھتے ہیں:۔

(ترجمہ) "اور حضرت قدس سرہٗ اللہ تعالےٰ کے خاص اولیاء اور جوانمردوں میں سے تھے۔ فرد اور قطب حقیقی تھے۔ اور قطبِ وحدت، یعنی قطب منتہی اور معشوقیت کے مرتبے پر فائز ہو چکے تھے"۔

(مقامات ص ۲۷)

"اور حضرت قدس سرہٗ علم الیقین حق الیقین اور عین الیقین میں حاملِ علم اور بہرۂ عظیم رکھتے تھے۔ اور ان مقامات کے بارے میں وافر علم کے مالک تھے۔ کیونکہ ان تمام مقامات کو انہوں نے طے کیا تھا۔ اور ان سے محظوظ ہو چکے تھے"۔ (ص ۲۸)۔

اور حضرت الیشان قدس سرہٗ قلب سلیم کے مالک تھے، اور قلب سلیم

انبیاء علیہم السلام اور خاص الخاص اولیاء اللہ کے بغیر دوسروں کا نہیں ہوتا کیونکہ یہ انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے، جسے چاہے اس نعمت سے اُس کو سرفراز فرماتا ہے۔ نیز آپ علم تکوین میں کامل مہارت رکھتے تھے۔"

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"معرفت یقینیہ صرف خواص اولیاء کا حق ہے۔ یہ لوگ بغیر کسی واسطہ کے دیدار حق سے مشرف ہوتے ہیں۔ اسکی مثال وہی ہے جو علم نبوت کی ہے۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے وَاٰتَیْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ اس علم کی کیفیت کے بارے میں اختلاف ہے، کہ آیا یہ الہام ہے یا وجدان ہے۔ بندہ نہیں جانتا کہ یہ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ نہ یہ جانتا ہے کہ یہ کہاں سے آتا ہے؟ نبی کے بارے میں تو یہ معلوم ہے کہ اس پر وحی فرشتہ کے ذریعے نازل ہوتی ہے لیکن عبد تک فرشتہ نہیں پہنچتا۔ پھر بھی ایک بات بہرحال یقینی ہے۔ وہ یہ کہ نبی اور ولی دونوں کا علم اللہ کا عطا کردہ ہے، خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی کیوں نہ ہو۔"

علم غیب اور کشف کے درمیان فرق:۔ حضرت حکیم الامت جناب مولانا تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں۔ "جاننا چاہیئے، کہ دل کی بات بتادینا یہ علم غیب نہیں بلکہ کشف ہے۔ علم غیب اسکو کہتے ہیں جو بلا واسطہ ہو۔ اور یہ خاصہ خداوندی ہے۔ اور جو علم بذریعہ کشف ہو، اس میں کشف واسطہ ہے۔ اسلئے وہ علم غیب نہیں۔" (التکشف ص۲۶)۔

"جاننا چاہیئے کہ ارباب سلوک کی اصطلاح میں بندہ کے علم کو معرفت کہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے علم کو علم سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی یہ اصطلاح

لغت کے قریب قریب ہے۔ لغت میں معرفت عبارت ہے، جزئی امور یا حالات کے جاننے سے اور علم عبارت ہے کلی امور یا حالات کے جاننے سے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم کلی اور محیط ہے، اس وجہ سے اس کے جاننے کو صوفیائے کرام علم کہتے ہیں اور بندہ خواہ کتنا ہی بڑا عالم ہو۔ اس کا علم جزئی اور محدود ہے۔ اس وجہ سے اس کے علم کو معرفت کہتے ہیں۔ اس کے جاننے کو وہ علم سے تعبیر نہیں کرتے۔ اس وجہ سے ہر انسان کو "عارف باللہ" کہتے ہیں۔ نہ کہ عالم باللہ۔ یہی حال عرف و محاورہ کا ہے، کہ خدا تعالیٰ پر عارف کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ یہ بے شک کہا جاتا ہے، کہ خدا علیم و حکیم ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ فرماتے ہیں :۔

(ترجمہ) "علم ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔ اور معرفت اس دریا کی ایک نہر یا ندی ہے۔ علم خدا کے لئے مخصوص ہے۔ اور معرفت بندہ کیلئے۔ پس کہاں خدا اور کہاں بندہ۔" (انوارالاولیاء صلا۲)

<u>اہلِ ارشاد و اہلِ تکوین</u> :۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ فرماتے ہیں۔

"جاننا چاہیے، کہ اولیاء اللہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جنکے متعلق خدمت ارشاد و ہدایت و اصلاح قلوب و تربیت نفوس و تعلیم و طرق قرب و قبول عند اللہ ہے۔ اور یہ حضرات اہل ارشاد کہلاتے ہیں۔ اور ان میں سے اپنے زمانے میں جو اکمل و افضل ہو اور اس کا فیض اتم و دائم ہو، اس کو قطب الارشاد کہتے ہیں۔ اور یہ نائب حقیقی ہوتے ہیں، حضرات انبیاء علیہم السلام کے۔ اور ان کا طرز، طرز نبوت ہوتا ہے۔

دوسرے وہ جنکے متعلق خدمت اصلاح معاش و انتظام امور دنیویہ اور دفع بلیات ہے، کہ اپنی ہمت باطنی سے باذن الٰہی ان امور کی درستی

کرتے ہیں۔ اور یہ حضرات اہل تکوین کہلاتے ہیں، جنکو ہمارے عرف میں اہل خدمت کہتے ہیں۔ اور ان میں سے جو اقوی اور اعلیٰ ہو۔ وہ دوسروں پر حاکم ہوتا ہے۔ اس کو قطب التکوین کہتے ہیں۔ اور ان کی حالت مثل حضرات ملائکہ علیہم السلام کی ہوتی ہے۔ جن کو مدبرات امر کہا گیا ہے۔ حضرت خضرؑ اسی شان کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مقام و منصب کے لئے ایسے تصرفاتِ عجیب کا ہونا لازم ہے۔ بخلاف اہل ارشاد کے، کہ ان کا صاحب خوارق ہونا بھی ضروری نہیں۔ البتہ ان حضرات کے کرامات اور طرح کے ہوتے ہیں۔ کہ اس کا ادراک عوام کو نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ امور ذوقی و وجدانی ہیں۔ کہ اکثر اوقات ان کی صحبت و خدمت سے جو شخص مستفید ہوتا ہے، اسکو معلوم ہوتا ہے۔ باقی یہ کہ نفع اہل ارشاد سے ہوتا ہے تو اہل تکوین کے کمالات بیان کرنے کا کیا فائدہ؟ تو اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک علمی اور دوسرا عملی۔ علمی یہ کہ ایک کام کی بات معلوم ہو جائے تاکہ علم ناقص نہ رہے۔ عملی یہ کہ اگر ایسے لوگ ظاہری صورت سے خستہ حال، شکستہ بال ذلیل و خوار معلوم ہوتے ہیں۔ تو جب یہ مسئلہ معلوم ہوگا۔ تو مساکین کی توہین و تحقیر نہ کی جائیگی۔ (التکشف ص۹۲)

خوارق و کرامات

حضرت شیخ المشائخ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے چند ایک کرامات بیان کرنے سے پہلے حضرت حکیم الامت جناب مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے چند ملفوظات دربارۂ کرامات و خوارق بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

تحقیق متعلق کرامت: ۔ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں: "جاننا چاہیئے کہ خلاصہ کلام محققین کا اس بارے میں یہ ہے۔ کہ کرامت اس امر کو کہتے ہیں۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی تابع متبع سے ۔۔۔۔

قانون عادت سے خارج ہو۔ پس اگر وہ امر خلاف عادت نہ ہو، تو وہ کرامت نہیں ہے۔ اور جس شخص سے وہ امر صادر ہوتا ہے۔ اگر وہ خود کو کسی نبی کا متبع نہیں کہتا، وہ بھی کرامت نہیں۔ جیسے جوگیوں ساحروں وغیرہم سے بعض امور ایسے سرزد ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ شخص مدعی اتباع کا تو ہے، مگر واقع میں متبع نہیں ہے۔ خواہ اصول میں خلاف کرتا ہو، جس طرح اہل بدعت، یا فروع میں جس طرح فاسق فاجر۔ اس سے بھی اگر ایسا امر صادر ہو، وہ بھی کرامت نہیں ہے، بلکہ استدراج ہے جس کا ضرر یہ ہے، کہ یہ شخص بوجہ خرق عادت اپنے آپ کو کامل سمجھتا ہے۔ اور اس دعوے کے بیں کبھی بھی حق کے طلب کرنے اور اتباع کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نعوذ باللہ کس قدر خسرانِ عظیم ہے۔"

"پس کرامت اس وقت کہلائے گی۔ جب اس کا محل صدور مومن متبع سنت، کامل التقویٰ ہو۔ اب ہمارے زمانے میں جس شخص سے کوئی فعل عجیب، سرزد ہوتا ہے، اس کو غوث و قطب قرار دیتے ہیں خواہ اس شخص کے عقائد کیسے ہی ہوں، اور اس کے اعمال و اخلاق کیسے ہوں یہ بہت بڑی غلطی ہے، بزرگوں نے تصریح کی ہے، کہ اگر کسی شخص کو ہوا میں کبھی اُڑتا ہوا یا پانی پر چلتا ہوا دیکھو، مگر وہ شریعت کا پابند نہ ہو، اس کو بالکل ہیچ سمجھو۔"

اور جاننا چاہیئے کہ ایک اور اعتبار سے کرامت کی دو قسمیں ہیں، ایک حسی دوسری معنوی، عوام اکثر حسی کو جانتے ہیں، اور اس کو کمال شمار کرتے ہیں، جیسے مافی الضمیر پر مطلع ہونا، پانی پر چلنا، ہوا میں اُڑنا وغیرہ۔ اور خواص کے نزدیک بڑا کمال کرامت معنوی ہے، یعنی

شریعت پر مستقیم ہونا۔ مکارم اخلاق کا خوگر ہونا نیک کاموں کا پابندی اور بے تکلفی سے صادر ہوجانا۔ حسد، کینہ وغیرہ صفات مذمومہ سے قلب کا پاک ہوجانا۔ کوئی سانس غفلت میں نہ گزرجانا۔ یہ وہ کرامت ہے جس میں استدراج کا احتمال نہیں۔ بخلاف قسم اول کے، کہ اس میں یہ احتمال موجود ہے۔ اس واسطے کاملین صدور کرامت کے وقت بہت ڈرتے ہیں۔ کہ یہ استدراج نہ ہو۔ یا خدانخواستہ اس سے نفس میں عُجب پیدا نہ ہوجائے۔ یا اس کی وجہ سے عوام میں شہرت وامتیاز پیدا ہوکر باعث ہلاکت نہ ہو۔ بلکہ بعض نے تو یہ فرمایا ہے کہ بعض اولیاء نے مرتے وقت تمنا کی ہے۔ کہ کاش دُنیا میں ہم سے کرامت صادر نہ ہوتی، تاکہ اس کا بدلہ بھی آخرت میں مل جاتا۔ کیونکہ یہ امر مقرر ہے، کہ جس قدر دُنیا میں کسی کو کسی نعمت میں کمی ہوگی اس کا بدلہ آخرت میں عنایت ہوگا۔"

"اور جاننا چاہیئے کہ بعض علماء نے کرامت کی قدرت کی ایک خاص حد مقرر کی ہے، اور جو امور نہایت عظیم ہیں۔ جیسے بدون والدین اولاد کا پیدا ہونا۔ یا کسی جماد کا حیوان بن جانا۔ یا ملائکہ کا باتیں کرنا۔ اس کا صدور کرامت سے ممتنع فرمایا ہے، مگر محققین کے نزدیک کوئی حد نہیں۔ کیونکہ وہ فعل پیدا کیا ہوا اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ صرف ولی کے ہاتھ پر اس کا ظہور ہوا ہے واسطے اظہار کرامت وقرب مقبولیت اس ولی کے۔ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جب کوئی حد نہیں پھر کرامت کیسے محدود ہوسکتی ہے؟ رہا یہ شبہ کہ معجزے کے ساتھ مساوات لازم آنے کا احتمال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے، کہ جب صاحب کرامت خود کہتا ہے کہ میں نبی کا غلام ہوں۔ تو جو کچھ اس سے ظاہر ہوا ہے، بہ تبعیت اس نبی کے ہے، استقلالاً نہیں جو اس شبہ کی گنجائش ہو۔ البتہ جس

خرق عادت کی نسبت نبی کا ارشاد ہو کہ اس کا صدور مطلق محال ہے، وہ بطور کرامت کے سرزد نہیں ہو سکتے۔ جیسے قرآن مجید کا مثل لانا۔"

"اور جاننا چاہیئے کہ بعض اولیائے کاملین کا مقام غلبہ عبودیت و رضا کا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کسی شے میں تصرف نہیں کرتے۔ اس وجہ سے انکی کرامتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ اور بعض کو قوت تصرف ہی نہیں ہوتی۔ تسلیم و تفویض ہی ان کی کرامت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ولایت کے لئے کرامت کا وجود یا ظہور ضروری نہیں ہے"۔

اور جاننا چاہیئے، بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفا واجب ہے۔ مگر جہاں اظہار کی ضرورت ہو۔ یا غیب سے اذن ہو۔ یا حالت اس قدر غالب ہو، کہ اس میں قصد و اختیار باقی نہ رہے۔ یا کسی طالب حق یا مرید کے یقین کا قوی کرنا مقصود ہو۔ وہاں اظہار جائز ہے"۔

"اور جاننا چاہیئے، بعض اولیاء اللہ سے بعد انتقال کے بھی تصرفات و خوارق سرزد ہوتے ہیں۔ اور یہ امر معناً اور حد تواتر تک پہنچ چکا ہے۔ (التکشف ص۱۱۰)

حضرت حکیم الامت جناب مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے ان ارشادات دربارہ کرامت کی روشنی میں اگر حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کے علمی مشاغل و مصروفیات، اہل علم و سلوک کی گرہ کشائی، مریدین و مخلصین کی تربیت اور اس طرح کی دوسری باتوں کو مدنظر رکھا جائے، تو یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے، کہ آپ اپنے عصر کے قطب الارشاد تھے۔ اور آپ کی کرامات سب کی سب معنوی تھیں۔ جہاں تک آپ کے ان معنوی کرامات کا تعلق ہے۔ اس سے

آپ کی کیمیا نظری اور مسیحائی کھل کر سامنے آتی ہے۔ مثلاً جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ آپ مریدین و مخلصین کے تزکیہ اور تصفیۂ قلب کے لئے اوراد و وظائف اور ریاضات و مجاہدات کے مروجہ طریقوں سے بہت کم کام لیا کرتے تھے۔ پس جس خوش نصیب پر ایک نظر ڈال دی، اسکی کایا پلٹ گئی۔ اس سلسلے میں بطور تبرک صرف چند ایک واقعات حضرت شیخ دانشمند کی کتاب "مقامات قطبیہ" سے ماخوذ ہیں۔ ان مناقبات کے بارے میں حضرت شیخ خود لکھتے ہیں :- (ترجمہ)

"حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ کے بارے میں میں نے جو منقبت اور صفت بھی اس کتاب میں لکھی ہے۔ وہ حضرت کے حالات و اشارات میں سے صرف ایک رمز و اشارہ ہے۔ ورنہ حضرت شیخ قدس سرہ کے اسرار و معانی بلانہایت اور بلا غایت ہیں۔ اور حضرت کے اسرار و رموز کے خزانے اس قدر بے حساب ہیں، کہ لکھنے میں نہیں آسکتے۔ اور کتابوں میں نہیں سما سکتے۔ لہذا میں نے اختصار سے کام لیا ہے۔" (مقامات ص۱۶۷)

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی تاثیر توجہ کے چند واقعات

آنچہ زر مے شود از پرتو آن قلب سیاہ
کیمیائیست کہ در صحبت درویشان است

۱- ایک دن حضرت شیخ المشائخ وضو فرما رہے تھے۔ ایک مرید بھی پاس کھڑا تھا۔ وضو سے فارغ ہوجانے کے بعد حضرت شیخ صاحب نے اس مرید سے فرمایا، کہ کوزے میں جو پانی بچا ہے، یہ میں نے تم کو بخش دیا ہے۔ اس سے وضو کرلو۔ مگر مرید پاس ادب کی وجہ سے کوزے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ حضرت شیخ صاحب نے اسکا ہاتھ پکڑ کر کہا، کہ میری خواہش ہے کہ تم اس پانی سے وضو کرو۔ چنانچہ اس

مرید نے اس پانی سے وضو کیا۔ وہ مرید کہتا ہے، کہ جب میں نے وہ پانی ہاتھ پر ڈالا، تو میں نے اپنے اندر فوراً ایک باطنی ترقی محسوس کی۔ اور وضو ختم کرنے کے بعد تو اطاعتِ خداوندی کی محبت میرے دل میں اس قدر بڑھ گئی، کہ قیام سے رکوع اور رکوع سے سجود کی طرف جانا ضرورت شرعی کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ قیام و رکوع و سجود کے بغیر تو نماز ہو ہی نہیں سکتی ورنہ میری محبت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں چاہتا تھا کہ تمام عمر قیام میں رہوں یا رکوع میں اپنی عمر صرف کروں۔ یا ایک سجدے میں پڑا رہوں۔ اس کے بعد کبھی بھی اطاعت خداوندی میں مجھ سے سستی اور کاہلی پیدا نہ ہوئی۔ اور میں روز و شب عبادت خداوندی میں مشغول رہتا۔ اور مدتوں تک اس شغف و انہماک کے ساتھ عبادت کرتا رہا تا آنکہ میں اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

آمدہ بودم بتو چوں سائلے ✢ از درِ دولت چو سلطان میرم

۲۔ حضرت شیخ دریا خان صاحب، جو آپ کے خلیفہ خاص تھے، کہتے ہیں کہ میں اپنے قصبے کا رئیس تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باطنی طور پر مجھ پر ظہور فرمایا۔ ان کی اس مہربانی اور توجہ کی وجہ سے مدتوں تک میری یہ حالت رہی کہ نماز و عبادت کے بغیر میرا اور کوئی کام نہ تھا۔ اور تلاوت کلام پاک اور درود شریف پڑھنے میں مشغول رہتا۔ کچھ مدت کے بعد باطنی طور پر میری ملاقات سید آدم بنوری قدس سرہ سے ہوئی۔ میں نے چاہا کہ باہم قوت آزمائی کریں۔ انہوں نے فرمایا، کہ پہلے آپ مجھ پر قوت آزمائیں میں نے کہا نہیں پہلے آپ قوت آزمائیں۔ چنانچہ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ مجھ پر غالب آگئے۔ اس کے بعد میں ان کی خدمت میں آیا انہوں نے میری تربیت شروع کی۔ اور پھر خلافت کا اذن فرمایا۔

مقصد یہ تھا کہ دُنیا کی محبت میرے دل سے بالکل نکل جائے، اور قلب
کو یکسوئی حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ حالت ان کی مجلس میں ہاتھ نہ آتی تھی۔
ایک دن خود انہوں نے مجھ سے فرمایا، اے شیخ دریا! شیخ رحمکار کو
دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا، سُنا تو ہے کہ ایک فقیر پہاڑوں میں رہتا ہے
مگر دیکھا نہیں ہے۔ اس کے بعد میں حضرت بنوری سے رخصت ہو کر وطن
واپس آیا۔ اور جب گھر پہنچا تو ایک دن حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ نے
باطنی طور پر مجھ پر ظہور فرمایا۔ اُن کے سامنے میری کوئی حیثیت نہ تھی۔
میں نے ادب کے طور پر اُن کے جوتوں کو اُن کے سامنے رکھا۔ اور مجھے
معلوم ہوا کہ رفعت و بلندی میں ان کا مرتبہ آسمان کی طرح ہے اور پستی میں
میرا مرتبہ زمین کی طرح ہے۔ اس کے بعد ان کی زیارت و ملاقات کا شوق
میرے دل میں پیدا ہوا۔ اور میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پہلی
ملاقات میں میری محبت بڑھ گئی۔ جب اس طرح چند بار آنا جانا ہوا،
تو حضرت نے مجھے کم خوراکی کا وظیفہ دیا۔ اس دوران میں ایک دن میں حضرت
کی خدمت میں حاضر ہوا، تو حضرت شیخ صاحب نے مجھے گھر جانے کی اجازت دی۔
جب میں گھر جانے لگا تو یوسف خیل نامی گاؤں میں مجھے رات بسر کرنی
پڑی۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ منبر پر کھڑا ہوں اور خطبہ پڑھ رہا
ہوں اور گھومتا جاتا ہوں۔ اچانک ایک شخص میرے سامنے آیا اور کہا۔
پیا تو شیخ رحمکارؒ کا خطبہ ہے۔ اس کے درجے کو تو نہیں پہنچ سکتا جس قدر
کہ تیرا مقصد ہے، بس اتنا ہی پڑھ لو۔ جب میں خواب سے بیدار ہوا تو میرے
دل سے دُنیا کی محبت زائل ہو چکی تھی۔ اور اس کے بعد سونا چاندی اور مٹی
میری نظر میں یکساں تھے۔ میں نے نفس پر قناعت اور گلیم پوشی اختیار کی۔

لیکن حضرت شیخ صاحب نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ تمہارے لئے قبا پہننا مناسب ہے، حضرت کے ارشاد کے مطابق میں نے قبا پوشی تو اختیار کی، لیکن دل میں یہ بات پسند نہ تھی۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت شیخ صاحب کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہ تھا۔"

۳۔ حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب اپنے اُستاد سے نقل فرماتے ہیں، کہ ایک روز حضرت الیشان اپنی اہلیہ سے گھر میں مصروف گفتگو تھے اور متبسم تھے۔ اہلیہ صاحبہ نے ان سے گزارش کی، کہ آپ کی نظر فیض اثر سے اطراف و جوانب کے بے شمار لوگ فیض یار ہے ہیں، مگر آپ کے فرزند ابھی تک اس فیض سے محروم ہیں۔ اگر ان کی طرف بھی توجہ فرمائی جائے تو میرے دل کی پریشانی اور تفکر دور ہو جائیگا۔ حضرت شیخ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ ہر درخت اپنے وقت پر پھل پھول لاتا ہے" جلدی نہ کیجئے۔ مگر آپ کی اہلیہ صاحبہ اپنے بیٹوں سے فطری محبت کی وجہ سے بار بار یہی گزارش کرتی رہیں، کہ اگر ان کی طرف بھی ایک نظر توجہ کی ہو جائے تو بعید از نوازش نہ ہو گی۔ اور میرے دل سے اضطراب دور ہو جائے گا۔

چنانچہ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے فرمایا۔ کہ اچھا کل جس وقت میں صبح مسجد سے نکل کر گھر آ رہا ہوں، اس وقت بچوں کو میرے راستے میں کھڑا کر دینا۔ اور پھر دیکھئے کہ خدا کو کیا منظور ہے۔ چنانچہ دوسرے دن صبح کے وقت آپ کی اہلیہ صاحبہ نے اپنے صاحبزادوں کو خادم کے ہمراہ بھیج دیا۔ اور ان کو مسجد کے راستے میں کھڑا کر دیا۔ حضرت نے جب اشراق کی نماز پڑھی۔ اور مسجد سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو نظر نیچے کئے رکھی لیکن اس اثنا میں بچے کہیں ادھر اُدھر ہو چکے تھے حضرت شیخ جی صاحب [illegible] ادھر ہی کی طرف دیکھنا چاہا تو وہاں صاحب [illegible] موجود

دتھے۔ اور نظرِ مبارک ایک سیاہ کتے پر پڑی۔ جو وہاں موجود تھا نظر پڑتے ہی کتا بے ہوش ہوگیا۔ اور پانچ دن رات بیہوش پڑا رہا۔ اور اُس کے بعد جب ہوش میں آیا۔ تو پھر حضرت شیخ صاحب کے مکان سے ذرا فاصلے پر ایک غار بناکر اس میں رہنے لگا۔ ہر صبح و شام دیہات سے بے شمار کتے آتے اور حلقہ بناکر خاموش دوزانو ہوکر بیٹھ جاتے۔ اور اپنی زبان میں یادِ خدا کرتے۔ اور خود وہ کتا زمین پر سر رکھے ہوئے خاموش پڑا رہتا۔ گویا کہ مراقبہ میں ہے۔ اور بعض کتے ایسے مست اور بے خود ہوجاتے کہ لوٹتے پوٹتے اور ان کو خبر تک نہ ہوتی۔ اور بہت سے لوگ ان کتوں کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آتے۔ اور عبرت حاصل کرتے۔ وہ کتا جب تک زندہ رہا۔ اسکی یہی حالت رہی۔ اور یہ حضرت شیخ جی صاحب کی کیمیا نظری کی برکت تھی ؎

سگِ اصحاب کہف روزے چند
پےٴ نیکان گرفت مردم شُد

اس واقعے سے دو باتوں کا پتہ لگتا ہے۔ ایک یہ کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے جب یہ فرمایا کہ "ہر درخت اپنے وقت پر پھل پھول لاتا ہے"۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے صاحب زادے اپنے وقت پر ان سے فیض یاب ہونگے۔ کیونکہ اہلیت اور استعداد تو ان میں موجود تھی مگر ہر کام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور وقت پر موقوف ہوتا ہے لیکن چونکہ والدہ کو اپنے بیٹوں سے والہانہ محبت ہوتی ہے۔ اس لئے اپنی اہلیہ محترمہ کے اصرار پر فرمایا کہ اچھا جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوجائیگا۔

دوسری بات اس سے یہ ظاہر ہوتی ہے۔ کہ کیمیا نظر اولیاء اللہ کی تاثیر نظر سے جانور بھی متأثر ہوتے ہیں۔ اور ان کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ ایسے واقعات دوسرے اولیاء اللہ سے بھی سرزد ہوچکے ہیں۔ اور ان کی صداقت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ جو لوگ محض عناد اور ہٹ دھرمی کے باعث ایسے واقعات سے انکار کرتے

ہیں، اس کا تو کوئی علاج نہیں۔

اس قسم کے چند ایک واقعات جو دوسرے اولیاء اللہ سے سرزد ہو چکے ہیں، میں جناب مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل (ممبر اسلامی نظریاتی کونسل) کی کتاب تذکرہ شیخ رحمکارؒ سے یہاں بصد شکریہ نقل کرتا ہوں جن سے معلوم ہو جائیگا کہ کیسے نظر اولیاء اللہ کی تاثیر نظر سے جانور بھی محروم نہیں رہتے۔

پہلا واقعہ :- مفتی صاحب لکھتے ہیں: حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے "امداد المشتاق الی اشرف الاخلاق" میں اس نوعیت کے دو واقعے لکھے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں (پہلا ملفوظ نمبر ۲۸۸) فرمایا حضرت حاجی صاحب[1] رحمۃ اللہ علیہ نے، حضرت جنید بغدادیؒ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس قدر صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب کتوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ کر مراقبہ کیا۔ اس واقعہ کو حضرت حاجی صاحب کی زبان مبارک سے نقل کرنے کے بعد حسب معمول حکیم الامت نے حاشیہ کا عنوان دیکر اسکی توضیح و تشریح یوں کی ہے:۔ قولہ "اس قدر صاحب کمال ہو گیا" اقول کمال خاص مراد ہے نہ کہ کمال مطلق (ص ۲۰)

(دوسرا ملفوظ ص ۳۶) میں نے (حضرت تھانوی نے) خود حضرت حاجی صاحب سے سنا ہے کہ ایک بزرگ مشغول بحق بیٹھے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا اتفاقاً اُس پر نظر پڑی۔ اس بزرگ کی یہ کرامت ظاہر ہوئی۔ اور اس نگاہ کا یہ اثر اُس کتے پر ہوا کہ جہاں کہیں وہ جاتا تھا دوسرے کتے اس کے پیچھے ہو لیتے تھے۔ اور جہاں وہ بیٹھتا، دوسرے کتے حلقہ باندھکر ارد گرد بیٹھ جاتے تھے۔ پھر ہنس کر فرمایا کہ کتوں کے لیے شیخ بن گیا۔ اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد حضرت تھانوی صاحب نے ... بزرگوں کا عجب اثر ہوتا ہے۔ اور عجب برکت ہوتی ہے ... پھر انہوں نے ایک

[1] حاجی صاحب سے مراد حضرت امداد اللہ مہاجر مکی ہیں ... حضرت مولانا ...

بزرگ کا اس قسم کا واقعہ لکھکر فرمایا ہے۔ دیکھئے جن کے فیوض جانوروں پر بھی ہوں۔ ان سے انسان کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ ہرگز مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ ہاں دُھن ہونی چاہیئے۔ چاہے تھوڑی بھی ہو۔ اصحاب کہف کی برکت سے اُن کا کتا تک ایسا شرف ہوا کہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا۔ جس کو قیامت تک نمازوں میں پڑھا جائیگا۔ جب حق تعالیٰ کی عنایت کتے پر اس قدر ہوئی تو ہم پر کیوں نہ ہوگی۔ (امداد المشتاق صـ۱۵۲ بحوالہ تذکرہ رحمکار)۔

نفحات الانس میں حضرت مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ شیخ نجم الدین کبریٰ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"وے را شیخ ولی تراش مے گفتہ اند۔ بر حسب آنکہ در غلبات وجد نظر مبارکش بر ہر کہ افتادے بر مرتبۂ ولایت رسیدے"

یعنی اُنکو شیخ ولی تراش (ولی بنانے والا) بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ غلبۂ وجد میں آپ کی نظر مبارک جس پر بھی پڑجاتی وہ ولایت کے مرتبے پر فائز ہوجاتا"

پھر اس قسم کے دو تین واقعات ذکر کرنے کے بعد مولانا جامیؒ لکھتے ہیں۔

ایک دن آپ کی مجلس میں اصحاب کہف کی تحقیق ہو رہی تھی۔ آپ کے مریدانِ باا خلاص میں سے ایک مرید سعد الدین حمویہ بھی تھے۔ اس وقت ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ آیا اس وقت بھی کوئی ایسا نیک بخت شخص ہے، جس کی صحبت نیک کتے میں بھی اپنا اثر دکھائے۔ شیخ نے نورِ فراست سے اِس خیال کو معلوم کیا۔ اور مجلس سے اُٹھ کر خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں وہاں ایک کتا آیا۔ اور دُم ہلانے لگا۔ شیخ نے اُس کی طرف دیکھا۔ نظر پڑتے ہی کتا بے خود و متحیر ہوگیا۔ اور شہر کی طرف سے منہ موڑ کر قبرستان کی طرف [illegible] اور زمین کے ساتھ [illegible]

چنانچہ نقل کرتے ہیں کہ وہ کتا جہاں بھی جاتا بچاس ساٹھ کتے اس کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے، نہ بھونکتے، نہ کچھ کھاتے، آخر وہ کتا اسی حالت میں مرگیا۔
(نفحات الانس ص۶۲۲ بحوالہ تذکرہ رحمکارؒ)

صاحب خزینۃ الاولیاء نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے، اور ساتھ ہی مولانا رومؒ کی طرف منسوب کرکے یہ شعر بھی لکھا ہے ؎

یک نظر فرما کہ مستغنی شوم زابنائے جنس
سگ چو شد منظور نجم الدین سگان راسر در است

۴۔ تحریک روشنائیہ کے قائدین کمال خان (کمال الدین) اور عبدالقادر کی سرکردگی میں، پشتون قبائل کی اکثریت مغلوں کے برخلاف متحد ہوچکے تھے، اور انہوں نے پشاور کا محاصرہ کرلیا تھا۔ یہ وقت مغل حکومت اور مغل حکومت کے طرفدار پشتون قبائل کیلئے نہایت نازک اور خطرناک تھا۔ شہباز خان رئیس خٹک جو مغلوں کا جاگیردار اور طرفدار تھا، نہایت خطرہ محسوس کر رہا تھا اس لئے اُس نے اپنا سامان اٹک پار بھیج دیا تھا۔ اور خود بھی اہل و عیال سمیت خیرآباد میں مقیم تھا۔ تاکہ خطرہ کے وقت دریا پار جاسکے۔ اسی اثناء میں اس کو حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ خیرآباد میں تین دن تک ٹھہرے رہو۔ اگرچہ خیرآباد میں ٹھہرنا بظاہر شہباز خان کیلئے خطرناک تھا۔ اور اسے اپنے ہمراہیوں اور رشتہ داروں نے پار جانے کیلئے مجبور بھی کیا، مگر چونکہ شہباز خان حضرت رحمکارؒ کا مخلص مرید تھا۔ لہذا بمصداق ؎

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

وہ تمام [illegible] کے برخلاف خیرآباد میں ٹھہرا رہا۔

اب جن پشتون قبائل نے پشاور کا محاصرہ کیا تھا ان میں پھوٹ پڑ گئی اور عبدالقادر قائد لشکر راتوں رات تیراہ چلا گیا۔ اسی اثنا میں مغلوں کو سکنہ اور کشمیر کی طرف سے تازہ کمک بھی پہنچ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے پشتون قبائل کے لشکر پر اچانک حملہ کیا۔ اور ان کو بہت نقصان پہنچایا اور اس طرح سے مغلوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اور اس کے نتیجے میں سہباز خان کی عزت و احترام مغل حکومت میں اور بھی بڑھ گیا۔ اور اسے کچھ نقصان بھی نہ پہنچا۔ اور یہ سب کچھ حضرت شیخ رحمکارؒ کی توجہ اور دعا کی برکت تھی

نواب بہادر خان باتل زئی داؤد زئی

نواب بہادر خان ایک ہندوستانی پشتون، شاہجہان کا ایک اعلیٰ منصبدار اور خان خوشحال خان خٹک مرحوم کا دوست تھا۔ اور حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کا مخلص مرید تھا۔ اسی بہادر خان کا بیان ہے کہ :۔

بلخ و بدخشان کی مہم میں دریائے آمو کے کنارے ایک لڑائی میں میں نہایت خطرناک حالات سے دوچار ہوا تھا۔ میں دشمنوں کے نرغے میں آ گیا تھا خود میرے سر سے گر چکا تھا۔ اور نیزے تانے ہوئے دشمن میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اتنے میں بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ یا شیخ رحمکار توجہ کیجئے۔ مدد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے بچشم خود دیکھا کہ حضرت شیخ رحمکار نے اپنے دست مبارک سے خود میرے سر پہ رکھا۔ اور مجھے دشمنوں کے نرغے سے صاف نکال لایا۔ اور مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی کہ میں نے دشمنوں کو بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ اور کئی ایک کا صفایا بھی کر دیا۔

اس مہم کے دوران میں بہادر خان نے شجاعت کے کئی کارنامے دکھائے تھے۔ مگر چند [illegible] مغل منصبدار اس کے مخالف تھے اسلئے [illegible]

نے بہادر خان کے خلاف بادشاہ شاہجہان کے کان بھر لیئے۔ اور اس کو یہ پٹی پڑھائی کہ اگر بہادر خان دریائے آمو کی لڑائی میں سستی نہ کرتا، تو نذر محمد والئی بلخ و بدخشان گرفتار ہو جاتا۔ چنانچہ شاہ جہان نے حاسدوں کی باتوں پر یقین کر کے بہادر خان کی جاگیر سے "کابی" کا زرخیز علاقہ نکال لیا۔ اس سے بہادر خان کو سخت رنج پہنچا۔ کیونکہ بہادر خان ایام شہزادگی سے شاہجہان کا ملازم تھا۔ اور اس کا اس حد تک وفادار تھا کہ جب خان جہان لودھی کی بغاوت کے سلسلے میں اکثر پشتون امراء شاہ جہان کی فوج سے بھاگ کر محض قومی عصبیت کی خاطر خان جہان لودھی سے مل گئے تھے، ان امراء میں بہادر خان کا والد دریا خان بھی شامل تھا مگر بہادر خان شاہ جہان کا اس حد تک وفادار تھا کہ وہ اس بغاوت کے دوران شاہ جہان کا وفادار رہا۔ اور خان جہان لودھی کا ساتھ نہ دیا۔ مگر شاہ جہان نے اسکی وفاداری پر بے اعتمادی ظاہر کر کے اس کو حد درجہ آزردہ کیا۔ اور اس کا یہ صلہ دیا، کہ اُسکو جاگیر کے ایک بڑے حصے سے محروم کر دیا۔ سچ ہے۔ ع

نازک مزاج شاہان تاب سخن ندارد

٦۔ اسی بہادر خان کا واقعہ ہے کہ اگلے سال اسے مہم قندھار پر بھیجا گیا۔ بہادر خان نے جب اٹک پار کیا۔ تو خوشحال خان خٹک نے اس کا استقبال کیا۔ اور پھر اس کی معیت میں حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہادر خان شاہ جہان کی اس بے انصافی پر اس قدر دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ اس کے دل میں بغاوت کے جذبات [illegible] رہے تھے۔ چنانچہ اس نے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ سے

خروج کی اجازت طلب کی۔ اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت شیخ نے اس سے دریافت کیا، کہ جب تم ارشاد سے گفتگو کرتے ہو، تو تمہاری نظریں نیچے ہوتی ہیں یا اوپر؟ بہادر خان نے جواب دیا کہ نیچے۔ حضرت نے اس سے کہا کہ اچھا اس معاملے کے بارے میں پھر گفتگو کریں گے۔ اس موقع پر بہادر خان نے تین ہزار روپے خانقاہ کے اخراجات کے لئے بطور نذر پیش کئے۔ بہادر خان جب قندھار کی مہم میں شامل ہوا، تو وہ اس مہم کے دوران فوت ہو گیا۔

اس موقع پر جب ہم حضرت شیخ قدس سرہ کے اس رمز پر غور کرتے ہیں، تو اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت نے اُسے حق نمک کا پاس رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ اور چونکہ حضرت کو بذریعہ کشف معلوم ہو چکا تھا، کہ بہادر خان کی موت اس مہم کے دوران واقع ہو گی، اسلئے اسے خروج کی اجازت نہ دی۔ اور رمز و اشارے میں اس کو اس کام سے منع فرمایا۔

حضرت شیخ دانشمند آپ کی کیمیا نظری کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ترجمہ

حضرت شیخ قدس سرہ ایسے کیمیا نظر تھے، کہ جس شخص پر بھی آپ کی مبارک نظر پڑتی۔ اسکی باطنی حالت بدل جاتی۔ اور اگر وہ ناخواندہ بھی ہوتا تو اس کو ایسا علم حاصل ہو جاتا۔ کہ لوگ اس کے کلام سے حیران و متعجب ہو جاتے۔ اور علماء دلائل کے زور سے اُسے زیر نہ کر سکتے۔ اور بے علم ہونے کے باوجود بھی شریعت پر پورے طور پر عمل کرنے لگ جاتا۔ اور طریقت بھی جاننے لگ جاتا اور معرفت و طریقت کو باحسن طریقے بیان کرنے کی قابلیت حاصل کر لیتا۔ ۵

بر ہر کہ نگندی نظرے مست و خراب است
در ساغر چشم تو ندانم چہ شراب است

ایک شخص حضرت آپ کی خدمت میں حاضر ہوا [illegible]

درخواست کی۔ چند دن گذرنے کے بعد جب یہ شخص حضرت سے رخصت ہوکر وطن جانے لگا۔ تو راستے میں شب باشی کیلئے ایک جگہ ٹھہر گیا۔ رات کے وقت اس پر ایسی حالت طاری ہوئی۔ کہ دُنیا اور زن و فرزند کی محبت اس کے دل سے بالکل محو ہو گئی۔ صبح وہ شخص دوبارہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے اس سے فرمایا کہ جب تم یہاں سے چل پڑے تو میری یاد سے نہیں نکلے تھے۔ اس شخص نے عرض کیا، کہ یا حضرت میں تو بہت ڈرتا ہوں کہیں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔ حضرت شیخ نے اُسے تسلی دی۔ کہ فکر نہ کرنا، کوئی خطرہ نہیں۔ مگر وہ شخص بدستور بار بار یہی کہتا رہا۔ آخر حضرت شیخ قدس سرہٗ نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر پھیرا۔ اور اُس کی وہ کیفیت یکدم غائب ہوگئی اب اس شخص کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ تو ایک بہت بڑی نعمت تھی۔ جو میں نے اپنی بے وقوفی کی وجہ سے ضائع کی۔ بہت نادم و پریشان ہُوا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اسے اتنا فائدہ ضرور ہُوا۔ کہ نماز باجماعت پڑھتا۔ باقاعدہ تلاوت کرتا۔ اور خلاف شرع کاموں سے اجتناب کرتا۔ البتہ وہ پہلی سی کیفیت اسے دوبارہ حاصل نہ ہوئی۔

۸۔ فتح نام ایک شخص جو بالکل ناخواندہ تھا۔ آپ کے زمانہ حیات میں آپ کی خدمت میں اکثر حاضر ہُوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے اس کے بارے میں فرمایا۔ "یہ شخص طالب مولیٰ ہے"۔ یہ بات جب اس نے سنی، تو دل میں بہت شرمندہ ہُوا۔ کہ میں تو اپنے اندر اس بارے میں کچھ نہیں پاتا۔ پھر بھی حضرت شیخ صاحب نے میرے بارے میں یہ فرمایا۔

کچھ مدت بعد جب حضرت شیخ رحلت فرما چکے تو وفات کے تیسرے روز بالکم ... حضرت شیخ نے باطنی طور پر اس پہ ظہور فرمایا۔ اور اس پر توجہ

اور مہربانی فرمائی۔ اس کے بعد اس کی حالت بدلنے لگی۔ حضرت نے بارہ تیرہ کوس کے فاصلے پر اسے ایک مقام پر جانے کی ہدایت کی۔ وہاں جاکر وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ لیکن اسکے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ کہ کہیں یہ شیطانی دھوکہ نہ ہو۔ اس بات پر وہ بہت ملول و رنجیدہ رہتا تھا۔ پس حضرت شیخ نے اس پر دوبارہ ظہور فرمایا۔ اور اُسے کہا، اس شخص کی برابری کون کرسکتا ہے، جس کا وکیل و کفیل خود اللہ تعالیٰ بن جائے۔ پس اس کے دل سے وہ تمام شکوک اور خدشات دور ہوگئے۔ اور کم وبیش سات سال تک اس کُنج تنہائی میں رہا۔ وہ ہمیشہ بیمار رہتا۔ وہ شخص نقل کرتا تھا کہ اس بیماری کے دوران میری حالت ایک بچے کی طرح تھی۔ کہ پیدا ہوجانے کے بعد اول اول لیٹا رہتا ہے، پھر بیٹھنے لگ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ چلنے لگتا ہے۔ میں بھی بچے کی طرح مختلف احوال طے کرتا رہا۔ سات سال کے اس عرصے میں تین سال تک مجھ پر غلبہ حال تھا۔ اور حضرت شیخ ہمیشہ مجھ پر توجہ فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے بارے میں ان کی تسلی ہوگئی۔ اور وصال حق تعالیٰ نصیب ہوگیا۔ نیز وہ شخص یہ بھی کہتا تھا، کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے تین بار حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میری ملاقات و زیارت کے بارے میں عرض کی۔ اور تیسری بار ان کی یہ درخواست منظور ہوئی اور خود حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم میری ملاقات کو تشریف لائے۔ اور مجھ کو اپنے دیدار سے مشرف فرمایا۔ حضور کے ساتھ چند صحابہ اور بھی تھے اور ان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی شامل تھے۔ ہمارے حضرت شیخ ان کے آگے آگے دائیں بائیں بطور احترام چلے آرہے تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کئے جارہے تھے کہ حضور آہستہ تشریف لے آئیے [illegible]

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مجھ کو اپنے دیدار سے مشرف فرمایا، تو تبسم فرمارہے تھے اور ارشاد فرمایا۔ آتھی بعضوں نے کیا کیا، اور بعضوں نے کیا؟ یہ گندکیوں سے آلودہ بندہ ہے مگر یہ محض آپ کا فضل و کرم ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق صاحب اس کی تشریح یوں کرتے ہیں "کہ بعض بسیار نیکی مے کنند و قبول می شود و بعض اگرچہ درخرابات باشد و تو بہ نصیب گردد، و قبول افتد بہ حقیقت و محبت موصوف شود۔ (مقامات ۱۵۶)۔

پس اس شخص کو علوم باطنیہ کے ایسے اسرار معلوم ہوئے کہ اس کے سینے میں معرفت و علم حال و حقیقت کا دریا موجیں مارنے لگا۔ سچ ہے ؎

آہن کہ بہ پارس آشنا شد ؛ فی الحال بصورت طلا شد

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

گر تو سنگ خارا و مرمر شوی ؛ چون بہ صاحبدل رسی گوہر شوی

وہ شخص یہ بھی کہتا ہے، کہ روئے زمین کی بیماریاں مجھے دکھلائی گئی تھیں۔ میں ان سے واقف ہو جاتا اور ان کو دیکھتا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ بات معلوم کرلی ہے کہ سارے اعمال میں بہترین عمل نیک نیت ہے پس چاہئے کہ اسے کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں ؎

چندین فسون شیخ نیرزد بہ نیم خس

راحت رسان بہ دل کہ ہمین مشرب است و بس

اور حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے ؛ رسید از دست محبوبے بدستم

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ؛ کہ از بوئے دلآویز تو مستم

بگفتا من گلے ناچیز بودم ؛ ولیکن مدتے با گل نشستم

جمالِ ہم نشین در من اثر کرد   وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہم

اسی طرح کہا جاتا ہے ۔ لِکُلِّ مَجْلِسٍ تَاثِیرٌ

۹ ۔ حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں :۔ (ترجمہ)

ایک دن میرے پیر و مرشد حضرت شیخ قدس سرہ نے مجھ سے فرمایا ، بیٹا عبدالحلیم ! مجھے ایک بیماری لاحق ہے ۔ اور یہ بیماری میرے والد کو بھی لاحق تھی ، اور شاید تم کو بھی لاحق ہو جائے ۔ اور اس طرح کی بات کہی کہ جو مرض باپ کو ہوتا ہے ، وہ بیٹے کو بھی ہو سکتا ہے ۔ اس وقت حضرت شیخ جی صاحب نے بطور رمزیہ فرمایا ۔ اور ان دنوں میں یہ بیماری مجھ میں بالکل نہ تھی ، اور نہ اسکی کوئی علامت تھی ۔ لیکن اب میں وہ بیماری محسوس کرتا ہوں ۔ اور اس کی شدت سے خوفزدہ ہوں ۔ لیکن مجھے امید واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ قدس سرہٗ کے اس محبت و لطف و مہربانی کے طفیل جو وہ میرے حال پر فرماتے رہے ہیں ، اس بیماری میں شدت نہ آنے دے گا ۔ اور یہ اس حال سے نہ بڑھیگی اور اس وقت حضرت شیخ قدس سرہٗ نے یہ حقیقت مجھ پر رمز و کنایہ کے طور پر ظاہر فرمائی تھی ۔ (مقامات قلمی نسخہ صفحہ ۲۰۸)

۱۰ ۔ حضرت شیخ المشائخ کے ایک مرید جو دور دراز علاقے سے آئے ہوئے تھے ۔ ایک دن حضرت شیخ نے جو کی روٹی میں بہت سا نمک ملاکر اس مرید کو کھانے کے لئے دیا ، اور فرمایا ، کہ اسے خود کھالو اور کسی اور کو نہ دو اور جب تک اسے ختم نہ کرلو ، کوئی اور چیز بھی نہ کھانا ۔ اس مرید نے خیال کیا کہ جو کی ایک روٹی ہے ، فوراً کھالوں گا ، لیکن جونہی ایک نوالہ کھائے نمک کی زیادتی سے نہ کھا سکا ۔ (نمک زیادہ تھا) دو تین دن میں اس روٹی کو ختم کیا ۔ اس مرید نے سمجھا کہ جس طرح نمک کی زیادتی سے یہ روٹی کھائی گئی اسی طرح میرے باطن

جتنے بھی اخلاق ذمیمہ تھے وہ سب جل گئے۔ اور میرے باطن میں ان میں سے کچھ بھی نہ رہا۔ اور اس کے بعد تیزی کے ساتھ مدارج سلوک طے کئے۔"

۱۱۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک شخص بغرض حصول دین حاضر ہوا۔ اس سے پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے حضرت شیخ کی خدمت میں پانچ روپے پیش کرنے کا ارادہ دل میں کر رکھا تھا لیکن اس کا خیال یہ تھا کہ روزانہ ایک ایک روپیہ خدمت میں پیش کرتا رہوں گا، تاکہ حضرت مجھے اچھی طرح پہچان لے جب وہ شخص پہلی بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو اس پہلی نظر کا اس پر اتنا اثر ہوا، کہ سونا چاندی اور مٹی سب اس کی نظر میں ایک جیسا نظر آنے لگا۔ اور دنیا کی محبت اس کے دل سے بالکل غائب ہو گئی۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

درون سینۂ من تیر بے نشان زدہ
بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کمان زدہ

۱۲۔ آپ کا ایک مرید ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مرید کہتا ہے کہ نظر پڑتے ہی میں نے محسوس کر لیا کہ میرا سر آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ جب دوسری بار آپ نے توجہ فرمائی، تو میرا وجود اس طرح پگھلنے لگا جس طرح گرمی سے برف پگھلتی ہے اور میں گھبرا گیا کہ میرے وجود کا بند بند الگ ہو جائیگا لیکن اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی اور اپنی حالت پر رہ گیا۔ اس کے بعد اس مرید کی کایا پلٹ گئی ؎

کلاہ گوشۂ دہقان بہ آفتاب رسید
کہ سایہ بر سرش انگندِ چون تو سلطانی

۱۳۔ ایک ... کا رہنے والا ایک ... کا ... اور ...

شخص تھا۔ مگر اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ ایک دفعہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی خدمت میں بیٹے کی خواہش لیکر حاضر ہوا۔ مگر ایک ماہ تک تنہائی میں حضرت سے اپنی حالت بیان کرنے کا موقع اسے نہ ملا۔ آخر پریشان ہوکر حضرت کے ایک اور مرید سے مشورہ لیا۔ اس مرید نے اسے کہا۔ کہ ایک رات حضرت کے حجرے کے سامنے کھڑے ہوکر گذار دو۔ جس وقت حضرت مسجد جانے کے لئے حجرے سے باہر تشریف لائیں، اُس وقت ان کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا۔ اس کے بغیر تم کو تنہائی میں حضرت کا ملنا مشکل ہے۔

چنانچہ کمال خان نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ اور ایک رات حضرت شیخ کے حجرے کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ آدھی رات کے وقت جنگل سے دو چیتے نکل آئے اور سیدھے آکر حجرے کے پاس کمال خان کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ اور اگر کمال خان ہاتھ بھی ہلاتا، تو چیتوں سے لگ جاتا۔ اب کمال خان کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اور بیٹے کی خواہش کو بھول گیا۔ کچھ وقت اس طرح خوف میں گذارنے کے بعد اچانک حضرت شیخ قدس سرہ حجرے سے باہر آئے۔ اور یہ منظر دیکھا۔ اور کمال خان سے کہا جس طرح تم بیٹے کی خواہش لیکر آئے ہو، یہ چیتے بھی اولاد نرینہ کی خواہش لیکر آئے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے چیتوں کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ اور ان کو یہ کہکر رخصت کر دیا۔ کہ خداوند تعالیٰ تم کو اولاد سے سرفراز کردیگا۔ اور پھر کمال خان کے لئے بھی دعا فرمائی۔ اور اُسے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم کو پانچ بیٹے عطا فرمائیگا۔ اور اسے بھی رخصت کیا۔ کچھ عرصہ بعد کمال کا بیٹا پیدا ہوا۔ اور چند سالوں میں اُسکے اور بھی بیٹے پیدا ہوئے۔ اور اسکی اولاد پھلی پھولی۔

نمبر ۱۴۔ حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ کا ایک مرید تھا۔ جب حضرت انتقال فرما گئے، تو اسے قرار نہ ہوا۔ اور پریشان رہنے لگا۔ اور کسی دوسری جگہ

بیعت کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں ایک فاضل سے مشورہ کیا۔ اُس
نے اسے مشورہ دیا، کہ جس بزرگ کے ساتھ تمہاری عقیدت زیادہ ہو اُس کے
پاس چلے جاؤ۔ اگر حضرت شیخ صاحب کو تمہارا جانا پسند ہو تو تم بہت جلد ترقی
کر جاؤ گے۔ اور اگر ان کی مرضی نہ ہو تو وہ رمز و اشارہ کے ساتھ تمہیں منع
کر دیں گے۔ چنانچہ اس مشورے کے مطابق وہ مرید پہلے حضرت عبداللہ
کوہاٹی (حاجی بہادر) کے پاس گئے۔ اور ان کے پاس آنے جانے لگے، مگر
وہاں بھی اسکی تسلی نہ ہوئی۔ اسکے بعد شیخ اللہ داد مندوری کے پاس
آنے جانے لگے، مگر وہاں بھی تشفی نہ ہو سکی۔ اسی دوران ایک دن
حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے باطنی طور پر اس حال میں اس پر ظہور فرمایا۔ کہ ان
کے دونوں ہاتھوں میں دو پہاڑ تھے۔ اور اس مرید کو کہا، کیا تم جانتے ہو
کہ اس ایک پہاڑ سے عبداللہ کوہاٹی کو کچل دوں اور اس دوسرے سے
اللہ داد مندوری کو؟ وہ مرید کہتا ہے کہ میں ڈر کے مارے کچھ بول نہیں
سکتا تھا۔ آخر حضرت شیخ نے خود ہی فرمایا! جانے دیں دونوں عالم ہیں۔ اور
پہاڑ اپنی جگہ پر رکھ دیئے۔ اس کے بعد اس مرید کے کان چھید لئے اور اُسے
کہا، جاؤ اب میں نے تمہیں نشان دار بنایا۔ اور پھر حضرت شیخ صاحب غائب
ہو گئے۔ اور اسکے بعد اس مرید کی پریشانی بھی دور ہو گئی۔ اور بہت جلد ترقی کی
۱۷۳۔ ایک دفعہ ایک مریض آپ کی خدمت میں لایا گیا، طبیبوں نے
اسے لا علاج قرار دیا تھا۔ اس کے وارث آخری چارہ کار کے طور پر اسے
حضرت کی خدمت میں لائے تھے۔ اطبا کی ہدایت تھی کہ مریض کو گوشت
ہرگز نہ دیا جائے، مگر حضرت نے اس کے وارثوں سے کہا، اور [illegible]
[illegible] گوشت کھلاؤ۔ اگرچہ اطبا کے مطابق [illegible]

لئے موت کا پیغام تھا۔ مگر حضرت شیخ جی کے فرمان کے مطابق اس کے وارثوں نے اسے گوشت اور دہی کھلایا۔ کچھ دیر بعد مریض کو سخت قے آئی اور اسکے پیٹ سے ایک سانپ ٹکڑوں کی شکل میں مردہ نکل پڑا۔ اور مریض جلد بحالِ صحت ہوا۔ اور چند دن کے بعد بالکل تندرست ہوا اور اپنے گھر چلا گیا۔

حضرت رحمۃ اللہ کے پاس مار گزیدہ یا سگ گزیدہ لایا جاتا آپ اُسے نمک کھلاتے۔ اور اس سے زہر کا اثر بالکل زائل ہو جاتا۔ مار گزیدہ اور سگ گزیدہ کے لئے حضرت کا یہی معمول تھا۔

۱۶۔ علاقہ دکن کا ایک جوگی حضرت شیخ قدس سرہٗ کی ولایت و عظمت کی شہرت سنکر آپ کی ملاقات کی خاطر اپنے وطن سے روانہ ہوا۔ اور امتحان کی خاطر ایک قیمتی پتھر اپنی گدڑی میں چھپایا ہوا تھا۔ کہ یہ حضرت کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کردوں گا۔ جب وہ جوگی یہاں پہنچا۔ اس وقت حضرت شیخ الگ تھلگ ایک پہاڑی پر ذکر و فکر میں مستغرق تھے۔ جوگی وہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہ قیمتی لعل آپکی خدمت میں پیش کرکے کہا کہ حضرت یہ قیمتی پتھر میں آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ لایا ہوں۔ اسے قبول کیجئے۔ حضرت نے فرمایا۔ بھائی میں ایک فقیر آدمی ہوں مجھے لعل و جواہرات سے کیا کام؟ کسی بادشاہ یا امیر کو بطور تحفہ پیش کریں کہ ان چیزوں کی ضرورت ان کو ہوتی ہے۔ مگر جوگی نے بار بار اصرار کیا اور کہا کہ جناب میں اتنی دور سے آیا ہوں اور یہ پتھر صرف آپ ہی کے لئے لایا ہوں۔ مگر آپ نے پھر بھی انکار کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے [illegible]

آپ نے اُسے فرمایا کہ اچھا آپ آنکھیں بند کر کے پھر کھولیں۔ اور دیکھیں کہ
تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ جوگی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب دوبارہ
کھولیں، تو اُسے ہر طرف قیمتی لعل و جواہر کے انبار نظر آئے۔ اور اُسے اپنا
پتھر حقیر معلوم ہونے لگا۔ جوگی نے جب یہ نظارہ دیکھا، تو حیران رہ گیا، اور
کہنے لگا۔ یا حضرت میری پوری پوری تسلی ہو گئی ہے، مجھے مسلمان کیجیے۔ چنانچہ
آپ نے اُسے کلمہ طیبہ پڑھا کر مسلمان کیا۔ اور پھر آپ کی توجہ اور کیمیا نظری کے
طفیل بہت جلد مدارجِ کمال بھی طے کیے۔ اس کے بعد آپ نے اُسے وطن جانے
کی اجازت دے دی۔ اور ہدایت کی کہ اپنے اہل و عیال اور خاندان کے دوسرے
افراد کو بھی مسلمان بناؤ۔ چنانچہ جب وہ اپنے وطن واپس چلا گیا، تو اپنے تمام
خاندان اور رشتہ داروں کو مسلمان کیا۔ اور باقی عمر اشاعت اسلام میں گزاری۔

۱۷۔ علاقہ سوات کا ایک شخص ہندوستان میں مختلف علوم و فنون حاصل
کرنے کے بعد وطن روانہ ہوا۔ راستے میں ہر جگہ اُس نے حضرت شیخ رحمکار
قدس سرہٗ کی روحانی کمالات کا چرچا سُنا۔ جب اٹک پہنچا۔ تو دل میں خیال
کیا۔ معلوم نہیں کہ وہ واقعی مردِ کامل ہے۔ یا لوگوں کو پھانسنے کے لیے شعبدہ بازی
سے کام لے رہا ہے۔ اس نے یہ ارادہ کیا، کہ جا کر دیکھنا چاہیے کہ واقعی مردِ کامل
ہو تو بہتر، ورنہ بحث و مباحثہ میں اُسے ایسا لاجواب کر دوں گا کہ اس کی
ساری شیخی کرکری ہو جائیگی۔ چنانچہ چند علمی شکوک و شبہات اور مسائل
کے امتحان کا ارادہ لیکر خانقاہ رحمکاریہ آپہنچا۔ اس وقت حضرت شیخ
صاحب نماز اشراق ادا کر چکے تھے۔ اور ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر مطالعہ
[illegible] تھے۔ اردگرد بہت سے مریدین و معتقدین بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ عالم بڑے
[illegible] آیا [illegible] آواز بلند کہا ارے اے لوگو! کہاں ہے وہ [illegible]

پیر و مرشد؟ حاضرین چپ رہے۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس عالم نے پھر زور دار آواز میں پوچھا کہ کہاں ہے وہ تمہارا پیر و مرشد؟ حاضرین پھر بھی خاموش رہے۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ تیسری بار بھی وہ گرجا اور کہا بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کون ہے تمہارا پیر؟ اب حضرت شیخ نے ایک مرید سے فرمایا کہ جاکر بتادو۔ اور اُسے میرے قریب لے آؤ۔ چنانچہ وہ مرید اس کے پاس گیا۔ اور اشارے سے اُسے بتادیا کہ دیکھئے وہ ہیں ہمارے پیر و مرشد۔ چنانچہ جب وہ عالم آپ کے قریب ہؤا۔ اور آپ نے اُسکی طرف دیکھا، تو پڑتے ہی وہ عالم ہوا میں بلند ہؤا اور دور جاکر زمین پر گر پڑا۔ حضرت شیخ صاحبؒ نے شیخ ملیؒ سے کہا۔ کہ فوراً جاکر اس کی پیشانی ملو۔ تاکہ اُسے نقصان نہ پہنچے۔ اور پھر اُسے میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ شیخ ملیؒ فوراً اُسکے پاس گئے، اُسکی پیشانی پر مالش کی اور وہ عالم ہوش میں آگئے۔ اور اُسے کہا کہ اب حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤ۔ مگر اُس عالم نے جواب دیا کہ اب مجھ میں دوسری نظر برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے۔ اس ایک نظر سے میرے تمام شبہات دور ہوچکے ہیں۔ اور میرا دل کھل گیا ہے۔ چنانچہ یہی عالم بعد میں مدارج سلوک طے کرتا ہوا حضرت شیخ کے خاص الخاص مریدوں میں داخل ہوا۔ اور اس ایک نظر کیمیا اثر سے ولی کامل بنگیا۔

۱۸۔ حضرت شیخ رحمکار کے مرید خاص شیخ دریا خان قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔ کہ "ایک دفعہ میں نے اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ سے حج پر جانے کی اجازت مانگی۔ مگر حضرت نے اجازت نہ دی۔ تھوڑے عرصے بعد میں نے پھر اجازت کیلئے عرض کی۔ اس دفعہ آپ نے بخوشی مجھے اجازت دیدی۔ اور عزت افزائی کے طور پر رخصت کے وقت چند قدم میرے ساتھ چلتے بھی آئے

اس وقت حضرت شیخ جی صاحب نے فرمایا۔ "اے شیخ دریا! این دیدن دیدن مثل یوم قیامت مے نماید۔ یعنی یہ آج کی ملاقات یوم قیامت جیسی ملاقات معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت میں اس رمز کو نہ سمجھ سکا۔ میں مکہ معظمہ پہنچا اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد جب کچھ عرصہ بعد وطن واپس آنے لگا، تو قندہار کے قریب پہنچکر مجھے اپنے پیر و مرشد کی رحلت کی اطلاع ملی۔ میں بہت محزون و ملول ہوا۔ اور اس وقت مجھے حضرت شیخ کی وہ بات سمجھ میں آگئی کہ "این دیدن مثل یوم قیامت مے نماید"۔

19۔ دہلی کا ایک سوداگر آپ کا نہایت معتقد تھا۔ ایک دفعہ اس کے مالِ تجارت کی کشتی سمندری طوفان میں گھر گئی۔ اور اُسے جان و مال کا شدید خطرہ پیدا ہوا۔ اس خطرے کی حالت میں اس نے حضرت رحمکار کے وسیلے سے دعا مانگی۔ کہ اگر میں مال و جان سمیت اس ورطۂ ہلاکت سے بچ نکلا تو میں اپنے مرشد حضرت رحمکارؒ کے لنگر میں ایک ہزار روپے بطور نذر پیش کردوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اس مصیبت سے بخیر و عافیت نکالا، اور اپنے گھر مال و منال کے ساتھ بخیریت پہنچ گیا۔ مگر بعد میں وہ دوسرے مشاغل کی وجہ سے نذر کی ادائیگی فراموش کر بیٹھا اور اس طرح کچھ عرصہ گذر گیا۔

حضرت شیخ صاحب کے مریدوں میں حیات خان نامی ایک مرید تھا۔ آپ نے ایک دن اُسے بلا کر ہدایت کی۔ کہ دہلی جاکر فلان مقام پر فلان تاجر ہے، اُسے کہو کہ جوانمردی کا تقاضا تو یہ ہے کہ جو وعدہ کرچکے ہو اسے پورا کرو [illegible] ایک ہزار روپیہ جو تم نے بطور نذر لنگرخانے کے لیے مانے ہیں، وہ [illegible] چنانچہ حسب ہدایت حضرت شیخ صاحب حیات خان دہلی

پہنچا۔ اور تاجر کا مکان تلاش کر کے اُسے حضرت شیخ قدس سرہٗ کا پیغام پہنچایا۔ تاجر کو اپنا وعدہ یاد آیا۔ اور اپنی غفلت پر پشیمانی ظاہر کی۔ شیخ حیات خان کو چند دن اپنے پاس ٹھہرایا۔ اور پھر اسے ایک ہزار روپے دیدئے۔ اور شیخ حیات خان وطن جانے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا۔ جب گجرات پہنچا، تو ان دنوں میں یہاں ایک حسین و جمیل طوائف رہتی تھی۔ ایک رات کا معاوضہ ایک سو روپے لیا کرتی تھی۔ اور دُور دور سے دولتمند اور خواہشمند لوگ اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ شیخ محمد حیات کے پاس بھی ایک ہزار روپیہ موجود تھے۔ شیطان نے اسے بھی ورغلایا۔ اور دل میں سوچا کہ سو روپے دیکر میں بھی ایک رات مزے لوٹوں۔ بعد میں حضرت شیخ کے سامنے سو روپے کے خرچ ہونے کا کوئی بہانہ تلاش کرونگا، چنانچہ یہ خیال کر کے وہ بھی طوائف کے پاس گیا۔ اور سو روپے دیدئے، مگر جب اُس نے اس عورت کو ہاتھ لگانا چاہا تو اس کے ہاتھ فوراً بےحس و بیکار ہوگئے۔ اور اس کے تمام جنسی جذبات یکدم زائل ہوگئے۔ اور تمام رات طوائف کے ساتھ ہم بستر ہونے کے باوجود بھی وہ جنسی فعل پر قادر نہ ہوسکا۔ اور صبح کے وقت نہایت نادم و خجل ہو کر طوائف کے مکان سے نیچے اُترا۔ مگر جب باہر آیا۔ تو اُس کے شہوانی جذبات پھر لوٹ آئے اور وہ شوق ہم بستری سے دوبارہ بےچین ہوگیا، چنانچہ دوسری رات بھی سو روپے دیدئے۔ مگر جب طوائف کے ساتھ ہم بستر ہوا۔ تو اس کی قوت مردمی بالکل غائب ہوگئی۔ اور تمام رات صرف کروٹیں بدلتا رہا۔ غرض اس طرح دس راتیں معاملہ ہوتا رہا۔ یعنی دن کے وقت شہوانی جذبات سے مغلوب ہوجاتا اور جب طوائف کے ساتھ ہم بستر

ہوجاتا، تو قوت مردمی سے قطعاً محروم ہوجاتا۔ آخری رات بھی جب اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا، تو وہ اپنے اس کرتوت پر نہایت نادم ہوا۔ اور رونے لگا۔ اور وہ طوائف بھی حیران تھی کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ آخر طوائف نے اس سے پوچھا۔ اے نوجوان! تونے پورے ہزار روپے ضائع کئے۔ مگر تم ایک رات بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ آخر شیخ محمد حیات نے اسے تمام ماجرا سنایا۔ طوائف کو جب تمام حالات سے واقفیت حاصل ہوئی۔ تو وہ بھی بہت متأثر ہوئی۔ اور کہا بہت افسوس کی بات ہے، کہ تم نے ایسے مرشد کامل کے ساتھ دھوکہ کرنے کا ارادہ کیا۔ چلو میں بھی اس بُرے کام سے توبہ کرتی ہوں۔ اور اپنا تمام مال واسباب لیکر حضرت شیخ رحمکار کی خدمت میں حاضر ہوتی ہوں۔ تم بھی جاؤ اور اپنے اس فعل ناروا کے لئے گڑگڑا کر معافی مانگو۔ امید ہے کہ حضرت شیخ تم کو معاف کردینگے۔ چنانچہ وہ طوائف بھی شیخ محمد حیات کے ہمراہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ حضرت شیخ جی صاحب نے محمد حیات سے فرمایا۔ "تم نے تو شیطان کے درغلانے پر پوری خیانت کی، لیکن خدا نے تم کو بچالیا۔ مگر آئندہ کے لئے کبھی بھی ایسے کام کا ارادہ بھی دل میں نہ لانا۔ پھر فرمایا۔ میں چاہتا ہوں، کہ اس عورت کا نکاح تجھ سے کردوں۔ چنانچہ وہ عورت بھی راضی ہوئی۔ اور اپنے سابقہ بدکاریوں سے اخلاص کے ساتھ توبہ کی۔ اور حضرت شیخ سے بیعت کی۔ پھر حضرت شیخ قدس سرہٗ نے اسے محمد حیات کے حبالہ نکاح میں دیدیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت شیخ قدس سرہٗ نے محمد حیات کو خلافت عطا کرکے اسے اپنی بیوی سمیت جانے

بھی اجازت دی۔ اور خانپور کے علاقے میں اسے رہائش اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔

شیخ محمد حیات اُس کے بعد کافی عرصے تک زندہ رہے۔ اور انکی اولاد وہاں خوب پھلی پھولی۔ شیخ محمد حیات کا مزار اب تک موضع بلوٹ میں موجود ہے۔ اور مرجع خلائق ہے۔ آپکی اولاد قدیم زمانے سے سال میں ایک بار بیساکھ کے مہینے میں حضرت شیخ رحمکار کے مزار پر حاضری دینے کے لئے آتی ہے۔ یہ لوگ جتھوں کی شکل میں آتے ہیں۔ ان میں مرد، عورتیں بچے بوڑھے سب ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خانپوری کہلاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ تقریباً تین سو سال سے جاری ہے۔

حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز کی تاثیر توجہ اور خوارق و کرامات کے یہ چند واقعات میں نے تبرکاً یہاں نقل کئے ہیں۔ حضرت شیخ رحمکار کے زیادہ تر کرامات معنوی ہیں۔ جو ذوق و وجدان سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت کے حسی کرامات بھی بے شمار ہیں۔ مگر میں نے وہ کرامات یہاں نہیں لکھی ہیں۔ جناب میاں شمس الدین مرحوم اور عبدالحلیم قدس سرہٗ کی کتابوں میں ان حسی کرامات کا ذکر بھی موجود ہے۔ خواہشمند حضرات ان کتابوں میں ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں، حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ اظہار کرامت کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ وہ کیمیا نظر تھے۔ اور جس خوش قسمت انسان پر ان کی نگاہ مبارک پڑتی۔ اس کا بیڑا پار ہو جاتا۔ اور اسکی دنیا ہی بدل جاتی۔ اور حضرت شیخ المشائخ کا یہ فیض آج تک جاری ہے۔ اور بہت سے خوش نصیب انسان اس سے بہرہ ور ہوئے ہیں اور ہو رہے

ہیں۔ لیکن اس کے لئے اخلاص اور یقین محکم کی دولت سے مالا مال ہونا ضروری ہے۔ " شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی"۔

غرض یہ ایک ایسی کیفیت ہے۔ کہ جیسے لوگ جانتے اور محسوس کرتے ہیں وہ بتاتے نہیں کیونکہ " آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد"۔ اور جو لوگ نہیں جانتے وہ مانتے بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ سے میری عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے مجھے اور اس کتاب کے قارئین کو بھی حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز کے فیض عام سے بہرہ ور فرمائے۔ (آمین)۔

واقعۂ وفات

حضرت شیخ المشائخ حضرت رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز تقریباً سال بھر بیمار رہے۔ اس عرصے میں بیماری کبھی شدت اختیار کرلیتی اور کبھی کچھ افاقہ ہوجاتا۔ مگر آخری دنوں میں آپ اکتالیس روز صاحبِ فراش رہے۔ ان دنوں میں بیماری میں بہت شدت تھی۔ ۳ر رجب سے بیماری اور بھی شدید ہوگئی۔ اس بیماری میں بھی آپ باقاعدہ وضو کرکے قیام کے ساتھ پورے آداب و شرائط کے ساتھ نماز ادا کرتے رہتے تھے، اگرچہ آپ کو تکلیف تو بہت ہوتی تھی۔ اور دو آدمی آپ کو سہارا دے کر اپنے مقام تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ اس سے قبل جب کبھی آپ علیل ہوجاتے تو رخصتِ شرعی پر عمل پیرا ہوتے مگر اس بیماری میں آپ نے رخصت شرعی سے فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ عزیمت پر عمل کرتے رہے۔ (مقامات قطبیہ)۔

حضرت فقیر جمیل بیگ قدس سرہ کی روایت ہے کہ ۱۶ر رجب کو آپ نے اپنے خاص الخاص مریدوں کو جو تعداد میں ساٹھ اور ستر کے درمیان تھے، اپنے پاس بلایا۔ اور ان کو خاص نصائح سے سرفراز فرمایا۔ اور تصوف کے باریک

مسائل سے اُن کو آگاہ کیا۔ یہ سلسلہ متواتر چار روز تک جاری رہا۔ ان دنوں میں ان مخصوص افراد کے علاوہ دوسروں کو آپ کے پاس آنے کی اجازت نہ تھی۔ ۲۱ رجب کو آپ نے تمام مریدوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اور ان کو ہر قسم کی نصائح سے سرفراز کیا۔ آخری رات خان خوشحال خان خٹک مرحوم نے آپ کے صاحبزادوں سے اجازت لیکر آپ کی تیمارداری کی۔ اور رات بھر آپ کے پاس رہے۔ صبح کے وقت آپ قضائے حاجت کے لئے اٹھے۔ خان نے وضو کیلئے کوزہ پیش کیا۔ آپ نے وضو کر کے نماز ادا کی۔ اس کے بعد دوست آتے رہے۔ اور فیوضات سے بہرہ ور ہوتے گئے۔

جب نماز جمعہ کا وقت داخل ہوا، تو آپنے وضو کر کے پوری استقامت کیساتھ نماز ادا کی۔ بعد میں خطیب کا خطبہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ شیخ گلنور صاحب اور فقیر جمیل بیگ صاحب دونوں کے سہارے آپ مسجد تشریف لے گئے۔ اور وہاں بھی شیخ گلنور اور فقیر جمیل بیگ صاحب کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ جب خطبہ شروع ہوا۔ اور پڑھتے پڑھتے خطیب نے یہ جملہ پڑھا، اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔ یعنی موت ایک پُل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ اسی وقت آپ واصل بحق ہوئے۔ اور آپ کی روح عالم قدس کی طرف پرواز کر گئی۔

"ہمان زمان حق را توصل گردند، و پروانہ جانان گشت و عالم قدس را پرواز کرد۔" (مجمع البرکات)۔

لہٰذا یہ واقعہ ۲۴ رجب بروز جمعہ ۱۰۶۳ھ مطابق ۲۰/۲۱ جون ۱۶۵۳ء کا ہے۔ بوقت وفات آپ کی عمر اسّی برس تھی۔ مقامات قطبیہ میں آپ کی تاریخ وفات "شیخ کاکا قطب" لکھا ہے۔ جو ۱۰۶۳ھ بنتا ہے۔ اسکے علاوہ ایک شعر

میں آپ کی تاریخ کے ضمن میں یہ شعر بھی لکھا ہوا ہے ؎

رحمکار م زین جہان چون رخت بست
گفت ہاتف یاد کن "با فقر رفت"

یعنی "با فقر رفت" آپ کی تاریخ وفات ہے۔ جو ۱۰۶۳ھ کے مطابق ہے۔ اسی شجرے میں آپ کی تاریخ پیدائش ۹۸۱ھ اور عمر شریف ۸۲ سال لکھی ہوئی ہے۔ مگر میرے خیال میں آپ کی درست تاریخ پیدائش ۹۸۳ھ اور آپ کی عمر شریف تقریباً اسیؔ برس تھی۔

چونکہ خان خوشحال خان خٹک مرحوم حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے مرید بھی تھے۔ اور ان کی بیماری کے آخری دنوں میں اُن کے پاس موجود بھی۔ اس لئے آپ نے حضرت شیخ جیو صاحبؒ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ قارئین کے پیشِ خدمت ہے۔ (پشتو سے ترجمہ)

افضل خان مرحوم لکھتے ہیں "خان علیین مکان سے نقل ہے۔ جوانہوں نے اپنے دستخطِ خاص کے ساتھ اپنی بیاض میں لکھا ہے۔ کہ ۲۴ رجب بروز جمعہ خطبہ کے وقت ۱۰۶۳ھ میں حضرت بزرگوار شیخ رحمکار قدس اللہ سرہٗ کی روح نے اپنا جسمانی قالب خالی کیا۔ اور عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ آپ کی یہ تاریخ وفات خان مرحوم نے لکھی ہے" ؎

چون رفت از جہان شیخ دین رحمکار ؛ رجب بود جمعہ بہ بست و سہ ہفت
چو تاریخ نوتش بجستم ز عقل ؛ خرد گفت با ماکہ "با فقر رفت"
۱۰۶۳ھ

آپ کا جنازہ اٹھایا گیا۔ اور جہاں آپ نے وصیت فرمائی تھی، وہاں لایا گیا۔ اور میں نے بھی جنازے کو کندھا دیا۔ اور اس طرح دین و دُنیا کا شرف حاصل کیا۔ مولانا قاضی ولی محمد اور آپ کے دوسرے خاص مرید حضرت شیخ

د کے حسبِ وصیت تجہیز وتکفین کے کام میں مصروف ہوئے۔ اور جنازہ لاتے وقت بے شمار سرخ وسفید پرندے پروں سے پر ملا کر جنازہ پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ اور نماز جنازہ میں اتنے لوگ شریک ہوئے کہ صفوں کی ترتیب قائم نہ رہ سکی۔ اور قبر میں اتارنے کے بعد آپ کا چہرہ ایسا تابناک تھا۔ کہ گویا مسکرا رہے ہیں۔"

خان مرحوم آگے لکھتے ہیں :-

اور نزع کے وقت اس خادم کو بلایا تھا۔ میں نے حضرت کو ایسا بلند ہمت پایا، کہ حضرت کی حالت میں ذرہ بھر بھی تبدیلی محسوس نہ کی۔ آپ کو درد شکم کی بہت زیادہ تکلیف تھی، جب قضائے حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تو مجھے ہاتھ کے اشارے سے باہر نکلنے کی ہدایت فرمائی۔ میں جب اٹھکر جانے لگا۔ تو از روئے مہربانی اس وقت مجھ پر جو نظر ڈالی اس کی حلاوت اور مٹھاس ابھی تک محسوس کر رہا ہوں۔ اور حضرت شیخ جیو سے زندگی میں یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات میں میں نے دو باتیں عرض کیں، حضرت شیخ جیو کی زبان اس وقت حرکت نہ کر سکتی تھی اشارے سے مجھے جواب دیا۔ پہلی بات یہ تھی، کہ میں نے جانشینی کے بارے میں پوچھا، کہ حضرت شیخ ضیاء الدین ہونگے یا کوئی اور؟ اشارے سے اس کے جواب میں آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ جسے خدا چاہے۔ دوسری بات یہ کہ ایک جگہ پانی کا چشمہ تھا۔ میں نے عرض کیا، کہ اگر اجازت ہو، تو حضرت کو وہاں دفن کرینگے، تاکہ حضرت کے روضہ کے ساتھ باغ لگایا جائے۔ اس کی بھی ممانعت فرمائی۔"

"اس واقعے سے ایک ہفتہ پہلے اس خادم کو بلایا تھا۔ اس وقت

حضرت شیخ قدس سرہ نے مشفقانہ نصائح سے مجھے سرفراز فرمایا تھا اور اپنے فرزندوں کے بارے میں بھی باتیں کیں، اس وقت مجھے حقیقتِ حال معلوم نہ تھی۔ جب یہ واقعہ رونما ہوا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ آپ کو پہلے سے آگاہی ہو چکی تھی۔ اس لئے آپ نے کنایات میں باتیں کیں۔ اور رخصت کے وقت میں نے دعا کیلئے التماس کیا۔ زبان دُر افشان سے ارشاد فرمایا: "جائیے جو مشکل بھی تمہیں درپیش ہوئی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تمہارے لئے اسے آسان بنا دیگا۔ عمر بھر میں ایسے صریح الفاظ میں کسی کے لئے بھی حضرت نے ایسی دعا نہیں فرمائی تھی، جو اس احقر کے حصے میں آئی۔"

غرض یہ کہ حضرت شیخ نہایت متبرک اور بزرگوار تھے۔ اپنے والد کے مرید تھے، لیکن ان کا طریقہ اویسی تھا۔"

قارئین نے گزشتہ صفحات میں پڑھا۔ کہ حضرت شیخ رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز کے جنازے پر بے شمار سرخ و سفید پرندے سایہ کئے ہوئے تھے۔ اسی طرح حضرت ذوالنون مصری قدس اللہ سرہ العزیز کے جنازے پر بھی پرندوں نے سایہ کیا تھا۔ حضرت ممدوح کی زندگی میں لوگ آپ کے مخالف تھے۔ لیکن ان کے جنازے پر جب یہ کیفیت دیکھی، تو ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اپنے رویئے پر بہت نادم و پشیمان ہوئے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار ایک نوجوان حضرت ذوالنون مصری قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ نوجوان آپ کا بہت مخالف تھا۔ اور آتے ہی اوٹ پٹانگ بکنے لگا۔ آپ نے اسے ایک نگینہ دے کر کہا کہ اسے نانبائی کے پاس لے جاؤ اور اُس سے ایک درم کی روٹی لے آؤ۔ وہ نوجوان نگینہ لے کر نانبائی کے پاس [illegible] مگر نانبائی نے وہ نگینہ کم قیمت سمجھتے ہوئے اسے روٹی دینے سے

انکار کیا۔ وہ نوجوان آپ کے پاس واپس آیا۔ حضرت نے اُس کو پھر ایک جوہری کے پاس بھیجا۔ اور ہدایت کی، کہ جوہری سے اس کی قیمت معلوم کرو چنانچہ وہ نوجوان نگینہ لیکر جوہری کے پاس گیا۔ جوہری نے اس کی قیمت ایک ہزار دینار بتائی۔ نوجوان واپس آیا اور آپ کو جوہری کی بات بتا دی۔ حضرت نے اسکو فرمایا۔ نوجوان "صوفیا" کے بارے میں تمہارا علم نانبائی سے بھی کم ہے۔ اس پر وہ نوجوان نادم ہوا اور آپ کا بہت زیادہ معتقد ہوگیا"

(انوار الاولیاء ص ۹۸ رئیس احمد جعفری)

تجہیز و تکفین آپ کے خلفائے نامدار میں سے شیخ عبداللطیف اور خواجہ شمس الدین نے غسل دیا۔ خواجہ گلو اور فقیر جمیل بیگ صاحب لوٹے ہاتھوں میں لئے ہوئے پانی ڈال رہے تھے۔ فقیر محمد سعید اور خواجہ مسکین پردے کئے ہوئے تھے۔ فقیر صاحب فرماتے ہیں، کہ آخر میں شیخ اخ الدین اور خان خوشحال خان خٹک بھی کفن پہناتے وقت اندر آئے۔ اور اس سعادت میں شریک ہوئے۔

تدفین آپ کی تدفین کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے، کہ باز محمد خان یوسف زئی اور خان خوشحال خان خٹک کے درمیان یہ تصفیہ ہوا تھا کہ آپ کو قبیلہ یوسف زئی اور قبیلہ خٹک کی سرحد پر دفن کیا جائے کہ دونوں قبیلوں کو یکساں شرف و سعادت حاصل ہو۔ اور اس قرار داد کے مطابق آپ کا جنازہ اُٹھایا گیا، اور جہاں آجکل آپ کا مزار مبارک واقع ہے یہاں کچھ دیر ستانے کی غرض سے جنازہ رکھ دیا گیا۔ اور پھر جب جنازہ اٹھایا جانے لگا تو وہ نہیں اٹھتا تھا۔ اسے میں حسن بیگ اتمان خیل آیا۔ اور اس نے کہا مجھے یاد ہے، کہ ایک دن حضرت شیخ المشائخ اکوڑہ سے واپس آرہے تھے میں بھی ساتھ تھا۔ جب ہم یہاں پہنچے، تو حضرت نے مجھ سے فرمایا یہاں آرام کریں گے۔

یہ زمین مجھ سے کہتی ہے، کہ مجھے اپنا مدفن بنالے۔ اور میں نے اسکی یہ درخواست منظور کرلی ہے۔ چنانچہ نشانی کے طور پر یہاں ایک پتھر گاڑ دیا گیا ہے۔ اس موقع پر جب وہ پتھر ڈھونڈا گیا، تو وہ مل گیا۔ چنانچہ سب نے ملکر یہاں ہی آپ کو دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جب یہ فیصلہ ہوا، تو جنازہ بھی اُٹھا۔ اور آپ کی تدفین عمل میں لائی گئی۔

اگرچہ آپ کے مقام تدفین کے بارے میں یہ روایت تواتر کے ساتھ بیان کی گئی ہے، مگر مجھے اس روایت کی صحت میں شک ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ نہ تو خان خوشحال خان کے بیان سے اسکی تائید ہوتی ہے، اور نہ مقامات قطبیہ سے۔ خان مرحوم نے حضرت رحمکار قدس سرہٗ سے اپنی آخری ملاقات کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے، اس ملاقات میں خان مرحوم نے حضرت سے دو باتیں عرض کی تھیں۔ یعنی ایک یہ کہ آپ کے بعد جانشین کون ہوگا؟ یعنی حضرت شیخ ضیاء الدین یا شیخ عبدالحلیم، ظاہر ہے کہ شیخ ضیاء الدین صاحب خان مرحوم کے داماد تھے۔ اس لئے خان کی یہ خواہش ضرور ہوتی کہ یہ مبارک مسند ان کے داماد کو مل جائے۔ مگر حضرت نے فرمایا کہ جسے خدا دینا چاہے، دوسری بات یہ پوچھی تھی، کہ ایک مخصوص مقام پر جہاں پانی کا چشمہ تھا، آپ کا مدفن بنایا جائے۔ لیکن حضرت نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ پھر خان موصوف نے لکھا ہے کہ "جہاں آپ نے وصیت کی تھی وہاں ہی آپ دفن ہوئے" اس لئے میرا خیال ہے کہ جہاں آج کل آپ کا مزار مبارک واقع ہے تدفین کے بارے میں آپ نے اس قطعۂ زمین کو پسند فرمایا تھا۔ اور اس کیلئے وصیت فرمائی تھی۔ میرے اس خیال کی تائید مقامات قطبیہ سے بھی ہوتی ہے۔

مقامات کے قلمی مسودے کے صفحہ ۱۲۶-۲۷ پر یہ واقعہ لکھا ہوا ہے۔

حضرت شیخ دانشمند کو حضرت رحمکارؒ کے ایک مرید نے بتایا (نام نہیں لکھا شاید یہی حسن بیگ ہوں) کہ ایک دفعہ حضرت شیخ کسی جگہ سے آرہے تھے، میں بھی ساتھ تھا۔ جب ہم اس جگہ پہنچے، جہاں آپ کا مزار ہے۔ تو حضرت شیخ المشائخ نے فرمایا: "موضع ولئی میں سبا کی بیر کا ایک باغ تھا۔ اس باغ میں سفیدے کے درخت بھی تھے۔ ان درختوں میں سے ایک درخت کے ساتھ سبا کی بیر ٹیک لگا کر بیٹھتا۔ وہ درخت اُسے آواز دیتا، کہ میں آپ کے جنازے کا تابوت بنوں گا۔ معلوم نہیں کہ سبا کی بیر وہ آواز سنتا تھا یا نہیں۔ لیکن بعد میں جب وہ فوت ہؤا۔ تو اس درخت کی لکڑی سے اس کیلئے تابوت بنایا گیا۔ اور اُسے ٹل لیجا کر دفن کیا گیا۔

وہ مرید کہتا ہے کہ شیخ المشائخ نے فرمایا۔ اسی طرح یہ زمین کہتی ہے کہ آپ کی قبر میں بنوں گی۔ مگر میں نہیں جانتا کہ کیا ہوگا۔ وہ مرید کہتا ہے کہ شیخ المشائخ کا ایسا کہنا کہ میں نہیں جانتا، محض کسر نفسی کی وجہ سے تھا۔ ورنہ اُن پر سفیدے اور اس زمین دونوں کا راز منکشف ہو چکا تھا۔

بہر حال حقیقت حال تو اللہ کو معلوم ہے، آپ کو اسی جگہ جہاں آپ کا مزار مبارک واقع ہے، دفن کیا گیا۔ جنازے میں اس قدر لوگ شریک تھے۔ کہ صفوں کی ترتیب قائم نہ رہ سکی۔ بہتر مکبرین بہ یک وقت تکبیریں کہتے تھے۔ تب لوگوں کو تکبیروں کا علم ہوجاتا۔ نماز عصر سے پہلے تدفین کا کام مکمل ہؤا اور وہ آفتاب عالم تاب جس نے چالیس سال تک اطراف عالم کو منور کیا تھا ظاہری آنکھوں سے اوجھل ہؤا۔

بہ ہر بہار گُل از زیر گل بر آرد سر

گلے بوقت کہ باید بہ صد بہار دگر

اخون زکر کہستانی اور خواجہ شمس الدین ہروی کی روایت ہے۔ کہ جب آپ کو دفن کیا گیا، تو حضرت فقیر جمیل بیگ قدس سرہٗ چند کلمات رنج و تاسف کہے اور ایک مصرعہ پڑھا جس کے سنتے ہی لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور آہ و زاری کرنے لگے۔ عام طور سے یہ بات مشہور ہے۔ کہ حضرت فقیر جمیل بیگ صاحبؒ نے یہ مصرعہ پڑھا تھا ؎

بہ بوئے تو ول عالم خوشبوئی وو
اصیل چند نرہ بہ تا بریوتل کر دوند

یعنی تمام دُنیا آپ کی خوشبو سے معطر تھی۔ (مگر) اے اصیل صندل! آپ کا جسم مبارک گرد و غبار میں اٹ گیا"

اس موقع پر حضرت شیخ گلنور صاحبؒ نے فلسفہ موت و حیات پر ایک مؤثر اور عالمانہ تقریر کی۔ اور فرمایا کہ یہ موقع گریہ و زاری اور آہ و بکا کا نہیں بلکہ صبر و تحمل اور درود و صلوٰۃ پڑھنے کا ہے۔ جس پر حاضرین کو تسکین حاصل ہوئی۔ ع

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

حضرت رحمکار قدس اللہ سرہ العزیز کے خلفاء و مسترشدین

بر ہر کہ فگندی نظرے مست و خراب است
در ساغرِ چشم تو ندانم چہ شراب است

چونکہ حضرت شیخ المشائخ قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے بہت بلند و ارفع مقام عطا فرمایا تھا۔ اور آپ کیمیا النظر تھے۔ اسلئے جو طالب صادق بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اس کی حالت ہی بدل جاتی۔ اور مٹی سے سونا اور ذرے سے

آفتاب ہوجاتا۔ اس لئے آپ کے خلفاء و مسترشدین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لوگ دُور دُور سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اور اپنی قسمت و استعداد کے مطابق فیض یاب ہوجاتے۔ ان ہزارہا عام مریدوں کے علاوہ آپ کے خاص خلفاء کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ صوبہ سرحد اور اس سے ملحقہ پنجاب کے مشہور بزرگوں میں سے جو بھی آپ کے زمانے میں گزرے ہیں۔ تقریباً وہ سب کے سب آپ ہی کے فیض یافتہ ہیں۔ بعد کے زمانے میں بھی زیادہ تر اولیاء آپ کے خلفاء سے فیض و برکت حاصل کر چکے ہیں۔ اس طرح سے درحقیقت آپ کے خلفاء و مسترشدین کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ اور ان سب کا ذکر اور ان کی تحقیق کرنا، نہ صرف باعث طوالت بلکہ ایک نہایت دقت طلب کام ہے، لہٰذا ان سطور میں حضرت شیخ المشائخ کے ان خلفاء کا ذکر کیا جائیگا جن کے نام مقامات قطبیہ کے مناقبات میاں شمس الدین و میاں محمد مبین اور مجموع البرکات میں لکھے ہیں۔

۱۔ آپ کے چاروں صاحبزادے آپ کے خلفاء اور میدان طریقت کے شہسوار تھے۔ چاروں نے آپ سے فیض حاصل کیا تھا۔ ان کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

۲۔ خواجہ شمس الدین ہردی قدس سرہٗ :- آپ حضرت رحمکار کے خاص خلفاء میں سے تھے۔ آپ نے اپنے مرشد حضرت رحمکار کے فضائل و مناقب اور مسائل تصوف کے بارے میں اسرار العارفین کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جو بدقسمتی سے آج کل نایاب ہے۔ لیکن مجموع البرکات کے مصنف نے اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے، اور اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں۔

" وازین جملہ مناقبات تصنیف خواجہ شمس الدین کہ در توران زیارت دارد ، عمدہ تراست ۔ کہ آن مانند پنج بہرہ باندازۂ تفسیر حسینی است ۔ د ازان در مناقبات واصول مناقبات عمدہ تر دیگر نیست "۔

یعنی حضرت شیخ المشائخ کے مناقب میں خواجہ شمس الدین ہروی کی تصنیف بہت عمدہ ہے ، اور یہ کتاب ضخامت میں تفسیر حسینی سے تقریباً پانچ گنا بڑی ہے ۔ اور مناقب اور اصول مناقب میں اس سے عمدہ کتاب اور کوئی کتاب نہیں ہے ۔ آپ کا مزار توران میں ہے ۔

۳ ۔ خواجہ جمال الدین قدس سرہٗ (حضرت جمیل بیگ) آپ نے بھی ایک کتاب اپنے پیر مرشد حضرت رحمکار کے حالات و مناقب میں تذکرۃ الاولیاء کے نام سے لکھی ہے ۔ اس کتاب کے بارے میں صاحب مجموع البرکات لکھتے ہیں :۔

" الغرض زیرازان (از مناقب شیخ ہروی) مناقب شیخ جمال الدین است ازہمہ عمدہ ، یعنی شیخ ہروی کے بعد شیخ جمال الدین کی لکھی ہوئی کتاب سب سے عمدہ ہے ۔ شیخ جمال الدین (جمیل بیگ) کی لکھی ہوئی اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پشتو اکیڈیمی ، پشاور یونیورسٹی میں موجود ہے ۔ اور میں نے سنا ہے کہ ایک نسخہ کابل میں " پشتو ٹولنہ " کے پاس بھی ہے ۔

شیخ جمال الدین سے مراد شیخ جمیل بیگ صاحب ہی ہیں ، جو رئیس خٹک خان شہباز خان کے فرزند اور خوشحال خان خٹک کے بھائی تھے ۔ آپ خانی د سرداری کو چھوڑ کر حضرت شیخ رحمکار کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے تھے ۔ اور حضرت رحمکار قدس سرہٗ کے خاص الخاص خلفاء میں سے تھے ۔ آپ عموماً جذب و [illegible] فراق کی حالت میں ہوتے ۔ آپ کے بارے میں ایسے بہت سے واقعات [illegible] جن سے آپ کی مستانہ اور مجذوبانہ کیفیت کا اظہار

ہوتا ہے۔ آپ مدارجِ عالیہ پہ پہنچ چکے تھے۔ آپ علاقہ خٹک کے نہایت ممتاز اولیاء اور حضرت رحمکار کے خاص رفقاء میں سے ہیں۔ آپ کا مزار موضع ننگارڈو کے قریب اکوڑہ خٹک سے بجانب جنوب اور زیارت کاکا صاحب سے بجانب مشرق چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چونکہ آپ اپنی زندگی میں فقیر کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ اس لئے اب آپ کی اولاد بھی فقیر خیل میانگان کے نام سے مشہور رہے۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے اس طبقے کے چند نوجوانوں کی تحریک سے یہ لوگ اپنے آپ کو فقیر خیل کی بجائے جمال خیل کہنے لگے ہیں۔

حضرت جمال خان صاحب کی ایک منظوم مناقب میاں شمس الدین صاحب نے لکھی ہے۔ حضرت فقیر صاحب کی اولاد موضع ننگارڈو اور چشمئی کے علاوہ تحصیل نوشہرہ کے دوسرے مقامات پر بھی آباد ہے اور معاشرے میں انکو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

۴۔ شاہ عبد اللطیف (مزار شہر بلخ) آپ کمال الدین بلخی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ حضرت شیخ رحمکار کے خاص خلفاء میں سے تھے۔ بڑے عابد و زاہد اور پاکباز تھے۔

۵۔ حضرت شیخ اخ الدین قدس سرہٗ۔ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کے اساتذہ کے سلسلے میں آپ کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ دراصل آپ روحانی فیض حاصل کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ پھر آپ کی خواہش پر حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ نے آپ سے مشکوٰۃ شریف کے چند اسباق بھی پڑھ لئے تاکہ رسمی طور پر اُستادی شاگردی کا یہ رشتہ قائم ہو جائے (جناب مولانا مفتی محمد سیاح الدین کاکاخیل ممبر اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی کتاب تذکرہ رحمکار میں زیارت کاکا صاحب کے ایک جید عالم مولانا مظاہر الحق صاحب عرف گلاب آغا

مرحوم جو حضرت شیخ اخ الدین سلجوقیؒ کی اولاد میں سے تھے، یہ بات نقل کی ہے۔ کہ مشکوٰۃ شریف کی وہی اصل کتاب ان کے پاس موجود تھی۔ اور جس حدیث کے بارے میں جناب اخ الدین صاحبؒ اور حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کے درمیان بحث ہوئی تھی، اسے نشان زد بھی کیا گیا تھا۔ اور حاشیہ پر یہ واقعہ بھی لکھا تھا۔ مگر نوابان ٹیری میں سے ایک نواب صاحب کو اس کتاب کی موجودگی کا علم ہوا۔ چونکہ نوابانِ ٹیری حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کے نہایت عقیدت مند تھے۔ اس لئے ان نواب صاحب نے وہ کتاب مولانا صاحب سے بصد اصرار حاصل کی۔ اور شاید اب بھی وہ کتاب نوابانِ ٹیری کے خاندان میں کسی کے پاس موجود ہو۔)۔

حضرت شیخ اخ الدین سنہ ۱۰۰۰ھ میں رحلت کر گئے۔ آپ کا مزار اکوڑہ خٹک میں ہے اور مرجع خلائق ہے۔ آپ کی اولاد زیادہ تر زیارت کاکا صاحبؒ میں آباد تھی۔ اور قاضیوں کے خاندان سے مشہور تھی۔ ان میں علم و فضل کے لحاظ سے بہت بڑی نامور ہستیاں گزری ہیں۔ کاکاخیل ان کی نہایت قدر و منزلت کرتے ہیں۔ آج کل ان میں سے زیادہ تر زیارت کاکا صاحب سے نقل مکانی کر چکے ہیں۔ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نہایت اہم اور نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

۶۔ حضرت شیخ گلنور صاحب قدس سرہ:۔ آپ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے خاص خلفاء میں سے ہیں۔ آپ مدارجِ عالیہ پر پہنچ چکے تھے۔ استقامت شریعت میں اس قدر بڑھے ہوئے تھے، کہ پچاس سال کے عرصے میں کبھی عذر سے بھی کسی مستحب کو بھی ترک نہیں کیا۔ اور نہ کسی مکروہ کا ارتکاب کیا۔ قول و فعل میں کتاب اللہ اور سنت رسول کے سختی سے پابند تھے۔

رسول اللہ کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے۔ آپ بہت بڑے عالم فاضل بھی تھے آپ کی عظمت و فضیلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ کئی بڑے بڑے علما و فضلا نے آپ کے مناقبات میں کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ جناب محمد رفیق صاحب تورڈھیروی۔ جناب اخون شیر محمد صاحب ساکن بنوں۔ اور جناب ابوالقاسم کابلی۔ صاحب مجموع البرکات کا بیان ہے کہ یہ کتابیں میں نے مطالعہ کی ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ ابراہیم صاحب ننگرہاری اور جناب اخون خلیل صاحب (عمرزئی چارسدہ) نے بھی آپ کے مناقبات لکھے ہیں۔

آپ کے بارے میں صاحب مجموع البرکات لکھتے ہیں حضرت شیخ گلنور صاحب قدس سرہٗ اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزاروں میں سرفہرست تھے۔ وہ اطاعت و عبادت میں سستی اور غفلت کو نہ آنے دیتے۔ اور اپنے نفس کو شکستہ رکھنے میں دنیا والوں سے گوئے سبقت لے گئے تھے۔ آپ کیمیا نظر تھے جس پر بھی نگاہ پڑتی۔ اس کا بیڑا پار ہوجاتا۔ آپ کے اکثر مرید صرف آپ کی تاثیر نظر سے مناحل مراد پر پہنچ چکے تھے۔

۷۔ غازی خان باباؒ:۔ آپ فقیر ملک میر کے بھانجے اور شیخ رحمکار کا کا صاحبؒ کے با اخلاص مرید تھے۔ آپ کا مزار قصبہ زیارت میں مزار حضرت رحمکار سے تھوڑے فاصلے پر بجانب غرب محلہ قنبر خیل میں واقع ہے۔

۸۔ میاں عبدالرحیم صاحب معروف بہ میاں جی گل صاحب قدس سرہٗ:۔ آپ بخاری سید تھے۔ بچوں کو پڑھانے کے باعث میاں جی کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ حضرت شیخ رحمکارؒ کے مخلص مریدوں میں سے تھے۔ اور اعلیٰ مدارج کو پہنچے تھے۔ آپ کا مزار ضلع کوہاٹ میں موضع لاچی سے نو میل کے فاصلے پر

شکردرہ جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ ساغری اور بھنگی خیل خٹک آپ کے مرید ہیں۔ آپ کی اولاد موضع شویکی کے علاوہ شکردرہ، اور بعض دوسرے دیہات میں بھی آباد ہے۔ اور پیر صاحبان کے نام سے مشہور ہیں۔

۹۔ شیخ علی گل و ملی گل (رحمہما اللہ تعالیٰ)۔ یہ دونوں حضرات شاید بھائی تھے۔ اور قبیلہ دلزاک سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت رحمکار کے خاص الخاص مریدوں میں سے تھے۔ ان کے بارے میں اخوند اسمٰعیل صاحب لکھتے ہیں۔

"ہر دو سرہنگان درگاہ و نہنگان محیط بارگاہ حضرت بودند۔"

اور شیخ ملی کی بابت لکھتے ہیں:۔

"شیخ ملی کہ در خلا و ملا محرم آنحضرت بود۔ اکثر اوقات ابواب گستاخی مفتوح داشتند" یعنی یہ ہر دو حضرت کی خانقاہ کے منتظم تھے۔ اور جناب شیخ ملیؒ جو حضرت کے خلا و ملا کے محرم تھے، کبھی کبھی شوخیاں بھی کیا کرتے تھے لنگر اور خانقاہ کا انتظام ان کے حوالے تھا۔ ان کے بارے میں یہ بات حد تواتر تک مشہور رہی ہے۔ کہ اگر ہانڈی سے سالن وغیرہ نکالتے وقت چمچہ وغیرہ نہ ہوتا تو وہ دیگ یا ہانڈی میں ہاتھ ڈال کر کھانا نکال لیتے تھے، اور انکے ہاتھوں کو کوئی گزند نہیں پہنچتا تھا۔

ان ہر دو صاحبان کی قبریں گنبد رحمکارؒ کے مغربی جانب چاردیواری کے اندر واقع ہیں۔

۱۰۔ شیخ بابر بابا قدس سرہٗ۔ آپ حضرت شیخ گلنور صاحب کے بہنوئی تھے۔ اور چند سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ ایک دفعہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ شیخ گلنور صاحب کے ہاں گئے تھے۔ اس موقع پر حضرت شیخ بابر صاحب بھی موجود تھے، حضرت شیخ گلنور نے شیخ بابر صاحب [illegible] حضرت [illegible] رحمکار سے [illegible]

درخواست کی۔ اور کشود کار کے لئے مدد مانگی۔ چنانچہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ نے آپ کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو باطنی فیض سے مالا مال کیا۔ اور ایک عصا دیکر فرمایا، کہ جس شخص کو ریحی دردوں کی تکلیف ہو۔ اس کو اس عصا کے پھیرنے سے اللہ تعالیٰ شفا دیگا۔ چنانچہ بہت جلد شیخ بابر صاحب کی یہ کرامت مشہور ہوگئی۔ اور دور دور سے لوگ آپ کے پاس آنے لگے، اور شفایاب ہوتے گئے۔ اتفاق کی بات ان دنوں میں صوبہ دار پشاور کو بھی ریحی دردوں کی تکلیف تھی۔ اُسکو بھی اس عصا کی خبر مل گئی۔ چنانچہ وہ بھی اس عصا کی برکت سے شفایاب ہوگیا۔ اس سے شیخ بابر صاحب کی شہرت اور بھی بڑھ گئی۔

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی وفات کے تین برس بعد ایک موقع پر پشاور کے مشہور جامع مسجد مہابت خان میں اس وقت کے علماء نے حضرت شیخ بابر صاحب قدس سرہ کے ساتھ مناظرہ کیا۔ چونکہ شیخ بابر صاحب علوم ظاہری سے بے بہرہ تھے، اس لئے علماء کے سوالات کے جواب دینے سے قاصر ہوکر بہت پریشان ہوئے۔ اور حضرت شیخ رحمکارؒ قدس سرہٗ سے توجہ کی درخواست کی۔ اسی اثنا میں روحانی طور پر حضرت شیخ قدس سرہٗ نے شیخ بابر صاحب پر ظہور فرمایا۔ اور آپ کو علمی مسائل کی ایسی تلقین کی۔ کہ آپ نے نہ صرف ان علماء کے سوالوں کے جوابات دئے، بلکہ ان علما کو بھی لاجواب کر دیا۔

حضرت شیخ بابر صاحب قدس سرہٗ کا مزار ڈاگ اسمٰعیل خیل تحصیل نوشہرہ میں ہے۔ آپ کی اولاد بھی وہاں آباد ہے۔ اور شیخ بابری میاں گان کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت شیخ بابر صاحب کی یہ کرامت اب تک جاری ہے۔ اور ریحی دردوں کی تکلیف آپ کے عصا پھیرنے سے دور

ہوجاتی ہے۔

۱۱۔ شیخ دریاخان صاحب قدس سرہٗ جمکنی:۔ آپ پہلے سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، بعد میں حضرت رحمکار کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ آپ حضرت رحمکار کاکا صاحب کے خاص خلفاء میں سے ہیں۔ جمکنی کے رئیس تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل ہوا اور ریاست چھوڑ کر فقر کی دائمی ریاست حاصل کی۔ آپ کا کچھ حال گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۱۲۔ حضرت شیخ فتح گل صاحب قدس سرہٗ:۔ آپ حضرت شیخ رحمکار کے مشہور خلفاء میں سے ہیں۔ آپ کا کچھ ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ آپ کا مزار علاقہ نیلاب میں خوڑہ سے کوہاٹ جاتے ہوئے راستے میں واقع ہے اور مرجع خلائق ہے۔

۱۳۔ شیخ عبدالرحیم خٹکؒ:۔ آپ کا مزار قصبہ زیارت کاکا صاحبؒ سے جانب مشرق موضع دوڑان میں ہے۔ اپنے وقت میں حضرت شیخ جی صاحب کی خدمت گزاری میں طاق تھے۔ بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔

۱۴۔ حضرت مرادل بابا: آپ کا مزار موضع جلوزئی محلہ سیجان تحصیل نوشہرہ میں ہے۔ اکثر جسم کے مریض آپ کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں۔ اور شفا پاتے ہیں۔

۱۵۔ شیخ محمد حیات صاحب قدس سرہٗ۔ آپ کا مزار موضع بلوٹ علاقہ ٹلسال میں ہے۔ آپ کی اولاد بھی اسی علاقے میں آباد ہے۔ آپ کا ذکر بھی گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

مندرجہ بالا صاحبان کے علاوہ حسب ذیل صاحبان بھی حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کے فیض یافتہ اور ان کے خلفاء ہیں:

شاہ عبدالرحمٰن[16] صاحب ملتانی، شیخ جنکایہ صاحب (وزیرستان) خواجہ مسکین[18] صاحب، حاجی بانو خان[19] صاحب بابین، فقیر محمد سعید[20] صاحب (دکن) آپ پشتو کے مشہور شاعر تھے۔ آپ کا دیوان بھی موجود ہے۔ خواجہ نور الحق[21] صاحب، خواجہ عبدالحق[22] صاحب، خواجہ عبدالخالق[23] صاحب، خواجہ عباس[24] صاحب، حضرت محمد عثمان[25] صاحب، خواجہ اخوند[26] ملا ... (جامع مناقب حضرت رحمکار)

خواجہ اخون یوسف[27] صاحب قندھاری، حضرت اخون اسمٰعیل[28] صاحب (چارباغ سوات) مصنف مراقبات رحمکار، جناب اخون زُفر[29] صاحب کوہستانی (جامع مناقبات رحمکار)، شاہ نبی[30] صاحب (علاقہ بنگش کوہاٹ) میاں شادی خان صاحب (موضع شادی خیل ابابٹ) میاں کمال[32] خان صاحب موضع کمال خیل کوہاٹ، کمال الدین[33] ثانی بلخی، شیخ رسول[34] مشہور بہ سرتور بابا سواتی۔ فقیر بابا اخون خیل (ہشت نگر) شیخ مرتضیٰ صاحب کوہستانی شیخ حافظ صاحب (حضرو) شیخ عنبر[38] صاحب، شیخ سرمست[39] صاحب (ہر دو صاحبان کے مزارات موضع ترنگزئی چارسدہ میں ہیں) عبدالرؤف[40] صاحب اور شیخ شاہ نظر[41] صاحب (شیرپاؤ چارسدہ) شیخ شہباز[42] صاحب، شیخ شاکر[43] صاحب، شیخ مقرب[44] صاحب شیخ گلنور[45] صاحب ثانی (موضع جورہ ...) شیخ حیات[46] خان صاحب، شیخ جوش میر[47] صاحب، شیخ مرتضیٰ[48] صاحب ثانی (ان ہر سہ صاحبان کے مزارات موضع تنگی علاقہ چارسدہ میں ہیں) حسن[49] بابا (اتمانخیل)، نور یوسف[50] صاحب (کوہ مورہ) فقیر صاحب[51] ... (مزار نزد روضہ حضرت رحمکار کاکا صاحب)

ان خوش قسمت صاحبان کے علاوہ حضرت شیخ رحمکار کے ... فیض سے اور بھی بہت سے ... نصیب ... یاب ہو چکے ہیں۔ ان میں ... نام مجموع البرکات اور دوسرے ... گران ... یہاں النا ... لات

ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ ان خلفائے نامدار کے ذریعے دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے، اور پشتونخوا میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ولی ہوگا۔ جو اس منبع فیض و برکت سے سیراب نہ ہوا ہو۔

خان خوشحال خان خٹک مرحوم حضرت رحمکارؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت شیخ رحمکار ایسے صاحب نظر اور کیمیا اثر تھے۔ کہ خاص خاص اوقات میں آپ کے خاص مریدوں میں سے جو بھی حاضر ہوتا، آپ کی نظر کیمیا اثر کی بدولت مدارج کمالات طے کر جاتا۔ اور جو مقامات دوسری جگہوں میں سالہا سال کی ریاضتوں کے ذریعے طے کرائے جاتے تھے۔ وہ صرف آپ کی ایک ہی نگاہ میں طے ہو جاتے۔ آپ کے پچاس ساٹھ مرید ایسے ہیں جو آپ کی کیمیا نظری کی بدولت سلوک کے انتہائی مدارج طے کر چکے ہیں۔ اور دُنیا و مافیہا کو ٹھوکر لگا چکے ہیں۔ اور اب لوگوں کے ارشاد و ہدایت پر مامور ہیں۔ ان میں سے ایک میرا بھائی شیخ جمیل بیگ ہیں۔ جو عبادت و ریاضت میں لاثانی ہے۔ ایک شیخ رحیم (دوڑان) ہے، جو زیادہ ریاضت اور شکستگیٔ نفس میں مجنون صفت ہے۔ صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ آپ ہر روز دریا سے لنگر خانے کے لئے پانی لایا کرتے تھے۔ اور مشک اٹھائے سر و پا برہنہ درگاہ شیخ المشائخ میں نماز پیشین تک کھڑے رہتے۔ بہت عرصہ ہوا سر پر لمبے بال رکھے ہوئے تھے۔ اور سر کے یہ بال اس کے کندھوں پر جھولتے رہتے تھے۔ یہ بال میلے کچیلے گنجلک ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ایسے بالوں کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے ۔

موئے ژولیدہ بہ تن بر سر ابتر دارم ٭ سایۂ دولت عشق است کہ بر سر دارم

حضرت شیخ کا ایک اور مرید شیخ شاہی خیل ہے۔ جو قلندرانہ شان سے زندگی گزار رہا ہے۔ اور غایت سُکر کی وجہ سے نماز روزہ سے بے پروا ننگ دھڑنگ پھرتا ہے۔ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ نہ سوتا ہے۔ بس صحرا میں دیوانہ وار پھرتا رہتا ہے۔ آخر ہوش میں آیا۔ اور بہتوں کو اپنے رنگ میں رنگا۔ اب ہمیشہ ذکر جلی میں مشغول رہتا ہے۔"

اور حضرت شیخ جیو کے مرید سڑبن، کرلانڑ اور پشتونخوا کے دوسرے علاقوں میں بے حد وحساب ہیں۔ عارف شیرازی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کیمیائیست عجب بندگیٔ پیر مغاں
خاک او گشتم و چندین درجاتم دادند

خان خوشحال خان خٹک مرحوم نے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ سے اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ (پشتو سے ترجمہ)۔

"اور حضرت شیخ نہایت باوقار اور صاحب تمکین تھے۔ کشف و کرامات کی شیخیاں نہیں بگھارتے تھے۔ کیونکہ ؎

بحر بہ صد دجلہ شد آرام گیر ؛ سیل زیک قطرہ برآرد نفیر

یعنی "سمندر سینکڑوں دریاؤں کو ہضم کرکے بھی پُرسکون ہوتا ہے۔ اور سیلاب صرف ایک قطرے سے بھی دندنانے لگتا ہے۔"

" اور اتنی عظمت کے باوجود جو ان کو حاصل تھی۔ نہ تو حالت سُکر میں نہ حالت ہوش میں، نہ حالت قبض میں اور نہ حالت بسط میں شریعت نبوی سے سرمو تجاوز کیا۔"

الغرض حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس اللہ سرہُ العزیز نے اپنے رشد و ہدایت اور فیوض و برکات کی شمع ایک ایسے علاقے میں روشن کی،

جہاں دن دہاڑے مسافر لوٹ لئے جاتے تھے۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ بھائی بھائی سے برسرپیکار تھا۔ سرکش قبائل بات بات پر تلواریں نیام سے نکال لیا کرتے تھے۔ انسانی جان و مال کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی لیکن حضرت ممدوح کی پراثر تبلیغ اور رشد و ہدایت کی تجلیات نے ان لوگوں کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اور آپ کی تعلیمات نے ان کو ایسا متاثر کیا کہ ان کا ماحول بدل گیا۔ سرکشی کی بجائے انکسار اور سنگ دلی کی بجائے رحمدلی اور خوش خلقی انکا شعار بن گئی۔ جو رہزن تھے وہ اللہ کے حضور سربسجود ہونے لگے۔ جو قاتل تھے، انکی زبان پر تسبیح و تہلیل اور استغفار کی ورد جاری ہونے لگی۔ اور بہت جلد آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی۔ آپ کی گوناگون صفات کی حامل شخصیت سے فیوض و برکات کے چشمے پھوٹنے لگے۔ اور تشنگان معرفت اور وارفتگان حقیقت جس کسی نے بھی اپنا دامن پھیلایا، گوہر مراد پایا۔ جس کسی نے فیض کی بھیک مانگی اپنے مقصد کی جھولی بھرلی۔

آپ کی نہایت بلند شخصیت، اعلیٰ و ارفع اخلاق اور روحانی عظمت و جلال کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے احساس و جذبات میں ایک تلاطم سا برپا ہو جاتا ہے۔ اور جس کے اظہار کے لئے نہ تو میرے قلم میں لکھنے کی سکت اور سہارا ہے اور نہ زبان ہی کو تاب بیان کا یارا۔

انسان کیلئے سب سے بڑی دولت و سعادت معرفت خداوندی ہے۔ اور یہ شریعت کی پیروی اور نیک اور صالح اہل طریقت کی مصاحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ معرفت الٰہی کا حصول کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لئے اخلاق کی تبدیلی، نفس کے تزکیے اور قلب و روح کی جلا نہایت ضروری

ہوتی ہے۔ ان کٹھن مراحل سے گزر کر ہی انسان اس منزل (معرفت خدا)

تک پہنچتا ہے۔ بقول شاعر ؎

رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے!

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

انہی کٹھنائیوں کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جہادِ اکبر فرمایا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوے سے واپس تشریف لائے تو فرمایا۔ کہ ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف آئے ہیں۔ اس لئے میدان جنگ میں تو دشمن سامنے ہوتا ہے۔ لیکن تزکیۂ نفس و تصفیہ اخلاق و کردار میں جس دشمن (نفس) سے پالا پڑتا ہے، وہ دکھائی نہیں دیتا۔ دل کی صفائی خدا کے ذکر اور اسرار پر غور و فکر کرنے سے ہی حاصل ہوتی ہے، اسلئے سالک کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ شریعت کے دائرے سے قدم باہر نہ رکھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ شریعت ہے، اور اس پر عمل کرنا طریقت ہے۔ اور ان دونوں کا ثمرہ حقیقت ہے۔ چنانچہ ایک سالک کے لئے شریعت کے مطابق زندگی گزارنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ گزشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے، حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ زندگی بھر شریعت نبوی پر سختی سے قائم رہے، اور شریعت نبوی پر یہ پوری پوری استقامت آپ کی سب سے بڑی کرامت ہے، آپ حقیقی معنوں میں عارف باللہ تھے۔

آپ کی شخصیت بڑی دلنواز تھی۔ آپ نہایت سخی اور مسکین نواز تھے۔ نرم دل، خوش اخلاق اور مستجاب الدعوات تھے۔ کوئی سائل آپ سے محروم نہ جاتا خواہ اس کا مطالبہ کتنا ہی بڑا ہوتا۔ حضرت خواجہ [illegible]

پر غالب رہتا تھا۔ امر حق میں بڑے بے باک تھے۔ آپ منفرد شخصیت کے حامل تھے۔ جب آپ مجلس میں موجود ہوتے تو ایسے معلوم ہوتا، گویا ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔ ہر آنکھ فرط محبت کی وجہ سے آپ ہی پر مرتکز رہتی تھی۔ یہ آپ کی کرشمہ ساز شخصیت کا ادنیٰ اعجاز تھا۔ کہ مشتاقانِ دیدا پنی نظریں لمحہ بھر کے لئے بھی آپ کے چہرے سے اِدھر اُدھر ہٹانا بے ادبی سمجھتے تھے۔ آپ کی بابرکت مجلس میں جو شخص بھی اکتساب فیض کی خاطر حاضر ہو جاتا۔ اور جبین نیاز جھکاتا، تسکین قلب اور سعادت کی دولت سے مالا مال ہو جاتا۔ اور یہی بات آج بھی آپ کے مزار پُرانوار پر حاضر ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور اس کتاب کے قارئین کو بھی اپنے فضل وکرم سے حضرت شیخ المشائخ کے فیوضات و برکات سے بہرور فرمائے۔ (آمین)

شاہا چہ عجب گر بنوازند گدا را

حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کا سلسلہ اولاد و احفاد

مراقبات رحمکارؒ، مناقبات میاں محمد مبین و میاں شمس الدین کے مطابق:-

حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ کے پانچ صاحب زادے تھے۔

۱۔ حضرت شیخ ضیاء الدین شہید قدس سرہٗ آپ عوام میں آزاد گل کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

۲۔ حضرت حاجی شیخ محمد گل صاحب قدس سرہٗ

۳۔ حضرت شیخ خلیل گل صاحب قدس سرہٗ۔ آپ عوام میں مزرے بابا کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

۴۔ حضرت شیخ دانشمند عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ۔ آپ عوام میں شیبین بابا اور صاحب ہندوستان کے ناموں سے بھی مشہور ہیں۔

۵۔ حضرت نجم الدین صاحب۔ آپ صغر سنی میں فوت ہو چکے تھے۔ آپ شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ کے مزار میں مدفون ہیں۔

حضرت شیخ رحمکار کے ایک مرید اور خلیفہ اخون اسمٰعیل صاحب (مصنف مراقبات رحمکارؒ) کے فرزند اخون مظفر صاحب نے، جو حضرت رحمکار کے مرید خاص تھے اپنی ایک نظم میں حضرت رحمکار کاکا صاحب اور ان کے صاحبزادوں کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

(۱)

قطب حق آفتاب ملت و دین | رحم در کار او نشستہ قرین
نام ہر خستہ مے کند شیرین | حضرت رحمکار شیخ امین

خلف الصدق او ضیاء الدین — نافع المسلمین و زین عباد

(۲)

نور نبود ز آفتاب جدا — نظر رحمت ار کند به گدا
بگذراند سریش ز اوج سما — صاحب مسند طریق هُدا
نیست همتا لقرص مهر ضیا — می کند خلق را بحق ارشاد

(۳)

قوت الاتقیاء ز عهد قدیم — مے کند درس عشق را تعلیم
بر صغار و کبار هست رحیم — علم و حلم اند هر دو دُر یتیم
هر دو در گوش کرده عبد حلیم — از ازل آمده است نیک نهاد

(۴)

در فصاحت چو طوطی و بلبل — در سخاوت عرق فشانده ز گل
شجر جود را ثمر بالکل — لبش آب حیات و خط سنبل
سرو باغ کرم محمد گل — نیست چون او درین زمان جواد

(۵)

بندهٔ خاص اوست مثل خلیل — وصف او می کند به ذکر جمیل
گمرهان طریق راست وکیل — دستهٔ گل بود ز نار خلیل
از سر صدق این بضاع قلیل — حق به لطف خودش نگه دارا د

(۶)

هست [illegible] زیاده شهور و متین — از صغر سن قوی و دین متین
[illegible] دیده شود زیاده حسین — که التش زر دلے صدق و یقین
[illegible] نجم الدین — [illegible] بهروان باد آباد

جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے بھی ظاہر ہے، حضرت شیخ ضیاء الدین شہید حضرت رحمکار قدس سرہ کے فرزند اکبر تھے۔ آپ ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۸ھ عہد جہانگیر پیدا ہوئے تھے۔ بڑے عالم فاضل متقی پرہیزگار عابد اور شب بیدار تھے۔ اپنے والد ماجد کے تربیت یافتہ اور دست گرفتہ تھے۔ والد کی رحلت فرمانے کے بعد آپ ہی اُن کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ اور اپنے فیوضات سے خلق خدا کو بہرہ ور کرتے رہے۔ آپ کے دست حق پرست پر اُس زمانے کے شہر باگرام (پشاور) کے چند ہندو خاندان جو سخت متعصب تھے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

حضرت ضیاء الدین شہید جناب خوشحال خان خٹک کے داماد تھے۔ اس طرح اشرف خان اور بہرام خان دونوں کے بہنوئی تھے۔ خوشحال خٹک کا خاندان قدیم سے حضرت رحمکار کاکا صاحب کا نہایت معتقد تھا۔ خوشحال خان کے والد خان شہباز خان خٹک مرحوم حضرت رحمکار کے مخلص مرید اور خاص رفقاء میں سے تھے۔ لیکن اشرف خان سے ایک ایسا فعل سرزد ہوا جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہوا یہ کہ ۱۶۶۴ء میں مغل حکومت کے صوبیدار پشاور نے ایک سازش کے تحت خوشحال خان خٹک مرحوم کو گرفتار کر کے پابہ زنجیر دہلی بھیجا۔ جہاں وہ تقریباً چار سال تک دہلی اور رنتھمبور میں قید و نظربند رہے اسی دوران میں خوشحال خان خٹک کا بڑا بیٹا اشرف خان اپنے باپ کی جگہ سردار خٹک اور مغل حکومت کا منصب دار رہا۔

اشرف خان اور بہرام خان کے درمیان خاندانی منصب کے بارے میں تنازعہ پیدا ہوا۔ چونکہ حضرت ضیاء الدین شہید ان دونوں میں منصب برحق بہ جہت بر متکلم ہی تھے اور دونوں بھائیوں کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور

آپ نے کئی بار دونوں بھائیوں میں مصالحت کرائی، مگر اشرف خان ہر بار معاہدہ صلح کی خلاف ورزی کرتا رہا۔ اور اس کے نتیجے میں بہرام خان فریادی بنکر حضرت ضیاء الدین شہید کے پاس آتا رہتا۔ بھائیوں کی یہ چپقلش آپ کو پسند نہ تھی۔ صلح وصفائی کی کوئی صورت جب آپ کو نظر نہ آئی تو مجبوراً آپ کو یہ وطن چھوڑنے کا خیال آیا۔ روایت ہے کہ کوہاٹ کے قبیلۂ بارک خٹک کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ یہاں سے ترک سکونت کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہاں سے ایک وفد آیا اور آپ کو مشورہ دیا کہ آپ ہمارے علاقے میں آکر سکونت اختیار کر لیجئے۔ حضرت ضیاء الدین قدس سرہٗ نے اس مشورہ کو پسند کیا اور جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور اپنے اہل وعیال اور مریدوں کے ہمراہ کوہاٹ چل پڑے۔

چونکہ اشرف خان حضرت ضیاء الدین شہید کا بارک خٹک کے علاقے میں جانا اپنے لئے نقصان دہ سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے آپ کے پیچھے اپنے سوار دوڑائے جنہوں نے آپ کو خوڑہ کے علاقے میں جا لیا۔ اور آپ کو اشرف خان کا پیغام پہنچایا جس میں آپ کو اکوڑہ آنے اور کوئی مصالحت کرنے کے بارے میں لکھا تھا۔ چنانچہ آپ چند خاص مریدوں کے ہمراہ اکوڑہ آئے۔ لیکن یہاں ا[illegible]ن خان نے آپ کے [illegible] بدتمیزی کا آپ کو دس دن تک قید رکھا۔ اور ایذائیں پہنچا پہنچا کر آپ کو شہید کر دیا۔ اور گیارھویں دن آپ کی لاش بھجوا دی۔ اور بہانہ یہ کیا کہ آپ کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔

حضرت ضیاء الدین شہید کی شہادت کا یہ واقعہ میاں محمد مبین صاحب مرحوم کے منظوم مناقب کے مطابق ۱۰۸۶ھ میں پیش آیا ہے اور میرے خیال میں یہ تاریخ درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اسی سال خان خوشحال خان خٹک اپنے علاقے سے بہت دور علاقہ مندڑ میں مغلوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کے سلسلے میں جرگوں میں مصروف تھے۔ یہ بات ان کے اس شعر سے معلوم ہوتی ہے۔

د دیکے خورا دلٰ کا [illegible]
ماچہ دے پہ بره [illegible]

یعنی سال ۱۰۸۶ھ ماہ جمادی الثانی کی پہلی تاریخ تھی جب میں نے یہ اشعار برہ مول میں کہتے تھے

حضرت ضیاء الدین قدس سرہ کی شہادت رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی اور ۱۰۹۲ھ میں صوبہ دار پشاور نے اشرف خان کو گرفتار کرکے پاجولان دہلی بھیجا۔ جہاں سے اسے بیجاپور (دکن) میں قید رکھا گیا۔ اور تقریباً چودہ سال تک وہ قید رہا۔ اور اسی قید کے دوران ۱۱۰۶ھ میں فوت ہوا۔ اسکی تاریخ وفات لفظ غم اندوہ سے بھی نکلتی ہے۔ جیسا کہ ان شعروں سے ظاہر ہے۔

۱۱۰۶

هجرت ز رسل او شپږ دد ؛ اشرف خان چه مړ شو یاره
غم اندوه د دهٔ تاریخ شو ؛ که حساب کړې وئے شماره

اشرف خان کو اپنے اس ظلم ناروا کا احساس خود بھی ہو چکا تھا۔ کہ جو بو دیا تھا۔ اب وہ کاٹ رہا ہے۔ یہ احساس اسکے مندرجۂ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے

زه نه د خمارو ستر کو جدا یم ؛ لاهو کړې یاره ستا غمو نو لا یم
کله چې د وطن کا نړې بوټي یاد کړم ؛ په وطن مې سلام وایه ترې جدا یم
یم د تولو ورو لو یو را سره دي ؛ بیا به تیره زهٔ د مود به غم تا لا یم
یاد کړی دغم وطن دې سادې لښته ؛ یا به ما غمو نه زور شو مبتلا یم
په دکن کښې یار و لښته جې دم کا ؛ زهٔ خوړلې اژدها تورې بلا یم
زه په بند داورنګ نړیم چه به خلاص شم ؛ زهٔ بند کړې شیخ رحمکار زیړي کاکا یم

هر ساعت مې د یار یاد په زړه کړي
دهٔ اشرف اﷲ ذکره تېر ا.م

حضرت ریاضت و عبادت میں وقت ... حضرت رحمکار کا رنگ ... ہوتا تھا اسلئے علوم نہیں، ریڑے کا کاکا ہی نہیں ہے۔

(ترجمہ) یعنی میں اپنے محبوب کے مخمور آنکھوں سے جدا ہوں۔ اے محبوب میں تیرے غموں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ ہرچند کہ میں اپنے وطن کے تھوروں اور بیل بوٹوں کو یاد رکھتا ہوں۔ پھر بھی وطن کو میرا سلام پہنچا ... کہ میں ... ہوں۔ میرے ساتھ تمام چھوٹے بڑوں کی فکر ہے لیکن والدہ کے بارے میں زیادہ مغموم ہوں۔ یا تو دکن غمکدہ ہے اور اس میں خوشی نہیں اور یا میں ... غم دائم میں مبتلا ہوں۔ دکن میں کوئی ایسا سپیرا نہیں جو مجھ پر دم پھونکے۔ مجھے تو کالے ناگ نے ڈس لیا ہے۔ میں اورنگ زیب (بادشاہ) کی قید میں نہیں ہوں کہ میں چھوٹ جاؤں گا۔ بلکہ مجھے تو پیلے رنگ والے شیخ رحمکار نے گرفتار کیا ہے۔ میری زبان پر ہر وقت اپنے محبوب کا ذکر جاری رہتا ہے۔ میں اشرف دوسرے ذکر سے کان پکڑتا ہوں۔"

اشرف خان کے بعد اُس کا بھائی بہرام خان مغل حکومت کا منصبدار ہوا۔ اور اشرف خان کے بیٹے افضل خان اور بہرام خان کے درمیان مخالفت شروع ہوئی۔ بہرام خان کی وفات کے بعد افضل خان رئیس خٹک اور مغلوں کا منصب دار مقرر ہوا۔ اس کے دور میں حضرت ضیاء الدین شہید کی اولاد اور افضل خان کے درمیان کئی لڑائیاں بھی ہوئیں، جنکے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں۔

حضرت ضیاء الدین شہید کے نو بیٹے تھے جن میں سے دو لاولد تھے۔ باقی سات بیٹوں کی اولاد کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

ا۔ نجم الدین بابا۔ آپ حضرت شہید کے بڑے بیٹے تھے۔ پیدائش ۶ محرم ۱۰۶۶ھ اور وفات ۱۱۲۰ھ ہے۔ عالم فاضل اور مدبر انسان تھے۔ آج کل آپ کی اولاد ناکا خیلوں میں "وزیر خیل" کے نام سے موسوم ہے۔ زیادہ تر زیارت کا کا صاحب میں رہتے ہیں ... زیارت کے علاوہ ... ہوتی مردان، ... چارسدہ ... گنبت ...

علاقہ چھچھ میں بھی آباد ہیں۔

۲۔ شکور گل بابا۔ آپ کی اولاد بہت قلیل ہے۔ زیارت کاکا صاحب[۲۲] میں بہت تھوڑے سے گھر ہیں۔ چند گھرانے موضع جورہ (علاقہ سنگی ہشت نگر) میں آباد ہیں۔

۳۔ برہان الدین یا برہان گل بابا۔ آپ کی اولاد میں سے صرف ایک گھرانا باقی ہے۔ جو موضع دلی نزد زیارت کاکا صاحب میں آباد ہے۔

۴۔ زین العابدین المعروف بہ باز گل بابا:۔ آپکی تاریخ ولادت تئیس[۲۳] جمادی الاولی سنہ ۱۰۷۶ھ ہے۔ اگرچہ بھائیوں میں آپ چوتھے نمبر پر تھے۔ مگر والد ماجد کی شہادت کے بعد مسند ارشاد و ہدایت پر آپ متمکن ہوئے۔ اور یہ سعادت آپ ہی کے حصے میں آئی۔ مسند ارشاد پر متمکن ہوجانے کے بعد حضرت رحمکار قدس سرہٗ نے روحانی طور پر آپ کی تربیت کی۔ اور اعلیٰ مدارج پر پہنچادیا۔ اور آج تک لوگ آپ کے فیض سے بہرہ ور ہوتے رہتے ہیں۔ اسی سجادہ نشینی کی بنیاد پر آپ کی اولاد آج تک "مصلے میانگان" کے نام سے مشہور رہے۔ ان کو "خوڑ میانگان" بھی کہتے ہیں۔ مشہور قومی اور سیاسی رہنما میاں حمید گل مرحوم (فخر قوم) اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو تحریک خلافت کے زمانے میں انگریزوں کی ایک بڑی سروس کو لات مار کر جنگ آزادی میں شامل ہوگئے تھے۔

۵۔ قیاس الدین بابا:۔ آپ اپنے تمام بھائیوں میں کثیرالاولاد ہیں۔ (ان کی تفصیل الگ بیان کی جائے گی)۔

۶۔ عباس الدین بابا:۔ آپ شیخ ضیاء الدین قدس سرہ کے فرزند ششم تھے۔ آپ کی اولاد کو عباس خیل کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کہ تو زیارت کاکا صاحب[۲۴]

میں آباد ہیں۔ اور کچھ ضلع کوہاٹ، لونڈخوڑ، جنگی ڈھیر (ضلع مردان) وغیرہ مختلف دیہات میں آباد ہو چکے ہیں۔

۷۔ دلدار الدین بابا:۔ آپ کی اولاد آفریدی میانگان کے نام سے مشہور ہیں۔ کچھ زیارت کاکا صاحبؒ میں آباد ہیں۔ بعض موضع بڈھ بیر (ضلع پشاور) علاقہ باجوڑ اور موضع بغدادہ (مردان) میں آباد ہیں۔

قیاس الدین بابا کی اولاد کی تفصیل:۔ حضرت قیاس الدین بابا اپنے تمام بھائیوں میں نہایت کثیر الاولاد ہیں۔ حضرت شہید بابا کی شہادتؒ کے بعد خوانین اکوڑہ کے ساتھ جو طویل کشمکش جاری تھی، اس میں آپ کی اولاد نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ آپ عالم فاضل اور بہترین مدبر و فہیم انسان تھے، آپ کے آٹھ صاحبزادے تھے، جنکی اولاد بہت بڑھ گئی ہے۔ اور کاکا خیلوں میں غالب اکثریت آپ کی اولاد کی ہے۔ جن کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے

(۱)۔ غیاث الدین المعروف بہ کاجی بابا:۔ آپ کی اولاد کاجی خیل کے نام سے مشہور ہے۔ تمام قیاس خیلوں میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ زیادہ تر زیارت میں آباد ہیں۔ مگر دوسرے دیہات و قصبات میں بھی کافی تعداد میں آباد ہو چکے ہیں۔ ان کا مختصراً شجرہ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں۔

(۲) غوث بابا:۔ موجودہ وقت میں آپ کی اولاد کو باباخیل کہا جاتا ہے۔ اور یہ دو شاخوں میں منقسم ہیں۔ یعنی "بر" اور "کوز" بالا و پائین۔ زیادہ تر زیارت کاکا صاحب میں آباد ہیں۔ کچھ مصری بانڈہ اور موضع پیر پیائی میں بھی آباد ہو چکے ہیں۔

(۳) خان جان بابا:۔ آپ کی اولاد آج کل میر کلانی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی غالب اکثریت زیارت کاکا صاحب میں آباد ہے۔ کچھ گھرانے تحصیل

چارسدہ ۔ اور کچھ کوہاٹ کے علاقے میں بھی آباد ہیں۔

۴ ۔ سیرالدین بابا :۔ زیارت کاکا صاحب میں آپ کی اولاد بہت کم ہے اور اکثر باہر چلے گئے ہیں ۔ ان میں سے کچھ لوگ تنگی علاقہ ہشنگر، کچھ گڑھی عثمان خیل ، اور زیادہ تر سرخ ڈھیری (مردان) میں آباد ہیں ۔ میاںگان سرخ ڈھیری نے زندگی کے ہر شعبے میں قابل قدر ترقی کی ہے ۔ ان میں قابل بیرسٹر وکیل ، انجینئر ، ڈاکٹر ، ماہرین تعلیم اور عسکری مناصب پر فائز اعلیٰ عہدیدار موجود ہیں ۔ میاں عنوان الدین مرحوم اور میاں محمد یوسف مرحوم نے پشتو ادب میں بھی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ۔ میاں محمد یوسف مرحوم نے حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کا شجرہ مرتب کرنے اور اُسے صحت تک پہنچانے میں بھی کوشش و کاوش کی ہے ۔ موجودہ وقت میں بھی ان میں پشتو ادب کے کئی اچھے اور مشہور ادیب موجود ہیں ۔ پشتو زبان کے مشہور ادیب میاں خیر الحق گوہر اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔

۵ ۔ اسرار گل بابا :۔ آپ کی اولاد کچھ تو زیارت کاکا صاحب میں اور کچھ موضع گدر (مردان) میں آباد ہے ۔ موضع گدر کے کاکا خیلوں میں میاں مقصر شاہ صاحب مرحوم بہت بڑے عالم تھے ۔

۶ ۔ عیاذ بابا :۔ آپ کی اولاد میاں گانِ سررشتہ کے نام سے مشہور ہے ۔ میاں محمد مبین مرحوم مصنف مناقب شیخ رحمکارؒ اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔

۷ ۔ انور بابا :۔ آپ کی اولاد میں ایک صاحبزادے قنبر بابا کے نام پر قنبر خیل مشہور ہیں ۔ زیادہ تر زیارت کاکا صاحب میں ہیں ۔ مگر کچھ تحصیل نوشہرہ میں اور کچھ تحصیل چارسدہ میں اور کچھ ضلع مردان کے موضع قتالی میں آباد ہیں ۔

۸ ۔ زبیر بابا: آپ کی اولاد پیر شیخ میانگان کے نام سے مشہور ہے۔ زیادہ تر زیارت کاکا صاحبؒ میں آباد ہیں۔ مگر کچھ موضع شہاب خیل (تحصیل پشاور) اور کچھ گھرانے موضع ملی نزد زیارت کاکا صاحبؒ میں آباد ہو چکے ہیں۔ میاں شمس الدین مصنف مناقب شیخ رحمکارؒ، اسی خیل سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت شیخ حاجی محمد گل قدس سرہٗ فرزند دوم کی اولاد

آپ کی پیدائش ۱۰۲۱ھ میں ہوئی اپنے والد ماجد کے تربیت یافتہ اور دست گرفتہ تھے سخاوت اور حسن اخلاق میں لاثانی تھے۔ ایک روایت کے مطابق سید آدم بنوری قدس سرہ سے بھی بیعت تھے۔ آپ دو دفعہ حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہو چکے تھے۔ ۱۰۵۲ھ میں حضرت آدم بنوری قدس سرہ بارادۂ حج ولایت افاغنہ آئے تھے۔ اور خانقاہ رحمکاریہ میں حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کے پاس تین دن ٹھہرے تھے۔ اس کے بعد حج کیلئے روانہ ہوئے۔ اس موقع پر حضرت رحمکار کے فرزند دوم شیخ محمد گل صاحب بھی آپ کے ہمراہ فریضہ حج ادا کرنے چلے گئے تھے، دوسری بار اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد بھی گئے تھے۔ مگر واپسی میں ایران کے کسی شہر میں آپ شہید کردئے گئے۔ آپ نے وصیت کی تھی، کہ اگر ہو سکے تو میری لاش وطن لے جائی جائے اور اپنے والد مکرم کے پہلو میں مجھے دفن کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی لاش کو امانت کے طور پر دفن کیا گیا تھا۔ بعد میں حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ نے روحانی طور پر شیخ عبدالحلیم کو اس واقعے کی اطلاع دیدی۔ اور ان کو ہدایت کی کہ اپنے بھائی کی لاش وطن لے آئیں۔ چنانچہ حضرت شیخ دانشمند چند مریدوں کے ہمراہ ایران چلے گئے اور وہاں سے اپنے بھائی کی لاش لاکر اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن کر دیا۔ روضہ رحمکار میں داخل ہوتے وقت پہلی قبر حضرت شیخ محمد گل صاحب کی ہے۔

زیارت کاکا صاحب میں شیخ محمد گل صاحب کی اولاد بالکل نہیں ہے۔ میاں

مہتمد اللہ مرحوم مرتّب مقامات قطبیہ کے مطابق آپ کی اولاد کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ آپ کی اولاد بہت کم ہے۔ ملاکنڈ ایجنسی میں قصبہ کوٹ میں چند افراد رہتے ہیں۔ حضرت محمد گل صاحب کے صرف ایک فرزند تھے احمد گل صاحب۔ احمد گل صاحب کا فرزند بہرہ مند تھا۔ اور ان کے صاحب زادے زیور میاں تھے۔

حضرت شیخ عبدالخلیل فرزند سوم حضرت رحمکارؒ

آپ کی ولادت سنہ [illegible]ھ میں ہوئی۔ عوام میں آپ "زمرے بابا" کے نام سے موسوم تھے۔ اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد آپ علاقہ رانی زئی ملاکنڈ ایجنسی چلے گئے۔ آپ کی اولاد بھی بہت کم ہے، چند گھرانے موضع ابازئی تحصیل چارسدہ میں، کچھ موضع ٹوٹی اور کچھ موضع آگرہ علاقہ اتمانخیل میں آباد ہیں۔

آپ کے دو صاحب زادے تھے۔ یحیٰ میاں صاحب اور کوکو لعل میاں صاحب۔ آخر الذکر لا ولد تھے۔ آپ کا مزار قصبہ زیارت کاکا صاحب میں محلہ قبرخیل میں میاں احمد شاہ کے مکان کے مشرق میں واقع ہے۔ یحیٰ میاں صاحب کے دو فرزند تھے۔ محمد غوث صاحب اور محمد سعید صاحب۔ آپ کی موجودہ اولاد ان صاحبوں کی ہے۔ آپ کی وفات ۲۷ ربیع الاول سنہ ۱۰۹۲ھ کو ہوئی۔ مزار موضع کوٹ علاقہ رانی زئی ملاکنڈ ایجنسی کے قریب ہے۔ مزار پر گنبد بنا ہوا ہے، اور مرجع خلائق ہے۔

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب فرزند چہارم حضرت شیخ رحمکارؒ

آپ عوام میں سپین بابا اور صاحب ہندوستان کے نام سے بھی مشہور رہیں۔ آپ کی ولادت ۲۷ رمضان سنہ ۱۰۲۲ھ میں ہوئی۔ چونکہ آپ بہت بڑے عالم و فاضل اور شریعت و طریقت کے اسرار و رموز کے ماہر تھے، اس لئے اُس زمانے کے دستور کے مطابق آپ کو دانشمند بھی کہا جاتا تھا۔ صاحب ہندوستان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے والد کی زندگی میں [illegible] حصول علم کی خاطر ہندوستان [illegible] سفر

گئے تھے۔ اور ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً ملتان، لاہور اور ٹھٹھہ کے علماء کرام سے علوم ظاہری کی تکمیل کی تھی۔ مسافرت کے اس طویل قیام میں آپ نے ہندوستان کے مختلف اولیائے کرام اور مجذوبان عظام سے روحانی فیض بھی حاصل کیا تھا۔ چونکہ آپ نہایت خوبصورت اور سرخ و سفید رنگ کے مالک تھے۔ اس لئے آپ کو سیین بابا بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب سلسلۂ سہروردیہ میں اپنے والد حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ اور ان کے اپنے قول کے مطابق والد گرامی قدر کی وفات کے بعد انکے روضہ مبارک میں حاضری کے اوقات میں ان سے بطریق اولیسیہ اکتساب فیض کیا تھا۔ اور درحقیقت اپنے والد ماجد کے روحانی کمالات و مراتب کے صحیح جانشین آپ ہی تھے۔ اور ہیں۔

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کا خاندان اہل سنت والجماعت حنفی المذہب اور پابند شریعت صوفیا کا خاندان تھا۔ بنیادی طور پر یہ تمام حضرات سلسلہ سہروردیہ سے منسلک ہیں۔ لیکن تمام دوسرے سلسلوں میں بھی مجاز ہیں۔ حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب نہایت پابند شریعت اور صاحب ہوش قلندر تھے۔ اور مقام محبوبیت پر فائز ہو چکے تھے۔ آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ آپ کے علمی کارناموں میں آجکل صرف ایک کتاب باقی ہے۔ جسے آپ کی اولاد میں سے ایک فاضل میاں محمد عبداللہ مرحوم نے ۱۳۱۴ھ میں "مقامات قطبیہ اور مقالات قدسیہ" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب نے اپنی وفات سے چار سال قبل ۱۰۹۲ھ میں لکھی تھی۔ دراصل یہ دو کتابیں ہیں۔ پہلے حصے میں حضرت شیخ رحمکار صاحب کے کچھ فضائل و مناقب ہیں۔ اور تصوف کیا حالات

میں حضرت شیخ المشائخ کے مقامات عالیہ کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علم سلوک و تصوف کے مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں اس کتاب میں حضرت دانشمند شیخ محمد حسین صاحب اور ان کی کتاب بحر المعانی کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ اور اس کے حوالے دیتے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کتاب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں شاہ شرف الدین منیری کی مکتوبات، "رسالہ قشیریہ" "عوارف المعارف" احیاء العلوم اور دوسرے رسائل، صوفیائے کرام کے اقوال اور صحاح ستہ کے حوالوں سے مختلف مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب بہتر سال کی عمر میں ۲۴ محرم الحرام ۱۰۹۶ھ میں بعہد اورنگزیب عالمگیر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کا مزار حضرت رحمکار قدس سرہٗ کے روضہ سے چند قدم کے فاصلے پر بجانب غرب و جنوب ایک الگ احاطے میں واقع ہے، جن لوگوں پر جنات کا اثر ہوتا ہے۔ ایسے آسیب زدہ لوگ آپ کے مزار مبارک پر لائے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شفایاب ہو کر خوش و خرم واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور عرصہ دراز سے جاری ہے۔

حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کے مزار پر گنبد آپ ہی نے تعمیر کرایا ہے۔ یہ مغل طرز تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

یہ گنبد ۱۰۸۰ھ میں مکمل ہوا ہے۔ گنبد کی تعمیر دو معماروں عیسیٰ الکریم اور جناب فضل احمد ساکنان بغداد کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے۔

حضرت شیخ عبدالحلیم کے پانچ صاحبزادے تھے جنکے نام یہ ہیں:-

(۱) افضل اللہ (۲) کاظم اللہ (۳) فتح اللہ (۴) [illegible] اللہ (۵) شیخ غنی اللہ

(۵) رحمت شاہ بابا:۔

ان کی اولاد کی مختصر تفصیل:۔

افضل بابا اور گل حسن بابا کی والدہ موضع مناہی کی ایک خٹک خاتون تھی۔ افضل بابا کے تین بیٹے تھے۔

۱۔ یمین شاہ بابا۔ ۲۔ انور شاہ بابا۔ ۳۔ عمر شاہ بابا۔

یمین شاہ بابا کی اولاد زیارت کاکا صاحب میں آباد ہے۔ دوسرے کاکاخیل ان کو میانگانِ ستنغ سر کہتے ہیں۔ راقم الحروف (بہادر شاہ ظفر) بھی حضرت یمین شاہ بابا ابن افضل بابا ابن حضرت شیخ عبدالحلیم ابن حضرت شیخ رحمکار کی اولاد میں ہے۔

آپ کی کچھ اولاد قصبہ ٹرانگ (چارسدہ) میں بھی آباد ہے۔ ان میں فی الوقت میاں مکرم شاہ اور میاں جعفر شاہ صاحبان قابل ذکر ہیں۔ کچھ موضع رجڑ (چارسدہ) میں ہیں۔

انور شاہ بابا کی کچھ اولاد تو زیارت کاکا صاحب میں ہے۔ اور کچھ نوشہرہ کلاں اور سوات میں ہے۔

عمر شاہ بابا:۔ آغاز شباب ہی میں حصول علم کی خاطر سوات گئے تھے اور وہاں حضرت اخوند درویزہ کی ایک پوتی سے دوسری شادی کی اور وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ آپ بڑے عابد و زاہد اور ساتھ ہی عالم و فاضل بھی تھے۔ حضرت عمر شاہ بابا اور اسکی اولاد کی تفصیل آپ کی اولاد میں سے ایک فاضل جناب ثناء اللہ ندیم نے کتاب ہذا کے مؤلف (بہادر شاہ ظفر) کو چند سال پہلے بذریعہ ڈاک بھیجی تھی۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ سطور لکھتے وقت مجھے وہ کاغذات تلاش بسیار کے باوجود بھی نہ مل سکے۔ اور میں روز بروز ا(؟)

بگڑتی ہوئی صحت اور عدیم الفرصتی کے باعث فی الوقت اُن کے ساتھ دوبارہ رابطہ قائم نہ رکھ سکا۔ جس کا مجھے انتہائی افسوس ہے۔

۲۔ گل حسن بابا کے ایک ہی فرزند تھے۔ اعظم بابا۔ مگر ان کی اولاد اب بالکل ختم ہے۔ اور ان میں کوئی باقی نہیں رہا۔

۳۔ فخر الدین بابا کے چار صاحبزادے تھے۔ اعظم بابا۔ عصام الدین بابا۔ محمد شاہ بابا اور شیخ جسید بابا۔

ان کی اولاد میں کچھ تو زیارت کاکا صاحب میں رہائش رکھتے ہیں۔ کچھ تحصیل نوشہرہ کے اضاخیل پایان نامی گاؤں میں۔ اور کچھ تحصیل صوابی کے مواضعات تور ڈھیر، جلبئی، جلسئی وغیرہ میں آباد ہیں۔

۴۔ شیخ غنی دل بابا:۔ آپ کے چار فرزند تھے۔ تتلان بابا شیخ دلبر بابا۔ عبدالغفار بابا۔ حاجی گل بابا۔

آپ کی کچھ اولاد تو زیارت کاکا صاحب میں ہے۔ مگر زیادہ تر نقل مکانی کر چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ تحصیل چارسدہ کے مختلف مواضعات میں اپنی جائدادوں میں رہائش پذیر ہیں۔ کچھ ضلع مانسہرہ میں ہیں۔ ان کے کچھ گھرانے مالاکنڈ ایجنسی میں موضع ملاخیلہ نزد سخاکوٹ میں اپنی زمینوں پر آباد ہیں۔

حضرت شیخ غنی دل بابا کی اولاد میں بڑے پائے کے عالم و فاضل اشخاص گزرے ہیں۔ ان میں سے مولانا عبدالحق نافع گل مرحوم حضرت مولانا عزیز گل صاحب شاگرد رشید حضرت مولانا محمود الحسن صاحب

شمس الدین مرحوم اور میاں مبین مرحوم نے بھی اپنے اپنے منظوم مناقبات میں، نہ تو "کاکا صاحب" کا لفظ استعمال کیا ہے اور نہ اپنے لئے کاکاخیل کا لفظ۔ میاں شمس الدین مرحوم بارھویں صدی ہجری کی شخصیت ہیں۔

بایں تفصیل کہ شمس الدین ابن زبیر ابن قیاس الدین ابن حضرت ضیاء الدین شہید ابن حضرت شیخ رحمکار کاکاصاحبؒ قدس سرہٗ۔

میاں شمس الدین کے منظوم مناقب کے آخری صفحہ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:۔ "تمت تمام شد مناقب حضرت غوث الاعظم، قطب عالم حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ العزیز بروز سہ شنبہ در ماہ بست و پنجم ذی الحجہ بوقت پیشین بدستخط فقیر حقیر پُر تقصیر خادم العلماء والصلحاء مرید حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ فضل حق اخونزادہ ولد حافظ عبدالحق ساکن پیر پیائی امام مسجد شیر زمان خان و مدت وحمید اللہ خان قوم فقیر خیل ساکن پیر پیائی از تپہ خالصہ ضلع پشاور یافت بر تاریخ ۱۲۰۲ھ اللّٰھم اغفرہٗ"

اسی طرح میاں محمد مبین مرحوم کی منظوم مناقب پر (۹) جمادی الاولیٰ بروز سہ شنبہ ۱۲۲۰ھ کی تاریخ درج ہے۔ مندرجہ بالا دونوں کتابوں میں جو بارھویں صدی کی تالیفات ہیں، نہ تو "کاکا صاحب" کا لفظ موجود ہے اور نہ "کاکاخیل" کا۔ البتہ میاں نقیب اللہ مرحوم کے ایک قلمی مسودے میں جو حضرت شیخ رحمکار کاکاصاحب کے شجرے کے بارے میں ہے، اور بارہ صفر ۱۳۰۹ھ کی لکھی ہوئی ہے، اس میں کاکاصاحب کا لفظ موجود ہے، عبارت اس طرح ہے۔ کہ "حضرت شیخ کستیر گل صاحب کہ معروف بہ شیخ رحمکار و کاکاصاحب بود و اولسہ سید بہادر ملتان کہ معروف بہ ایک صاحب وغیرہ وغیرہ"

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ حضرت شیخ رحمکارؒ کا عرفی نام کاکا صاحب اور اس مناسبت سے آپ کی اولاد کا تعارفی نام کاکاخیل کم از کم بارھویں صدی تک عوام میں مروج نہ تھا اور یہ دونوں نام تیرھویں صدی ہجری کے ربع اول میں مروج ہوئے ہونگے۔ اس کی وجہ میرے خیال میں یہی ہے، کہ بارھویں صدی ہجری تک کاکاخیلوں کی تعداد اتنی نہ تھی کہ ان پر ایک الگ طبقے اور قبیلے کا اطلاق ہوسکتا۔ لیکن جب انکی آبادی بڑھ گئی اور ذرائع ابلاغ و مواصلات بہتر ہوگئے تو رفتہ رفتہ یہ دونوں نام بھی مروج ہوگئے۔ اور پھر انگریزی عہد حکومت کے آغاز سے تحریر میں بھی آنے لگے۔

حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہ کی اولاد میں روحانیت کا سلسلہ چار پانچ پشتوں تک جاری رہا۔ اور ان میں بڑے متقی، پرہیزگار عابد و زاہد اور پابند شریعت افراد کثرت سے موجود تھے۔ ان میں مدبر، فہیم اور باصلاحیت افراد کی بھی کمی نہ تھی۔ اور عموماً پشتون قبائل کے تنازعات ان کے ذریعے طے ہوا کرتے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات میں تبدیلی آگئی ہے۔ اور اب وہ پہلی جیسی حالت نہیں رہی۔

کاکاخیلوں کا عمومی پیشہ تجارت ہے۔ بہت سے زراعت پیشہ بھی ہیں۔ اور اب کچھ عرصہ سے سرکاری ملازمتوں میں کافی تعداد میں موجود ہیں اور حکومت کے سول اور فوج میں کوئی محکمہ بھی ایسا نہ ہوگا، جس میں اس خاندان کے کچھ افراد موجود نہ ہوں۔

کاکاخیلوں نے آزادی وطن کی تحریکوں میں بھی اپنے تناسب آبادی کی مناسبت سے قابل قدر حصہ لیا ہے۔ حضرت مولانا عزیز گل صاحب جو

حصہ لیا ہے۔

خان بہادر میاں رحیم شاہ مرحوم نے اسلامیہ کالج پشاور کی تاسیس و قیام میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ آپ نے اس کے لئے ایک لاکھ روپیہ چندہ بھی دیا تھا۔ جو اُس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اسلامیہ کالج پشاور میں ایک ہاسٹل (رحیم شاہ وارڈ) بھی آپ ہی کے نام سے منسوب ہے۔

خان بہادر صاحب مرحوم کے ایک فرزند خان بہادر میاں فیروز شاہ مرحوم بھی بڑے مخیر اور فیاض تھے۔ آپ نے اپنے آبائی قصبہ زیارت کاکا صاحب میں ایک شاندار ہسپتال تعمیر کر کے اور اسے ساز و سامان سے آراستہ کر کے حکومت کی تحویل میں دے دیا۔ آپ نے ان دنوں میں جبکہ صوبہ سرحد کے قصبات و دیہات تو کجا بعض شہر بھی برقی روشنی سے محروم تھے، زرِ کثیر صرف کر کے حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب اور ان کے فرزند حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کے مزارات اور ان سے ملحقہ مساجد کو برقی روشنی سے منور کیا تھا۔ اور یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری تھا۔ میاں صاحب مرحوم اپنی قوم کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اور کئی موقعوں پر قوم کی نمائندہ طور پر مالی امداد بھی کی تھی۔

کاکاخیلوں نے اپنی مادری زبان پشتو کی جتنی خدمت کی ہے پشتون قبائل میں اسکی مثال بمشکل ہی مل سکیگی۔ آج سے ستر اسی سال پہلے ان میں فارسی ادب سے شغف رکھنے والے افراد بھی موجود تھے۔ مگر پشتو زبان و ادب کے ساتھ ان کو جذباتی لگاؤ تھا۔ اور ہر دور میں ان میں پشتو کے ممتاز ادیب اور شاعر گذرے ہیں۔ میاں شمس الدین مرحوم نے حضرت شیخ رحمکار اور فقیر جمیل بیگ کے نام مناقبات لکھی ہیں۔ اسی طرح کی ایک منظوم

حضرت مولانا محمود الحسن صاحب ؒ کے شاگرد رشید ہیں جزیرہ مالٹا میں اپنے استاد کی معیت میں قید و بند اور جلا وطنی کی زندگی بسر کی ہے۔ مولانا موصوف ۱۹۴۵ء سے موضع "ملاخیلہ" نزد سخاکوٹ (مالاکنڈ ایجنسی) میں جہاں انکی آبائی جائداد ہے خاموش زندگی گذار رہے ہیں۔ اور ان کی ملاقات کے لئے ملک کے مختلف حصوں سے لوگ آتے رہتے ہیں۔

مجاہد ملت میاں حمید گل مرحوم المعروف بہ "فخر قوم میاں" کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ آپ حکومت ہند (انگریزی عہد) کے سروے ڈیپارٹمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، تحریک عدم تعاون میں ملازمت چھوڑکر آزادی وطن کی تحریک میں شامل ہوئے۔ قید و بند کی تکلیفیں اٹھائیں مالی مصائب برداشت کیں، مگر تا دم آخر انگریزی حکومت سے تعاون نہ کیا۔ اسی طرح میاں صاحب فضل کریم مرحوم اور میاں صاحب جعفر شاہ مرحوم نے آزادی وطن کے سلسلے میں جو خدمات کی ہیں۔ اور جو قربانیاں دی ہیں وہ بھی ناقابل فراموش ہیں۔ میاں عطاالدین مرحوم المعروف بہ "جرنیل میاںصاحب" کی قربانیاں بھی قابل ستائش ہیں۔

کاکاخیلوں میں علوم دینیہ کے جید علماء و فضلا بھی ہر دور میں گزرے ہیں۔ اور ان میں کئی ایسے نامور علماء موجود تھے۔ جنکی علمی فضیلت اپنے زمانے میں مسلم تھی۔ موجودہ وقت میں بھی ان میں کئی نامور علماء موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں بہت سے ڈاکٹر، انجنیئر، ماہرین زراعت، پروفیسر، جنیل اور بیرسٹر اور دوسرے علوم و فنون کے ماہرین کی بھی کمی نہیں۔ اور جا پاکستان کے مختلف شعبوں میں بھی موجود ہیں۔

اس قوم کے خیر اندیش ... افراد ... رفاہ عام کے کاموں میں بھی قابل قدر

اسیر مالٹا۔ مولانا حسیم گل مرحوم جو بڑے پائے کے ادیب اور مؤرخ تھے قابل ذکر ہیں۔ محترم میاں جمیم گل مرحوم کے تمام صاحب زادے، یعنی مولانا تسنیم الحق پروفیسر مولانا تقویم الحق محترم تسطیم الحق حلیمی، پروفیسر تکریم الحق اور ڈاکٹر تنعیم الحق بھی اپنے اپنے علم و فضل کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ جناب مہتد اللہ مرحوم مرتبِ مقامات قطبیہ بھی اور ان کے فاضل نواسہ محترم سرتاج عزیز جو اپنی قابلیت کے لحاظ سے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اور اقوام متحدہ کے ادارہ خوراک و زراعت کے ایک ذمہ وار بڑے عہدے پر فائز تھے، وہ بھی شیخ غنی دل صاحب کی اولاد میں ہیں۔

۵۔ رحمت شاہ بابا۔ آپ کے دو فرزند تھے۔ میا نگل۔ ارا (لاولد) اور ولی داد بابا۔ آپ کی اولاد زیارت کاکا صاحب سے نقل مکانی کر چکی ہے۔ اور فی الوقت تحصیل چارسدہ کے موضع آگرہ میں آپکی اولاد کے چند گھرانے آباد ہیں۔

کاکاخیل:۔ گذشتہ صفحات میں حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کی اولاد کا اجمالاً ذکر کیا گیا۔ آپ کی اولاد حضرت شیخ رحمکار کے عرفی نام کاکا صاحبؒ کی مناسبت سے کاکاخیل کہلاتی ہے۔ یعنی کاکاؒ کی اولاد یا خاندان۔ مگر میرے خیال میں یہ دونوں نام یعنی "کاکا صاحبؒ" اور "کاکاخیل" زیادہ پرانے نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر میں یہ کہوں گا۔ کہ حضرت سید کستیر گل الملقب بہ شیخ رحمکار قدس سرہ کو اپنے زمانہ حیات میں لوگ "شیخ جی صاحبؒ" "شیخ رحمکار بابا" جیسے ناموں سے پکارا کرتے تھے۔ یہ بات خان خوشحال خان خٹک کے اشعار اور دوسری تحریروں سے ثابت ہوتی ہے۔ اشرف خان ہجری نے بھی ... ایسے ہی نام استعمال کئے ہیں۔ اس کے علاوہ میاں ...

مناقب میاں محمد مبین صاحب نے بھی لکھی ہے۔ میاں حبیب گل صاحب مرحوم اپنے وقت میں ممتاز ادیب و شاعر تھے۔ آپ کی بہت سی تصانیف دستبرد زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو چکی ہیں۔ چند کتابیں دستیاب ہیں جن میں ایک کتاب "نقش نگین" جو کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی کی ایک کتاب مرآۃ العروس کا پشتو میں سلیس اور بامحاورہ ترجمہ ہے۔ چھپ چکی ہے۔ باقی مفرح القلوب، کنز الفرح، چمن بینظیر، عجیب و غریب وغیرہ قلمی مسودے پڑے ہیں۔

میاں محمد جان مرحوم ایک ممتاز شاعر تھے۔ آپ کا دیوان چھپ گیا ہے۔ ابو المعانی آزاد گل آزاد بہترین شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ اور موجودہ وقت میں ان کی صاحب زادی س ب ب صاحبہ اپنے دانشور والد کی جانشینی کا حق ادا کر رہی ہیں۔ میاں مسرور گل مرحوم نہ صرف ایک بلند پایہ ادیب و شاعر تھے، بلکہ ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ آپ نے ایک نظم میں زیارت کاکا صاحب کے ایک سو آٹھ شعراء کا ذکر کیا ہے۔ میاں جمیم گل مرحوم اور میاں محمد بادشاہ مرحوم بڑے پائے کے مؤرخ تھے۔ ان ہر دو حضرات نے حضرت رحمکارؒ اور ان کے اسلاف کے حالات معلوم کرنے میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا تھا۔ میاں محمد بادشاہ مرحوم نے کاکاخیلوں کے مفصل شجرے بھی مرتب کیے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے ادیبوں نے انجمن ملیہ رحمکاریہ کے نام سے ایک انجمن بھی تشکیل دی تھی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ایک لائبریری بھی قائم تھی جس میں کم و بیش چار ہزار کتابیں موجود تھیں۔ اور اس زمانے کے تمام روزنامے اور ہفتہ وار اخبار بھی آتے رہتے تھے۔ اور قوم کے اکثر نوجوان ان سے استفادہ کرتے۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا اور ان میں ادبی ذوق پیدا ہوتا۔ اس لائبریری کے منتظم دونوں میاں

فضل الوہاب مرحوم المعروف بہ "سیکرٹری میاں صاحب" تھے۔ مرحوم سیکرٹری میاں صاحب کو لائبریری کی ترقی کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اور اپنی زندگی کے آخری سالوں میں بھی آپ اس لائبریری کی ترقی کے لئے تگ و دو میں مصروف رہا کرتے تھے۔

موجودہ زمانے میں بھی کاکاخیلوں میں کئی ممتاز ادیب، مؤرخ، مصنف

اور نازک خیال شاعر موجود ہیں۔ مولانا تسنیم الحق نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور کتاب "بہشتی زیور" کا "جنتی کالے" کے نام سے آسان پشتو میں ترجمہ کیا ہے۔ سید تقویم الحق کئی کتابوں کے مصنف اور متعدد کے مترجم ہیں آپ پشتو زبان کے ممتاز ادیبوں میں خصوصی مقام رکھتے ہیں۔ سید تکریم الحق (روغ لیونے) نے "بی بی نورہ" کے نام سے ایک تصنیف کی ہے۔ اور راقم الحروف کی رفاقت میں کئی درسی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ میاں غفران اللہ جاوید نے پشتو زبان میں معاشیات پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جو پشتو اکیڈمی نے شائع کی ہے۔ میاں خیر الحق صاحب گوہر۔ پروفیسر میاں شبیر احمد، سیف الرحمٰن سید، امان الملک نور اور میاں سناء الدین کاتب بھی اپنے ادبی تخلیقات کے باعث ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ راقم الحروف (بہادر شاہ ظفر) کم و بیش دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے کچھ تو بچوں کیلئے اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہیں، کچھ درسی کتابیں ہیں جو کئی سال مدارس میں بطور نصاب مروج رہیں، ایک پشتو گرامر ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ راقم نے پشتو زبان کی ایک مبسوط و مکمل لغت بھی ظفر اللغات کے نام سے مرتب کی ہے۔ جس میں کم و بیش پینتالیس[۴۵] ہزار الفاظ

د محاورات ہیں ۔ اور ہر لفظ و محاورے کی تشریح پشتو اور اُردو دونوں زبانوں میں کی گئی ہے ۔ اس لغت کے علاوہ چودہ سو صفحات پر محیط پشتون قوم کی ایک تاریخ "پښتانہ د تاریخ پہ رنړا کښے" (پشتون تاریخ کے آئینے میں) بھی راقم نے لکھی ہے ۔ اب اس تاریخ کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے ۔

ان کتابوں کے علاوہ راقم نے پشتون قوم کی نسلی تحقیق پر ایک اور کتاب بھی لکھنی شروع کی تھی ، جو کئی برسوں کی محنت شاقہ کے بعد بھی نامکمل صورت میں موجود ہے ۔ مگر اب اس کی تکمیل کی توقع نہیں کیونکہ راقم بینائی کی کمزوری کے باعث لکھنے پڑھنے سے معذور رہے ۔ اسی طرح راقم کا شعری مجموعہ بھی اوراقِ پریشان کی صورت میں محتاج اشاعت ہے ۔ نوجوان نسل میں میاں اکبر حیات کاکاخیل نہایت ہونہار ، ذہین بہت اچھا لکھتے ہیں ۔ توقع ہے کہ مستقبل قریب میں پشتو ادب میں اہم اور ممتاز مقام حاصل کرینگے ۔ اور قوم کی توقعات پر پورا اتریں گے ۔ مولانا انوار الحق صابر مرحوم بھی جیّد عالم ، مقرر اور اچھے شاعر ، کئی کتابوں کے مصنّف تھے ۔ اور صوبہ سرحد کے کئی کالجوں میں لکچرر پوسٹ پر سرِدس کی تھی ۔ چند سال ہوئے نوجوانی میں فوت ہوئے ۔

زیادہ تر کاکاخیل زیارت کاکا صاحبؒ میں آباد ہیں ۔ مگر بہت سے باہر کے علاقوں میں بھی آباد ہو چکے ہیں ۔ خصوصاً ضلع پشاور اور ضلع مردان میں کوئی قصبہ اور گاؤں ایسا نہ ہوگا ۔ جہاں کاکاخیلوں کے چند گھرانے آباد نہ ہوں ۔ غرض یہ کہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی اولاد بہت بڑھی اور پھلی پھولی اور یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ ملک کے جس حصے میں بھی یہ لوگ آباد ہیں ، وہاں اخلاقی ، سماجی اور معاشی لحاظ سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں ۔

اور درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کا اعزاز واکرام ہے کہ ساڑھے تین سو سال گزرنے کے باوجود روحانیت سے خالی اس گئے گزرے زمانے میں بھی حضرت شیخ رحمکار کی اولاد کو انکی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بھی سماج میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ حضرت شیخ رحمکار کی توجہ کی برکت ہے۔ کیونکہ بقول شاعر ؎

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرہ از آفتاب تابانیم!

یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ صوبہ سرحد، قبائلی علاقہ جات، بلکہ افغانستان تک میں سادات کرام کے تمام دوسرے خاندانوں کی نسبت اس خاندان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اور جس طرح حضرت شیخ رحمکار کی زندگی میں آپ کی ذات تمام پشتونوں کیلئے مرکز عقیدت ونقطہ اتحاد تھا۔ اسی طرح آپ کی رحلت فرمانے کے بعد بھی آپ کی ذات مرکز عقیدت ہے۔ اور یہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کی توجہ کی برکت اور اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے، کہ زندگی کے ہر شعبہ میں کاکاخیل ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔

یہاں میں، قارئینِ کرام کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سطور بالا میں کاکاخیلوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا محرک جذبۂ خودستائی نہیں، بلکہ اس سے میرا مقصد قوم کاکاخیل کی موجودہ نسل کو اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا بطور خاص شکریہ ادا کریں، اور خود احتیاط سے کام لیں۔

اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں اور یہ سوچیں کہ جس مردِ حق پرست کے طفیل چار سو سال گزرنے کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ نے انکو عوام اور سماج میں باعزت مقام دیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے، کہ وہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف توجہ دیں۔ کیونکہ احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔

میں اپنی قوم کے نوجوان نسل کو اس طرف متوجہ کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہونا زندہ قوموں کا شیوہ ہوتا ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنی ماضی سے واقف نہ ہو اس وقت تک نہ تو وہ اپنے حال کو روشن کر سکتی ہے اور نہ مستقبل کے خاکے میں رنگ آمیزی کے قابل ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی کا انحصار ماضی پر ہے اور ماضی کی تاریخ کو محفوظ رکھنا ایک اہم قومی ضرورت ہے۔ وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے ان کاموں کو جو یاد رکھنے کے قابل ہوں، بھلا دے یا ان کو نہ جانے۔ اگر بزرگوں کے کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور بُرا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے۔ اگر قوم کے اخلاف کچھ نہ ہوں اور ان میں خود کچھ کرنے کا جذبہ اور ولولہ نہ ہو اور صرف بزرگوں کے کاموں پر شیخی بگھارا کریں، تو یہ استخوانِ جد فروشی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اگر ان میں اُن جیسا ہونے کا ذوق اور چسکا ہو، تو پھر تو وہ امر ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلاف پرستی کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں۔ اور اپنے بزرگوں کے کارناموں کی مدح سرائی کرتے رہا کریں۔ بزرگوں کی قدر شناسی کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر قائم رہ کر ان کی ہمت اور محنت، عزم و حوصلہ، اخوت برابری

اور رواداری اور حسن اخلاق کی تقلید کریں۔

عرس یا میلہ آجکل ہر سال ۱۶ رجب سے ۲۴ رجب کی صبح تک شیخ المشائخ حضرت رحمکار قدس سرہ کی وفات کے سلسلے میں ایک عرس یا میلہ منایا جاتا ہے۔ میرے پاس کوئی ایسا دستاویزی ثبوت تو نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ عرس یا میلہ کب اور کس مقصد کی خاطر شروع کیا گیا تھا۔ بہرحال حضرت شیخ رحمکارؒ کے حالات زندگی کے مطالعے کے بعد اس بارے میں میں نے جو رائے قائم کی ہے وہ میں بعد میں ظاہر کرونگا۔ پہلے میں ایک دو فرد گذاشتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی فرد گذاشت تو یہ ہے کہ مصدقہ تاریخی شواہد کی بنا پر حضرت رحمکار کی رحلت ۲۴ رجب بروز جمعہ بوقت ایک بجے دوپہر واقع ہوئی تھی۔ اور اسی روز نماز عصر سے قبل آپکی تدفین کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ اس طرح حضرت شیخ جی صاحب کی وفات کی پہلی رات ۲۴ اور ۲۵ رجب کی درمیانی رات ہے' نہ کہ ۲۳ اور ۲۴ رجب کی درمیانی رات۔ جیسا کہ آجکل سمجھا جاتا ہے۔ ۲۳ اور ۲۴ رجب کی درمیانی رات کو حضرت ممدوح بقید حیات تھے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ روشن اور واضح حقیقت کاکاخیلوں کے بزرگ اور فہیم افراد کی نظروں سے کیسے اوجھل رہی ہے۔

دوسری بات شب وفات پر چراغان کرنے کی ہے۔ سب لوگ جانتے اور مانتے ہیں، کہ چراغان بے پایاں مسرت اور خوشی کے مواقع پر کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر عید میلاد النبیؐ کے موقع پر چراغان کیا جائے۔ تو یہ ایک موزون اور بہترین مناسب موقع ہے۔ اسی طرح اگر ۲۳ مارچ یا ۱۴ اگست کو چراغان کیا جائے تو یہ بھی نہایت موزون بات ہوگی۔ کیونکہ یہ دونوں دن ہماری قومی تاریخ کی نہایت

اہم اور پرمسرت ایام ہیں۔ لیکن حضرت شیخ رحمکار جیسی بلند و برتر شخصیت جن کے بارے میں مصدقہ شہادت موجود ہے کہ انہوں نے نہ تو حالت شکر میں نہ حالتِ ہوش میں، نہ حالت قبض میں اور نہ حالت بسط میں سنت نبویؐ سے سرِ مو تجاوز کیا تھا۔ شب وفات پر چراغان کرنا اگر ستم ظریفی نہیں تو اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیا کوئی سلیم العقل انسان بقائمی ہوش و حواس اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے دادا، والد یا کسی اور قریب ترین عزیز کی شب وفات پر چراغان کیا جائے۔ اگر وہ اپنے بارے میں اس فعل کو جائز نہیں سمجھتا اور اس سے اجتناب برتتا ہے تو پھر کاکاخیل باین ہمہ عقل و دانش اپنے عظیم المرتبت جد مکرم کی شب وفات پر اس بدعت کو کیوں پسندیدہ اور جائز سمجھتے ہیں؟ مجھے تعجب ہے کہ دور گذشتہ میں اس بدعت کے انسداد کی کوشش کیوں نہیں کی گئی۔ اور اسے اس حد تک پہنچنے دیا گیا ہے کہ اب عوام میں اسے ایک عقیدے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور اس کا انسداد مشکل معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اگر نئی نسل میں جوش کے ساتھ ہوش رکھنے والے کچھ ایسے افراد پیدا ہو گئے۔ جو اس بدعت کو خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کر سکیں۔ اور اس کے متبادل اس رات کو مجالس وعظ و ارشاد و محافل ذکر و افکار کے انعقاد میں کامیاب ہو جائیں تو میرے خیال میں یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ اور ان کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جائیگا۔ کہ

"اگر پدر نتواند پسر تمام کند"

اس چراغان کی حقیقت جہاں تک میرا خیال ہے۔ اس چراغان کی حقیقت یہ ہے، کہ زمین کا یہ ٹکڑا جہاں آجکل مزارِ رحمکارؒ واقع ہے، اور اس کے آس پاس کا تمام علاقہ حضرت ممدوح کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک بڑے بڑے تناور درختوں اور خودرو جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ اور آس پاس

کا تمام علاقہ اونچی اونچی چٹانوں اور گہری گھاٹیوں کی شکل میں تھا۔ راستے دشوار گذار اور ناہموار تھے۔ گنجان درختوں کی وجہ سے سورج ڈوبتے ہی تاریکی چھا جاتی تھی۔ قدم قدم پر سانپوں اور بچھوؤں کا ڈر لگا رہتا تھا۔ حضرت رحمکار کے طریق رشد و ہدایت کو زندہ رکھنے کی خاطر جو مجالس ذکر و فکر منعقد ہوا کرتی تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے صبح سے لیکر رات گئے تک جاری رہا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں آجکل کی طرح نہ تو بجلی تھی، نہ گیس کی قندیلیں اور نہ مٹی کا تیل۔ لے دے کے مٹی کے دیئے میں سرسوں کا تیل جلایا جاتا تھا۔ اس لئے منتظمین مجالس اور خانقاہ رحمکاریہ کے خادم شام سے پہلے ہی لنگر خانے اور مسجد، مزار، غرض ہر رہگزر پر مٹی کے دو دو، چار چار چراغ اکٹھے جلا کر رکھدیتے تھے، تاکہ آنے جانے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی آجا سکیں۔ ہر جگہ بے شمار چراغوں کے اکٹھے جلانے کا مقصد یہ تھا۔ کہ اگر کچھ دیئے بجھتے بھی جائیں۔ تو کچھ تو جلتے رہینگے اس طرح قدم قدم پر لاتعداد روشن چراغ بلاشبہ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں چراغان کا منظر پیش کرتے ہونگے۔ حالانکہ منتظمین کے وہم و گمان میں بھی اس بات کا شائبہ تک نہ تھا۔ کہ بعد کے زمانے میں اس اہم اور ضروری کام کو بلا ضرورت اور بلا جواز ایک بدعت میں تبدیل کر دیا جائیگا۔ افسوس ہے، کہ زمانۂ مابعد کے لوگوں نے اصل مقصد کی طرف تو بالکل توجہ ہی نہ دی۔ یعنی حضرت رحمکار قدس سرہ کے طریق رشد و ہدایت کو تو زندہ رکھنے کی خاطر مجالس وعظ و ارشاد و مجالس ذکر و فکر کے انعقاد کو تو بھول ہی گئے۔ اور رسمیات میں الجھ کر رہ گئے ؎

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا

ہم محو نالۂ جرس کاروان رہے

ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت رحمکار کے طریق رشد و ہدایت کو زندہ رکھنے کے لئے اور آپ کی شب وفات کو اسکی حقیقی روح اور اصلی جذبے کے ساتھ منانے کا بندوبست کیا جائے۔ اور اس سلسلے میں ایک مکمل و مفصل پروگرام مرتب کیا جائے اور اگر چراغان کی رسم کو خواہ مخواہ زندہ رکھنا ہی ہو، تو پھر حضرت رحمکار قدس سرہ کے یوم ولادت پر چراغان کیا جائے۔ یعنی یکم رمضان کی شب اول کو چراغان ہونا چاہیئے۔

میلہ یہ میلہ ۱۶ ر رجب سے شروع ہو کر ۲۴ ر رجب کی صبح کو ختم ہو جاتا ہے۔ اسکی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ جیسا گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ ۱۶ ر رجب کو حضرت رحمکار قدس سرہٗ کی بیماری میں شدت پیدا ہوئی۔ اور اس دن آپ نے اپنے خاص الخاص مریدوں کو بلا کر اُن کو سلوک و تصوف کے باریک نکات سمجھائے اور یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔ بعد میں ۲۲ رجب تک تمام مریدوں اور عوام کو حضرت کے پاس آنے کی اجازت دی گئی۔ غرض یہ کہ آپ ۲۴ ر رجب کو رحلت فرما گئے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اگلے سال آپ کے خاص الخاص خلفاء نے حضرت ممدوح کے طریق رشد و ہدایت کو زندہ رکھنے کی خاطر مجالس ذکر و فکر کے انعقاد کا اہتمام کیا ہوگا۔ اور یہ انتظام ۲۴ ر رجب تک جاری رہا ہوگا۔ ظاہر ہے، ان مجالس میں ابتدا میں کم تعداد میں لوگ شامل ہوتے ہونگے۔ لیکن بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ کثیر تعداد میں شامل ہوتے گئے ہوں گے۔ اسی طرح زائرین معتقدین کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے کچھ دوکاندار بھی آتے ہونگے۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ اس اجتماع نے ایک میلے کی شکل اختیار کر لی۔ اور بعد میں مرور زمانہ کے ساتھ اس میلے نے اتنی ترقی کی کہ ملک کے مختلف حصوں سے کم و بیش

دو لاکھ انسان اس میں شمولیت کے لئے آتے تھے۔ اور میلے کا وسیع و عریض میدان خیموں کا ایک شہر معلوم دیتا تھا۔

میلے میں کھانے پینے، مشروبات اور تفریحات کے علاوہ پشتونوں کے من پسند کھیل بھی کھیلے جاتے تھے۔ اس میلے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پشتونخوا کے ہر ایک گوشے سے دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بھی کثیر تعداد میں گروپوں کی شکل میں آیا کرتے، اور قصبے کے تمام مساجد پر قبضہ جما لیتے۔ یہ طلبہ ان دنوں میں اپنے آپ کو ہر قسم کے اخلاقی اور مذہبی قیود سے آزاد سمجھتے تھے، اور مساجد میں وہ دھما چوکڑی مچاتے کہ الامان والحفیظ۔ ان میں مختلف گروپوں کے درمیان دشمنیاں بھی ہوتیں۔ اور موقع پاتے ہی ایک دوسرے کو قتل بھی کر ڈالتے۔

اس میلے کا ایک ضرر رسان پہلو یہ تھا۔ کہ اس میں کھلے عام جوا بازی ہوا کرتی تھی۔ اور ملک کے مختلف اطراف سے نامی گرامی جوا باز یہاں آتے اور لاکھوں روپے کی ہار جیت ہوتی۔ اس کثرت سے کھلے بندوں جوا بازی کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ میلہ گزر جانے کے بعد قصبے کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی کھیل کھیل میں جوا بازوں کی نقل اتارتے اور جھوٹ موٹ کا جوا کھیلتے رہتے۔

میلے میں انتظام کی خاطر پیدل پولیس کے علاوہ گھڑسوار پولیس بھی بڑی تعداد میں موجود ہوتی۔ اور اکثر و بیشتر میلہ بخیر و خوبی ختم ہو جاتا۔ جوا بازی کے نقصانات کو قوم کا کاخیل کے بزرگ شدت سے محسوس کرتے تھے۔ مگر قوم کے بعض افراد اس میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ آخر بڑی کوشش کے بعد قوم نے متفقہ طور پر حکومت سے جوا بازی بند کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۶ء کے بعد جوا بازی قطعاً بند ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میلے کی وہ شان و شوکت اور دھوم دھام یکدم

ختم ہوگئی۔ لیکن یہ بڑا فائدہ ہوا۔ کہ کھلے بندوں ایک گھناؤنے جرم اور مضر فعل کے ارتکاب سے قوم کو نجات ملی اور نوجوان نسل کو تحفظ مل گیا۔

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ

جناب عبدالحلیم اثرؔ افغانی صاحب نے جو بڑے عالم فاضل اور مشہور ادیب ہیں، حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کے بارے میں پشتو زبان میں ایک پراز معلومات مقالہ لکھا ہے۔ جو مجلہ اباسین ۱۹۷۵ء (ماہ ستمبر۔ اکتوبر) میں شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ کے بعض چیدہ چیدہ حصوں کا ترجمہ شکریئے کے ساتھ نذر قارئین کرتا ہوں۔

جناب اثر صاحب لکھتے ہیں:۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے ضلع کوہاٹ کے جنوبی اور ضلع پشاور کے شمالی حصے کے درمیان ایک پہاڑ مغرب سے مشرق کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بالائی سرے پر آدم خیل اور جنوبی سرے کی طرف دریائے سندھ ہے۔ اس پہاڑ کے جنوب میں "خوڑہ" اور "زیڑہ" کے علاقے واقع ہیں۔ اور شمال کی طرف چراٹ اور جانہ کوڑ وغیرہ کے علاقے ہیں۔ اس پہاڑ کے دونوں طرف خٹک قوم اور انکے آستانہ دار خاندان آباد ہیں۔ ان آستانہ دار خاندانوں میں اسمٰعیلی سادات کا بھی ایک گھرانا آباد ہے۔ جو امام جعفر صادق کے بیٹے امام اسمٰعیلؒ کی اولاد ہے۔ آج ہم اس اسمٰعیلی سادات کے خاندان میں ایک عارف کامل اور فاضل عالم کا جن کا نام حضرت شیخ حلیم گل صاحب ہے تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں۔

اس اسمٰعیلی سادات کے خاندان میں ایک بزرگ کا نام "لیسین" تھا جن کا مزار [illegible] میں ہے۔ انکے بیٹے شیخ آدم کا مزار ضلع کوہاٹ کے موضع [illegible] میں ہے۔ ان کے بیٹے غالب الدین (ثانی) کا مزار علاقہ نظام پور میں [illegible] ہے۔ ان کے بیٹے شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ [illegible]

ان کے بیٹے عبداللہ ابکؒ کا مزار کوہ چراٹ کے شمالی دامن میں ہے۔ اور ان کے مزار سے چند میل کے فاصلے پر شمال مشرق کی طرف میلہ کے مقام پر ان کے فرزند شیخ عبدالرحیمؒ المعروف بہ رحیم گل اور ملقب بہ رحمکار کاکا صاحب کا مزار ہے۔

کاکا صاحب کے چار صاحبزادے تھے۔ ضیاء الدین شہید، محمد گل، خلیل گل عبدالحلیم المعروف بہ حلیم گل (کاکا صاحب کے ایک بیٹے نجم الدین صاحب بچپن میں فوت ہو چکے ہیں۔ ظفر)۔

حلیم گل صاحب فاضل عالم اور عارف کامل تھے۔ شریعت وطریقت کے تمام اسرار وعلوم سے واقف، اور ان میں ماہر تھے۔ اور اس وجہ سے لقبی نام دانشمند سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ کاکاخیل ان کو سپین بابا اور صاحب ہندوستان بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اپنے والد حضرت کاکا صاحب کی وفات (۱۰۶۳ھ / ۱۶۵۲ء) سے قبل بہت عرصہ تک ہندوستان کی سیر وسیاحت و طلب علم میں مصروف رہے تھے۔ اور صوفیائے ہند خصوصاً مجذوبان ہند سے فیض حاصل کیا تھا۔

حضرت شیخ حلیم گل صاحب کو خواجہ دانشمند بھی کہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بزرگوں کی اصطلاح میں جو بزرگ ارشاد و ہدایت (قطب الارشاد) کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے، اسکو خواجہ یعنی ریاضت وتصرفات کا بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اسے تکوینی امور کا متصرف بنایا جاتا ہے۔ یہ قطب مدار اور قطب تکوین کا مقام ہے۔ اس مقام پر فائز ہونے کے لئے ایک بزرگ کا مجذوب سالک ہونا ضروری ہے۔ یعنی کہ پہلے وہ مجذوب ہو اور پھر سالک ہو جائے۔ یہ دونوں صفات حضرت حلیم گل صاحب کو حاصل تھیں۔ اور بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا۔ کہ تصرفات اور مجذوبیت کا یہ سلسلہ آج تک حلیم گل صاحب کی اولاد میں جاری ہے۔ گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں ان کی اولاد [illegible] متعدد مجذوب اور صاحب خدمت [illegible]

له جناب [illegible] صاحب نے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ [illegible] سے مجھے اتفاق ہے۔ ظفر

یعنی روحانی فرائض بجالانے والا موجود ہوتا ہے۔ اگر ایک مجذوب فوت ہوجائے تو اس خاندان کا ایک اور آدمی مجذوب بنکر ڈیوٹی بجالانے لگ جاتا ہے۔ عالم ہوگا۔ کاروباری آدمی ہوگا۔ بڑا افسر ہوگا۔ لیکن وہ فقیر ہوگا۔ چنانچہ یہ حلیم گل صاحب کا ایک ایسا فیض ہے، جو آج تک جاری ہے۔ البتہ یہ فقیر پہچانا نہیں جاتا۔ کیونکہ ظاہری لوگوں سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ اور جو اسے پہچاننے والے ہوتے ہیں۔ ان کو راز افشا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

ب۔ حلیم گل بابا کو سیبن بابا کہنے کی وجہ یہ ہے، کہ آپ بہت خوش شکل تھے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کے ایک بیٹے کا نام محمد تھا۔ جو اپنی بے انتہا خوبصورتی کے باعث محمد دیباج کے نام سے مشہور تھے۔ کیونکہ ان کا رنگ "دیباج" کی طرح سرخ و سفید تھا۔ یہی مثال حضرت حلیم گل صاحب کی بھی تھی۔ آج بھی جو صاحب نظر ہیں، وہ جب حلیم گل صاحب کے چہرے کو دیکھتے ہیں۔ تو ان میں انکو جمال نبوی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ٹکٹکی باندھکر ان کو دیکھنا مشکل ہے۔ اور اگر کوئی حلیم گل صاحب کی تصنیف شمس العارفین کا مطالعہ کرے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھیگا، کہ شمس العارفین تو خود حلیم گل صاحب ہیں کیونکہ آنکے مبارک چہرے سے سورج کی طرح کرنیں پھوٹتی ہیں۔ جن ہوں یا انسان سب ان کے دربار میں سلام کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

حلیم گل صاحب [illegible] اور [illegible] نسبتیں رکھتے ہیں۔ اور اس مناسبت سے وہ قطب [illegible] درجے پر فائز ہیں۔ صوبہ سرحد میں قطب قلندر کا درجہ رکھنے والے اور [illegible] بزرگ ہیں۔ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کو سہروردیہ، قلندریہ [illegible] کی ماذونیت اپنے والد سے پہنچی ہے۔

حلیم گل صاحب ان طریقوں میں اپنے والد سے مجاز تھے۔ اور اس کے علاوہ زمانہ سابقہ کے دوسرے بزرگوں کی طرح اپنے زمانے کے زندہ بزرگوں کی صحبت سے اور متوفی بزرگوں کے مزارات سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ اور اس غرض سے ہندوستان کی سیاحت فرمائی تھی۔ ہندوستان کے بہت سے آستانہ دار حضرت رحمکار کاکا صاحب کے خاندان سے روحانی رابطہ رکھتے ہیں۔ مثلاً لاہور کے شیخ عماد الدین صاحب حضرت غالب بابا کے مرید تھے لاہور کے سید عبدالرزاق عرف شاہ چراغ گیلانی حضرت کاکا صاحب کے مرید تھے۔ اس طرح کئی ایک بزرگ اور بھی ہیں۔ اور چونکہ حلیم گل صاحب اپنے والد کے مرید تھے اس لئے وہ ہندوستان کے باشریعت قلندروں اور مجذوبوں کی صحبت میں بھی رہے تھے۔

کاکا صاحبؒ کا خاندان اہل سنت والجماعت، حنفی المذہب، باشریعت صوفیوں کا خاندان ہے۔ ان کا بنیادی سلسلہ سہروردیہ ہے۔ اس وجہ سے حلیم گل صاحب بھی ایک قلندر تھے۔ لیکن پابند شریعت۔ ان پر شریعت کا رنگ غالب تھا۔

حضرت حلیم گل صاحب کا مرتبہ ان کی زندگی میں قطب مدار اور قطب تکوین کا تھا۔ اس لئے ان کی اولاد میں تکوینی درویش اور متصرف موجود ہوتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت غوث العالم، قطب الاقطاب، قطب العالم، قطب مدار، قطب تکوین اور قطب ارشاد حضرت کاکا صاحب کے بعد ان کی روحانی مراتب کا حقیقی [illegible] اور وارث حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب تھے۔ اور اس کے علاوہ ان کو [illegible] کا مقام بھی حاصل ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے دانشمند اور [illegible] [illegible] [illegible] میں [illegible] جو بہت بڑا ہے۔ اور ہمارے [illegible] میں خصوصیت کے ساتھ [illegible]

حضرت غوث الخلائق اخوند درویزہ بابا کو حاصل تھا۔

جناب اثر صاحب کے مطابق حضرت شیخ عبدالحلیم کے صاحبزادوں میں سے افضل بابا اور فخرالدین بابا شاعر بھی تھے۔ آپ نے افضل بابا سے منسوب یہ شعر بھی لکھا ہے ؎

نزاکت دو کہ صنعت کہ تلازم دو
د نقیر افضل پہ شعر جندان راغے

(ماخوذ از مجلہ اباسین ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء شکریئے کے ساتھ)

جہانگیر کے ساتھ حضرت شیخ رحمکارؒ کی ملاقات کا واقعہ

ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ اکثر تذکروں میں یہ روایت ملی ہوئی ملتی ہے کہ تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے کابل جاتے ہوئے بمقام نوشہرہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ سے ملاقات کی اور اُن کو خیرآباد سے نوشہرہ تک کا علاقہ بطور جاگیر دینے کی پیشکش کی۔ مگر حضرت ممدوح نے اس کے لینے سے قطعی انکار کیا۔ اور پھر حضرت شیخ جی صاحب کی سفارش پر یہ جاگیر خان بہادر خان رئیس خٹک کو دی گئی۔ جو حضرت شیخ جی صاحب کا مرید تھا۔

اسی طرح یہ واقعہ بعض تذکروں میں حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کی بجائے حضرت مست بابا قدس سرہ سے منسوب ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ اکبر کے کسی صوبہ دار نے یہ علاقہ حضرت مست بابا کو بطور جاگیر دینے کی پیشکش کی۔ مگر حضرت نے لینے سے قطعی انکار کیا۔ اور پھر آپ کی سفارش پر یہ جاگیر ملک اکوڑ خان کو دی گئی۔ اسی طرح میاں محمد بادشاہ مرحوم کے قلمی مسودے میں مرأۃ الخیال کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ جب جہانگیر اپنی سلطنت کے آخری سالوں میں کابل

جارہا تھا، تو اُس نے بمقام نوشہرہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب سے ملاقات کی
یہ تمام باتیں تاریخی شواہد کی روشنی میں بے بنیاد ہیں۔ اور حضرت شیخ رحمکار
کاکا صاحب نہ تو اکبر سے ملے۔ نہ جہانگیر سے اور نہ کسی اور بادشاہ سے۔ اور یہ
صورت حال حضرت مست بابا کی بھی ہے۔

جہاں تک اکوڑخان کو جاگیر ملنے کا تعلق ہے، یہ اکبر کی طرف سے اسے شاہراہ
اعظم کی حفاظت کے سلسلے میں ۱۵۸۵ء میں ملی تھی، اسلئے کسی صوبہ دار کی طرف سے
حضرت مست بابا کو اس جاگیر کی پیشکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک مسلّم
تاریخی واقعہ ہے۔ اور خان خوشحال خان خٹک مرحوم نے بھی اپنی ایک نظم میں اس
کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

زهٔ خوشحال د شهباز خان يُم — چه تورزن یم کان په کان
شهباز خان د يحيیٰ خان وو — چه بل نهٔ وو هسے ځوان
يحيیٰ خان د اکوړخان وو — چه په تُوره شو سلطان
هم ئے تيغ وو هم ئے ديګ — هم ئے خُلق هم ئے احسان
د اکبر بادشاه په دور کښے — دے د دے اولس شو خان

ترجمہ: میں خوشحال خان شہباز خان کا بیٹا ہوں۔ اور پشت در پشت تلوار
[illegible] ہوں۔ شہباز خان یحییٰ خان کا بیٹا تھا، جو بہادروں میں بے مثل تھا۔
یحییٰ خان اکوڑخان کا بیٹا تھا، جو اپنی بہادری کے باعث سردار بنا۔ وہ تلوار کا بھی دھنی
تھا۔ اور ماہر تیر انداز بھی، وہ بہادر بھی تھا اور فیاض بھی، وہ خوش خلق بھی تھا۔ اور
احسان کرنے والا بھی۔ وہ اکبر بادشاہ کے عہد میں اس علاقے اور ان لوگوں کا سردار تھا
جیسا کہ خان مرحوم کے ان اشعار سے ظاہر ہے۔ اکوڑ خان اکبر بادشاہ
[illegible] رئیس بنا، اور اس نے شاہراہ کی حفاظت کی غرض

دریائے لنڈا کے کنارے مصری بانڈہ کے بالمقابل اپنے رہنے کے لئے مکانات بنوائے۔ اور حفاظت کی غرض سے چوکیاں مقرر کیں۔ اس طرح موجودہ قصبہ اکوڑہ خٹک کی بنیاد پڑی۔ جسے اُس وقت سرائے ملک پورہ کہا جاتا تھا۔ اور اب اپنے بانی کے نام پر اکوڑہ خٹک کے نام سے مشہور ہے۔

جہاں تک جہانگیر اور حضرت رحمکار کاکا صاحب کی ملاقات کا تعلق ہے، یہ بھی ایک بے بنیاد کہانی ہے جو محض خوش عقیدگی کی بنا پر گھڑی گئی ہے۔ جہانگیر نے اپنی سلطنت کی ابتدائی سالوں یعنی ۱۶۰۷ء میں کابل جاتے ہوئے بمقام نوشہرہ قیام کیا تھا۔ نوشہرہ میں اپنے قیام کا مفصل حال اس نے اپنی خود نوشت سوانح توزک جہانگیری میں لکھا ہے۔ اس سلسلے میں جہانگیر لکھتا ہے:۔

"قلعہ نوشہرہ دریائے کامہ (دریائے کابل۔ لنڈا) کے کنارے سرائے باڑہ کے بالمقابل آباد ہے۔ جن دنوں میں زین خان کابل کا گورنر تھا، تو یہ قلعہ اس نے یوسف زیوں کی سرکوبی کیلئے تعمیر کیا تھا۔ اور اس پر پچاس ہزار روپے خرچ کئے تھے۔ اس قلعہ میں علاقہ یوسف زئی کا فوجدار رہا کرتا تھا۔ اس قلعہ کا نام زین خان نے نوشہرہ رکھا تھا"۔ (آگے چلکر لکھتا ہے)

"قلعہ نوشہرہ میں احمد بیگ کابلی جاگیردار پشاور نے قبیلہ یوسفزئی اور قبیلہ غوریہ خیل کے چند ملکوں کو میری خدمت میں پیش کیا۔ چونکہ اس علاقہ میں میں احمد بیگ کابلی کی کارگزاری سے مطمئن نہ تھا۔ اس لئے میں نے پشاور کا انتظام شیر خان افغان فوجدار خیبر کے سپرد کیا"۔ (دیکھئے کتاب "پشتانہ تاریخ کی روشنی میں")۔ شیر خان روہیلہ ہندوستانی پٹھان تھا۔ اور شجاعت کے ایک کارنامے کے انعام میں اسے جہانگیر کی طرف سے شیر خان کا خطاب ملا تھا۔ یہ شخص جہانگیر کا بڑا معتمد تھا۔

اس صاف اور صریح شہادت سے واضح ہے، کہ بمقام نوشہرہ حضرت شیخ رحمکار اور جہانگیر کی ملاقات کا افسانہ بے بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اکبر کے تمام عہد سلطنت میں اور جہانگیر کے سلطنت کے بارھویں سال تک حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن ہی نہ ہوئے تھے۔ ۱۰۲۷ھ تک ان کے والد حضرت قطب عالم شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ بقید حیات اور مسند ارشاد پر متمکن تھے۔ اس صورت میں حضرت کاکا صاحب کا جہانگیر سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح جہانگیر دوسری بار اپنے عہد سلطنت کے آخری سالوں میں یعنی ۱۶۲۶ء میں کابل آیا تھا۔ لیکن اس دفعہ نہ وہ کابل جاتے اور نہ واپس آتے ہوئے بمقام نوشہرہ ٹھہرا تھا۔ بلکہ کابل سے روانہ ہوکر کشمیر چلا گیا تھا۔ اس لئے اس موقع پر بھی حضرت رحمکار کا اس کے ساتھ ملاقات کی کہانی درست نہیں ہے۔ اور محض خوش عقیدگی پر مبنی ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کی اپنی پاکیزہ زندگی اور ان کے اجداد کرام کے مسلک کا جائزہ لیں۔ تو ان کی شان سے یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے۔ ان کا مسلک بادشاہوں اور امراء سے اجتناب برتنے کا تھا۔ تاکہ کوئی مؤرخ یہ نہ کہہ سکے۔ کہ ایک فقیر تارک الدنیا بادشاہانہ جاہ و جلال سے متأثر و مرعوب ہُوا۔ ان کو نہ تو مخلوق سے ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پروا۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھے، جن کی بابت یہ کہا گیا ہے ؎

قومے کہ ہر دو کون بہ یک جو نمی خرند ؛ ایشان دم از محبت دنیا کجا زنند

اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کے اس قول کی طرف توجہ دیجئے فرماتے ہیں:۔

کسے کز قرب بادشاہِ حقیقت یافتہ به امرائے مجازی کے سر برآورد و یا اگر بر در فقرا

آیند، سعادت آن امراء باشد۔ و فقیران کہ بر درِ امراء روند، شقاوت آن فقراء بود۔ و بعض از فقراء از بادشاہان چنان احتراز کنند کہ بعض از بادشاہان از فقراء۔"

(مقامات صنک)

(ترجمہ) جس نے بادشاہِ حقیقت کی قربت حاصل کی۔ وہ مجازی امیروں کے آگے کیسے اپنا سر جھکاتے ہیں۔ اور جو امیر فقیروں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو یہ اُن امیروں کی سعادت ہوتی ہے۔ اور جو فقیر امیروں کے درباروں میں حاضر ہوتے ہیں۔ یہ ان فقیروں کی بدبختی اور شقاوت ہوتی ہے۔ اور بعض فقراء بادشاہوں سے اس طرح احتراز کرتے ہیں۔ جیسا کہ بعض بادشاہ فقیروں سے۔"

اگر ہم تعصب سے خالی الذہن ہو کر اس بارے میں سوچیں، تو کسی حکومت کی طرف سے خواہ وہ حکومت کسی کی بھی ہو، انعامات اور جاگیریں ان افراد کو ملا کرتی ہے۔ جو حکومت کے مقاصد اور عزائم میں حکومت کے آلۂ کار بن جانے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔ خواہ یہ افراد عوام میں سے اثر و رسوخ رکھنے والے ہوں۔ یا جبہ و سجادہ اور تسبیح و عمامہ کے مالک۔ یہ انعامات اور جاگیریں خاص مقاصد کو تقویت دینے اور انکی پیش رفت کے لئے دی جاتی ہیں۔ اور حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ اور ان کے اسلاف کا دامن اس قسم کی دنیوی آلائشوں سے بالکل پاک و بے داغ تھا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، جہانگیر کی طرف سے جناب پیر سباک صاحب کو جاگیر ملی تھی۔ اور اس جاگیر کی سفارش شاہ بیگ خان صوبہ دار نے جسے اکبر نے خان دوران کا خطاب دیا تھا، کی تھی۔ ممکن ہے۔ عوام نے اس چیز کو عظمت کی نشانی سمجھکر پیر سباک صاحب کی جاگیر کو حضرت شیخ رحمکار سے منسوب کیا ہو۔

جہاں تک حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کا حکام کے ساتھ ملاقات کا تعلق ہے۔ آپ صرف ایک بار فوجدار نوشہرہ اور صوبہ دار پشاور کے پاس

تشریف لے گئے تھے۔ اور وہ بھی کسی انعام واکرام کی لالچ میں نہیں بلکہ مخلوق خدا اور مظلوم انسانوں کی خدمت کے سلسلے میں۔

جیساکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اگرچہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ جسمانی طور پر علاقہ خٹک میں قیام پذیر تھے اور قدرتی طور پر قبیلہ خٹک کے لوگ آپ کے فیوضات سے زیادہ مستفید ہوا کرتے تھے لیکن دوسرے قبائل بھی آپکے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا کرتے تھے۔ اور تکلیف وآزمائش کے موقع پر حضرت شیخ جی صاحب ان کی امداد واعانت کے لئے تیار ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ مغلوں اور قبیلہ یوسف زئی کی ایک آویزش میں صوبہ دار پشاور نے انکی فصلوں کو جلایا۔ اور انکے بہت سے لوگوں کو قیدی بنایا۔ اس حادثے کے بعد قبیلہ یوسف زئی کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے دُعا اور قیدیوں کے چھڑانے کیلئے امداد کے طالب ہوئے۔ اگرچہ حضرت شیخ رحمکار کا مسلک حکامِ وقت کے ساتھ ربط وتعلق قائم رکھنے کا نہ تھا، لیکن چونکہ ان لوگوں پر بڑا ظلم ہوا تھا اس لئے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ بہ نفسِ نفیس ان قیدیوں کے چھڑانے کے سلسلے میں فوجدار نوشہرہ کے پاس تشریف لیگئے۔

یہ واقعہ حیات خان ترین (بعد میں شمشیر خان) فوجدار نوشہرہ نے خود حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کو سنایا تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ دانشمند لکھتے ہیں کہ حیات خان فوجدار نوشہرہ نے مجھ سے کہا۔ (ترجمہ) :-

"ایک دن میں اپنے ڈیرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دریا پار دوسرے کنارے پر میں نے بہت سے لوگ دیکھے۔ مجھے بتایا گیا، کہ علاقہ خٹک کے پہاڑوں میں ایک فقیر رہتا ہے۔ یہ وہی ہیں۔ اور یہ دوسرے لوگ اُن کے مرید ہیں۔ کچھ دیر بعد یہ سب کشتی کے ذریعے دریا پار کرکے میرے ڈیرے پر آگئے۔ میں نے دروازے پر حضرت شیخ صاحب کا استقبال کیا۔ اور ان کو عزت واحترام کے ساتھ بٹھایا

حضرت چند منٹ خاموش رہے۔ میں نے تشریف آوری کا مقصد پوچھا۔ آپ نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا، اور فرمایا، جو قیدی بھی تمہارے پاس موجود ہوں وہ مجھے دے دو۔ میں آپ کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ اور جتنے قیدی بھی میری تحویل میں تھے، وہ میں نے حاضر کیے۔ مگر ان میں چالیس سرکردہ افراد موجود نہ تھے ان کو میں نے اس سے پہلے پشاور بھیجدیا تھا۔ ان چالیس قیدیوں کے بارے میں حضرت نے فرمایا کہ ان کو بھی صوبہ دار سے منگوالو۔ میں نے عرض کیا۔ کہ حضرت یہ بات تو میرے بس میں نہیں ہے۔ صوبہ دار میرا اعلیٰ حاکم ہے۔ میں اُسے حکم نہیں دے سکتا جتنے قیدی یہاں موجود ہیں۔ وہ سب میں حضرت کے حکم کے مطابق چھوڑ دیتا ہوں۔ حضرت نے میری معروضات کو غور سے سُنا۔ اور پھر صرف پانی پیا۔ اور اسی وقت ان چالیس قیدیوں کی رہائی کے لئے پشاور روانہ ہوئے۔

پشاور پہنچکر آپ ارباب عثمان خان (ہزارخوانی) کے مکان پر ٹھہر گئے۔ یہ ارباب ان دنوں قبیلہ غوریہ خیل میں سب سے بڑا ارباب اور حکومت مغلیہ کا معتمد تھا۔ حضرت شیخ رحمکار صاحب نے ارباب عثمان سے فرمایا، کہ وہ صوبہ دار سے ان چالیس قیدیوں کو آزاد کرائے۔ مگر ارباب نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ اور حضرت شیخ رحمکار صاحب کی امداد سے گریز کیا۔ رات گزارنے کے بعد آپ خالی ہاتھ واپس آئے۔ دو تین دن کے بعد آپ دوبارہ پشاور تشریف لیگئے۔ اور ارباب عثمان خان سے پھر وہی بات کہی مگر ارباب نے پھر بھی ہمت نہ کی۔ بلکہ طنزاً کہا۔ کہ حضرت! صوبہ دار ماننے والا نہیں ہاں اگر کوئی کرامت دکھائیے تو شاید کچھ کام بن جائے۔ حضرت نے جواب دیا، میں فائدے کے لئے آیا ہوں، نہ کہ نقصان کے لئے۔ آپ کوشش تو کریں۔ مگر ارباب صاحب نے پھر بھی ہمت نہ کی۔ اسی اثنا میں صوبہ دار کو بھی حضرت کے آنے کی اطلاع مل گئی۔ تو اس نے کہا میں نے بہتوں کی کرامت دیکھی ہے اور فقیر دیکھے ہیں جب تک چالیس ہزار روپے [illegible]

ادا نہ کیا جائے۔ میں ان قیدیوں کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ چنانچہ حضرت شیخ صاحب نے فرمایا۔ اچھا اللہ تعالی ان مظلوموں کی رہائی کے لئے کوئی صورت پیدا کرلیگا۔ چنانچہ آپ نے قیدیوں کے متعلقین کو صبر کرنے کی تلقین کی اور آپ واپس چلے آئے۔

اب خدا کی قدرت دیکھیئے۔ کہ اسی صوبہ دار نے دوبارہ یوسف زئی کے علاقہ پر حملہ کیا لیکن اچانک ایسی شدید بارش ہوگئی کہ تمام ملک جل تھل ہوگیا۔ اور صوبہ دار کا تمام کیمپ غارت ہوگیا۔ اور وہ خود بھی یوسف زیوں کے ہاتھوں اسیر ہوا۔ اب اسے خود اپنی جان کے لالے پڑگئے۔ چنانچہ اپنی رہائی کے عوض اُس نے نہ صرف ان چالیس قیدیوں کو رہا کیا۔ بلکہ ان کو خلعت بھی دئے۔ اور اس کے علاوہ یوسف زیوں کو ایک بہت بڑی رقم بطور جرمانہ بھی ادا کی۔"

اس واقعے کے بعد جو نتائج ظاہر ہوئے۔ حضرت شیخ دانشمند اس کے بارے میں لکھتے ہیں، کہ اس واقعے میں تین باتوں کی طرف دھیان دینا چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ حیات خان ترین فوجدار نوشہرہ نے حضرت شیخ صاحب کا احترام کیا اور آپکی سفارش پر بلاچون وچرا اپنے پاس موجود تمام قیدیوں کو رہا کردیا۔ تو حضرت کی دُعا اور توجہ کی برکت سے اُسے بہت جلد ترقی مل گئی۔ اور اسے پانچ ہزاری کا منصب اور شمشیر خان کا خطاب مل گیا۔

دوم وہ صوبہ دار جس نے قیدیوں کی رہائی کے لئے چالیس ہزار روپے مانگے تھے۔ خود یوسف زیوں کے ہاتھوں ذلیل ہوا۔ اور حکومت کے عتاب میں بھی آگیا۔ اور اُس کی تنزلی ہوگئی۔ اور تیسری بات یہ کہ ارباب عثمان خان جس نے حضرت رحمانی کی امداد سے گریز کیا تھا بلکہ طنزاً انکو کرامت دکھانے کے لئے کہا تھا، خود بھی اور اُس کا تمام خاندان بھی تباہ و برباد ہوگیا۔ یہاں تک کہ اُس کی اولاد میں بعض بعض گداگری کرتے ہوئے بھی دیکھے گئے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس زمانے میں اکثر پشتون قبائل پر بایزید انصاری کے اخلاف کا اثر و اقتدار بہت زیادہ تھا۔ لیکن ان کے خاص الخاص مریدوں کے علاوہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے۔ تمام قبائل کے لوگ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کے ارادت مند تھے۔ اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ حضرت رحمکار صاحب کے بہت سے مرید۔ وادی کرم، ٹل، خوست، مروت، وزیرستان اور بنگش کے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

غرض جسمانی لحاظ سے اگرچہ حضرت رحمکار صاحب علاقہ خٹک میں مقیم تھے لیکن آپ کی روحانیت کا دائرہ ملک کے تمام خطوں پر محیط تھا۔ اور آج بھی یہ بات مشاہدہ کی جاسکتی ہے کہ نہ صرف صوبہ سرحد کے کونے کونے سے بلکہ ملک کے مختلف خطوں اور افغانستان تک کے لوگ بھی روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے مزار پر حاضری دیا کرتے ہیں۔ ان میں بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جوان بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی، چاق و چوبند بھی اور لنگڑے لولے معذور بھی، اور جس طرح رنگ روپ، قد و قامت اور خط و خال میں تنوع ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی خواہشات اور تمنائیں بھی متنوع ہوتی ہیں۔ مگر سب اپنی مراد کو پہنچتے ہیں۔ بشرطیکہ آنے کا مقصد نیک اور دل میں خلوص ہو۔ یہ نرا دعویٰ نہیں بلکہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے جس کا جی چاہے آزما کر دیکھ لے۔ اور جب ایک دیانتدار انسان روزانہ انسانوں کے اس جم غفیر کو دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے لسان الغیب ترجمانِ حقیقت حضرت عبدالرحمن مرجی قدس سرہٗ کے ان اشعار کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

هر بهار لره خزان په جهان شته دے

خزان نه لري بهار د دلربانو

ھسے کرم بازار ہل پہ جہان نشتہ
لکہ کرم دے بازار د درویشانو

(ترجمہ) "دنیا میں ہر بہار کے لئے خزان مقدر ہے۔ مگر درویشوں کی بہار خزان سے بے نیاز ہے۔ (اور) دنیا میں درویشوں کے بازار جیسا پُر رونق بازار اور کہیں بھی نہیں ہے۔

معاصر اولیاء کیساتھ حضرت شیخ رحمکار کا روحانی رابطہ

حضرت شیخ المشائخ قطب الاقطاب شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے جس ارفع و بلند مقام پر فائز کیا تھا۔ اور پھر آپ کی رحلت فرمانے کے بعد آپ کے مزار مقدس سے جس طرح فیوض و برکات کے چشمے پھوٹنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاصر اولیاء اللہ کے معتقدین و لواحقین میں جو پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے فرضی افسانے بنا بنا کر کسی نے حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ کو حضرت اخون پنجو صاحب قدس سرہٗ کا مرید ظاہر کیا، تو کسی نے آپ کو حضرت پیر سباک صاحبؒ کا دست گرفتہ اور فیض یافتہ بتایا۔ اور بعضوں نے آپ کو حضرت حاجی بہادر صاحبؒ کوہاٹی کا ماذون قرار دیا۔ مقصد یہ تھا۔ کہ جب ان حضرات کے مرید اور فیض یافتہ اس قدر عظیم مراتب پر پہنچ گئے ہیں۔ تو ان کے پیر کا مقام و مرتبہ تو کہیں بڑھ کر ہی ہوگا۔ حالانکہ یہ تمام افسانے خود ساختہ اور بے بنیاد ہیں۔ اور واقعات اور تاریخ کی روشنی میں اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میں سب سے پہلے جناب رضوانی مرحوم کی تالیف تحفۃ الاولیاء سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں اور پھر واقعات کی روشنی میں اس کا جائزہ پیش کیا جائیگا۔

جناب رضوانی مرحوم اپنی کتاب تحفۃ الاولیاء کے صفحہ ۳۰ پر لکھتے ہیں:

"کاکا صاحب ابن ایک صاحب ابن مست صاحب ابن غالب صاحب ہستند که دراصل از سادات ترکستان بودند۔ مگر بسبب اقامت در ملک خٹک به خٹک منسوب شدند (۱) پدر ایشان شیخ ایک صاحب از اول مرید اخون پنجو اکبر پورہ بودند (۲) او بخواب دید که کف زہر البش از سرش بالا رفته متحیر شد۔ پیش اخوند پنجو صاحب اکبر پورہ آمدہ۔ (۳) ایشان تعبیر خوابش چنین کردند۔ که پسرت خواہد شد۔ که در شہرت و برکات از تو زیادہ خواہد بود۔ چون بخانه آمد پسرش تولد یافته بود۔ او را در پور زڑی که طفل پیچک باشد بخدمت پیر خود برد۔ ایشان درحق آن مولود دعا کرد، نامش رحمکار نہادند۔ (۴) شیخ ایک بطور شکرانه ہفت گز کرباس و یک خروس سفید بخدمت اخون پنجو صاحب پیش کرد۔ چنانچه اولاد ایشان الی الآن آن شکرانه سال به سال به زیارت اخون صاحب مے برند" (۵) خوارق و کرامات و تصرفات حضرت کاکا صاحب بحد لیست که بیان نتواند کرد۔ مفصل مناقب و حالات ایشان میاں حلیم گل صاحب فرزند ایشان به فارسی نوشته که مطبوع و متداول بین الناس است۔ کاکا به زبان افغانی ہر مرد پیر را بطور احترام مے گویند۔ ایشان از کثرت ریاضت ہمیشه زرد مے ماندند۔ ازین به "زڑی کاکا" مشہور شدند چرا که "زیڑے" به افغانی زرد را گویند"۔

"ملک خوشحال خان سردار قوم خٹک به سبب بد دعائے جناب کاکا صاحب ہمیشه ذلیل و رسوا ماند و آخر اورنگ زیب عالمگیر او را قید کردہ به ہندوستان برد۔ چنانچه او در زندان این شعر حسب حال خود گفته ؎

زۀ په بند دا درنگ نه یم چه به خلاص شم

زۀ بند کړے شیخ رحمکار زیړي کاکا یم" (۶)

تحفۃ الاولیاء کے مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) یہ کہ حضرت کاکا صاحب نسباً سادات ترکستان میں سے تھے۔ مگر علاقہ خٹک میں رہنے کی وجہ سے خٹک مشہور ہو گئے۔

(۲) ان کے والد حضرت شیخ ابک صاحب حضرت اخون پنجو صاحب اکبرپورہ کے مرید تھے۔

(۳) حضرت شیخ ابک صاحب نے ایک خواب دیکھا اور اس کی تعبیر ان کے پیر نے یہ بتائی کہ آپ کا ایک بیٹا تولد ہوگا، جو مراتب میں آپ سے زیادہ ہوگا پھر شیخ ابک صاحب اپنے نومولود بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر اپنے پیر کے پاس لے گئے۔ پیر صاحب نے بچے کو دعا دی۔ اور اس بچے کا نام رحمکار رکھا۔

(۴) اس موقع پر شیخ ابک صاحب نے بطور شکرانہ سات گز کھدر اور ایک سفید مرغ اخوند صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

(۵) نذرانہ آج تک حضرت رحمکار کی اولاد اخوند پنجو صاحب کے مزار پر پہنچاتے ہیں۔

(٦) خان خوشحال خان خٹک حضرت رحمکار کی بددعا سے ہمیشہ ذلیل و خوار رہا۔ اور آخر اورنگ زیب نے اسے قید کر لیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب میں جناب رضوانی مرحوم کی باتوں کا جائزہ تاریخ کی روشنی میں لینا چاہتا ہوں۔

(۱) رضوانی مرحوم کی پہلی بات درست ہے۔ یعنی یہ کہ حضرت رحمکارؒ کے اجداد مشہد سے نقل مکانی کر کے پہلے بخارا میں مقیم ہوئے۔ بعد ازاں آپ کے بعض اجداد بخارا سے نقل مکانی کر کے پشین چلے آئے۔ اس زمانے میں پشین بھی قندھار و غزنی کے علاقے کا ایک حصہ تھا۔ اور پھر مرور زمانہ کے ساتھ پشین سے غزنی، خوست اور بالآخر علاقہ خٹک کے مختلف مقامات پر مقیم ہوئے۔ اور وہاں ہی فوت ہو گئے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ حضرت رحمکار کا خاندان علاقائی لحاظ سے خٹک ہے نہ کہ نسبی لحاظ سے۔ لیکن رضوانی مرحوم کی باقی تمام باتیں تاریخی لحاظ سے درست نہیں ہیں کیونکہ

ا - حضرت شیخ بہادر صاحبؒ (اکب صاحب) کی تاریخ ولادت ۹۲۱ھ جبکہ اخون پنجو صاحب کی تاریخ ولادت بقول روحانی رابطہ ۹۳۷ھ اور بقول رضوانی مرحوم ۹۴۵ھ ہے۔ بہر حال اخون پنجو صاحب کی جو تاریخ ولادت بھی درست مانی جائے پھر بھی اخون پنجو صاحب اور اکب صاحب تقریباً ہم عمر اور ہم عصر ہیں۔

ب - حضرت اخون پنجو صاحب نے بقول رضوانی مرحوم ۹۹۱ھ میں ابوالفتح قنباچی سے بیعت کی ہے۔ یعنی تقریباً چھیالیس (۴۶) کی عمر میں اور اگر آئینہ تصوف کی روایت درست مانی جائے، تو اس کے مطابق اخون پنجو صاحب نے ۹۹۷ھ میں حضرت اخون درویزہؒ سے بیعت کی ہے۔ اور یہ بات زیادہ قرین صحت ہے۔ کیونکہ دوسرے تذکروں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخون پنجو صاحب نے حضرت اخون درویزہؒ سے بیعت کی ہے۔ (دیکھئے تذکرہ اولیائے ہند حصہ دوم ص۱۱۲)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اخون پنجو صاحب ساٹھ سال کی عمر میں حضرت اخون درویزہ سے بیعت ہوئے۔

ج - مصدقہ روایات کے مطابق حضرت شیخ بہادر صاحب (اکب صاحب) عالم شباب میں اپنے والد مکرم حضرت شیخ نادر صاحبؒ (مست بابا) سے سلسلۂ سہروردیہ اور چشتیہ میں بیعت ہو چکے تھے۔ بعد میں آپ نے شیخ محمد جعفر لاہوری سے سلسلہ چشتیہ میں اور شیخ حمزہؒ کشمیری سے سلسلہ سہروردیہ میں بھی اکتساب فیض کیا ہے۔ اس لئے جب اخون پنجو صاحب ۹۹۱ھ یا ۹۹۷ھ تک خود کسی سے بیعت نہ ہوئے تھے، تو پھر حضرت شیخ بہادر صاحب (اکب صاحب) کا ان سے بیعت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

د - مصدقہ تاریخی شواہد کی روشنی میں حضرت شیخ جنید صاحبؒ کی ولادت ۹۸۳ھ میں ہوئی ہے۔ مندرجہ بالا وضاحت کی روشنی میں حضرت اخون پنجو صاحب کی بیعت کا سال خواہ [illegible] میں اس وقت

حضرت شیخ رحمکار کی عمر آٹھ سال یا چودہ سال (روایتوں کے اختلاف سے) ہوگی۔ ظاہر ہے کہ آٹھ سال یا چودہ سال کی عمر میں کپڑے میں لپیٹ کر کسی کو کسی کے پاس نہیں لیجایا جاتا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ رضوانی مرحوم کا یہ سارا بیان محض عوام میں پھیلی ہوئی بے بنیاد باتوں پر مبنی ہے۔

۱۷ - رہی سفید مرغ اور سات گز کھدر والی بات۔ تو جب اوپر کی وضاحت کی روشنی میں یہ تمام معاملہ خود ساختہ ثابت ہوتا ہے، تو پھر تو سفید مرغ اور کھدر والی بات بھی من گھڑت ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی تمام عمر میں (جو کہ اب تقریباً اسی کے قریب ہے) نہ تو یہ بات کسی سے سنی ہے اور نہ کسی کو اس پر عمل کرتے دیکھا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات واقع میں ہوتی، تو موجودہ زمانے میں نہ سہی کسی ماقبل زمانے میں تو ہوئی ہوگی۔ مگر ایسا ہرگز کبھی بھی نہیں ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اس قسم کی کوئی بات نہ تو مقامات قطبیہ میں موجود ہے، نہ فقیر جمیل بیگ صاحب کے تذکرۃ الاولیاء میں اور نہ کسی اور منظوم یا منثور مناقب میں۔ لہٰذا یہ سب باتیں غلط ہیں۔

اسی طرح خان خوشحال خان خٹک کے بارے میں رضوانی مرحوم نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بھی غلط اور بے بنیاد ہیں۔ حضرت رحمکار صاحب کا خوشحال خان کو بددعا دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خوشحال خان خٹک مرحوم حضرت رحمکار کے مخلص عقیدت مند تھے۔ انہوں نے حضرت رحمکار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔ البتہ جو باتیں رضوانی مرحوم نے خوشحال خان خٹک سے منسوب کی ہیں۔ یہ ان کے بیٹے اشرف خان خٹک سے متعلق ہیں۔ اور یہ شعر بھی خوشحال خان خٹک کا نہیں بلکہ اشرف خان ہجری کا ہے۔

اب آپ [illegible] دیکھ لیجیے۔

جو باتیں رضوانی مرحوم نے تحفۃ الاولیا میں لکھی ہیں۔ تقریباً اسی قسم کی باتیں مختلف پیرائے میں مجمع البرکات میں بھی لکھی ہوئی ہیں۔ مجمع البرکات کے مطابق حضرت اخون پنجو صاحب نے اول حضرت نادر خان صاحب (مست بابا)

۱۔ سے سلسلہ سہروردیہ میں بیعت اور استفادہ باطنی کر کے خلافت حاصل کی۔ بعد میں ہندوستان چلے گئے۔ اور وہاں دوسرے اولیاء کرام سے بھی فیض حاصل کیا۔

۲۔ اور عمر کے آخری حصہ میں جب کہ حضرت شیخ بہادر صاحب (اکب بابا) کی عمر میں پندرہ سال باقی تھے، آپ طریق چشتیہ میں اُن سے بھی بیعت اور استفادہ کرنے کی خاطر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

۳۔ جب اخون پنجو صاحب شیخ بہادر صاحب کی ملاقات کو جارہے تھے، تو راستے میں بچوں کے ساتھ حضرت شیخ رحمکار کو بھی دیکھا۔ حضرت رحمکارؒ کی عمر اس وقت پانچ چھ سال تھی۔ حضرت اخون پنجو صاحب نے ان بچوں میں نور فراست سے حضرت رحمکار کو پہچانا اور فرمایا کہ "یہ بچہ ایک کامل ترین ولی ہے"۔

۴۔ پھر آپ سے خطاب کر کے فرمایا۔ اے بچے آپ کس کے صاحبزادے ہیں؟ آپ نے فرمایا "میں شیخ اکب کا فرزند ہوں۔ اس پر اخون پنجو صاحب نے اپنا لعاب دہن آپ کے منہ میں ڈالا۔ آپ کو پیار کر کے سینے سے لگایا اور فرمایا: اے صاحبزادے دیکھئے میں نے تو آپ کو فصاحت و بلاغت کا یہ مرتبہ دیا کیا آپ بھی مجھے کوئی کمال عطا فرمائیں گے"؟ آپ نے فرمایا "میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ میرے والد [illegible] ہیں۔ آپ اُن سے ملیں"۔ پھر اخون صاحب نے فرمایا۔ اچھا [illegible] اپنے والد کے جانشین بن گئے تو پھر"؟ اس پر آپ نے فرمایا: پھر بھی میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا [illegible] آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

سے کچھ طلب کریں۔ غرض اس قسم کی بات جیت کے بعد آپ حضرت شیخ بہادر
صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اُن سے بیعت کی۔ اور اُس کے بعد آخر
تک آمد و رفت جاری رکھی۔

۸۔ مجمع البرکات کے مطابق ایک دن حضرت اخون صاحب نے شیخ بہادر
سے عرض کیا کہ یا حضرت! مجھے اپنی کوئی نشانی دیدیجئے۔ اس پر حضرت بہادر
صاحب نے فرمایا اے اخون صاحب ایک سفید مرغ لے آئیں۔ جب اخون
سفید مرغا لے آئے تو حضرت بہادر خان صاحب نے فرمایا یہ مرغا میں آپ کو واپس
دیتا ہوں۔ یہی طرف سے آپ کے پاس ا[illegible] نشانی ہے۔

محمود [illegible] کے اس بیان سے ہمیں مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ حضرت اخون پنجو صاحب پہلے حضرت مست بابا کے مرید تھے۔
۲۔ [illegible] جب کہ حضرت شیخ بہادر صاحب کی عمر کے پندرہ سال باقی تھے
آپ حضرت شیخ بہادر صاحب سے بیعت ہوئے۔
۳۔ اس وقت حضرت [illegible] کاکا صاحب کی عمر پانچ چھ سال تھی۔
۴۔ حضرت اخون پنجو صاحب نے اپنے مرشد حضرت شیخ بہادر صاحب سے کوئی
نشانی مانگی اور انہوں نے اخون صاحب کا پیش کردہ سفید مرغا انہیں
نشانی واپس دیا۔

اب حقائق کی روشنی میں ان باتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ حضرت اخون پنجو صاحب کا حضرت مست بابا سے بیعت ہونا تو قرین قیاس
ہو سکتا ہے لیکن حضرت شیخ بہادر [illegible] سے ان کا بیعت ہونا درست معلوم
نہیں ہوتا کیونکہ جیسا کہ معلوم ہے حضرت شیخ بہادر صاحب کی تاریخ ولادت
۹۳۱ [illegible] مجمع البرکات کے [illegible] صاحب کی وفات [illegible]

سال پہلے حضرت اخون پنجو صاحب ان سے بیعت ہوئے تھے۔ حضرت شیخ بہادر صاحب سنہ ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت اخون پنجو صاحب نے آپ سے سنہ ۱۰۱۲ھ کے لگ بھگ بیعت کی ہوگی۔ اس وقت حضرت شیخ بہادر صاحب کی عمر اکہتر سال تھی۔

۲۔ حضرت اخون پنجو صاحب کی تاریخ ولادت سنہ ۹۳۷ھ کو اگر درست مانا جائے، تو سنہ ۱۰۱۲ھ میں ان کی عمر پچھتر سال ہوگی۔ اور ان کی تاریخ ولادت سنہ ۹۴۵ھ درست ہے تو سنہ ۱۰۱۲ھ میں ان کی عمر ستاسٹھ سال ہوگی۔ بہرحال اتنی عمر میں حضرت اخون پنجو صاحب جیسی عظیم شخصیت اتنے طویل عرصے تک کسی سے بیعت کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اور پھر اس صورت میں واضح شہادت بھی موجود ہے کہ آپ نے سنہ ۹۹۷ھ میں اخون درویزہ سے بیعت کی ہے۔ اور یہ بات متعدد تذکروں میں موجود ہے۔

۳۔ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کے بارے میں حضرت اخون پنجو صاحب سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ اگر یہ باتیں اس بیعت والے موقع کی سمجھی جائیں تو یہ معاملہ اور بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس بیان کے مطابق حضرت رحمکار کاکا صاحب اس وقت پانچ چھ سال کے بچے تھے۔ اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ گفتگو سنہ ۹۸۸ یا سنہ ۹۹۰ھ میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ حضرت رحمکار کی تاریخ پیدائش سنہ ۹۸۲ھ ہے۔ حالانکہ اوپر ہم نے واضح کیا ہے کہ اگر یہ بیعت ہوئی ہو تو سنہ ۱۰۱۲ھ میں ہوئی ہوگی۔ اور اس وقت حضرت رحمکار کی عمر انتیس [29] سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اور اس عمر میں حضرت رحمکار کاکا صاحب مجاہدات اور ریاضات میں مصروف تھے۔ پھر ان کا بچوں کے ساتھ کھیلنے اور اٹھنے بیٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مجمع البرکات اور تحفۃ الاولیاء دونوں کے بیانات سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ اور حقائق سے دور ہیں۔ میرا قیاس یہ ہے۔ کہ نہ تو اخون پنجو صاحب نے حضرت شیخ بہادر صاحب سے بیعت کی ہے۔ اور نہ شیخ بہادر صاحب اخون پنجو صاحب کے مرید تھے۔ البتہ چونکہ دونوں خدا کے نیک بندے، ہم عصر بلکہ تقریباً ہم عمر، ایک ہی علاقے کے رہنے والے، ایک مسلک رکھنے والے اور ایک ہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دنوں میں تحریک روشنیہ بھی جوش و خروش سے جاری تھی۔ اس لئے عین ممکن ہے، کہ دونوں حضرات کئی بار ایک دوسرے سے ملے ہوں گے۔ اور ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ہو۔

اس صورت میں حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کا حضرت اخون پنجو صاحب کے مرید ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر محض روایات کا سہارا لیا جائے۔ تو چونکہ مجمع البرکات تحفۃ الاولیاء سے تقریباً ایک سو بیس[۱۲۰] سال پہلے کی تالیف ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوش عقیدت میں مجمع البرکات کی روایات کو محرف شکل میں تحفۃ الاولیاء میں دہرایا گیا ہے۔

جناب پیر سباکؒ اور حضرت شیخ رحمکارؒ کا روحانی رابطہ

محترم سرفراز خان عقاب اپنے کتابچے موسوم بہ کاکا صاحبؒ کے صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں:۔

قصۃ المشائخ (۸۵-ا) میں لکھا ہے، کہ حضرت پیر سباک کے بہت سے مرید تھے۔ چنانچہ شیخ رحمکار خٹک جن کا مزار حدود خٹک میں ہے۔ اور کامل و مکمل پیر تھے۔ وہ حضرت پیر سباک کے صحابہ میں سے تھے۔ (مرید کے بعد "صحابہ میں سے ایک" معاملے کو مشکوک بنا دیتے ہیں)۔

لیکن اس بیان سے تقریباً (۱۱۴۶-۱۰۷۹) ۶۷ سال پہلے اخوند اسمٰعیل کی منقبت ۱۶ میں لکھتا ہے:۔ "آنحضرت نے حسن بیگ سے جو کہ آپ کے مریدوں میں سے ایک تھا... کہا: یہ خیر خواہ خلائق ولی ہیں جو کہ اس پیر کا باغ تھا۔ اپنے پیر اور دستگیر پیر سباک کی قدم بوسی کے شرف سے مشرف تھا" اسمٰعیل نے یہ باتیں حسن بیگ اتمان خیل کی زبانی لکھی ہیں"۔

"عبدالحلیم منقبت ۶۶ میں لکھتا ہے"۔ اور بعض لوگ سمجھتے ہیں، کہ حضرت شیخ المشائخ ہمارا شیخ ایک بار سباکی پیر کو دیکھنے گیا تھا۔ بس یہ مرید ہونے کی نشانی ہے۔ اور اس فقیر نے آنحضرت کے کئی اصحاب سے پوچھا ہے، انہوں نے منظور نہ کیا۔ اور اس بات کو غلط اور خطا بتلایا۔ اور آنحضرت پیر سباکی کی مدح کی کوئی بات اس فقیر اور دوسرے مریدوں کے سامنے بیچ میں ہرگز نہ لاتے تھے۔ اور اگر بزرگوں کی مدح کرتے تو بیچ میں اپنے باپ حضرت شیخ بہادر قدس سرہٗ کی مدح کیا کرتے۔ اور بہت کچھ کہتے اور اس کے مزار پر انوار پر بھی بہت جاتے تھے۔ اور حاضر ہوا کرتے تھے"۔

اور میں نے آنحضرت سے نہیں سنا لیکن ادب اور مدح اور اسکی قبر

کی طرف بہت جانے سے۔ دل میں آتا ہے کہ اپنے باپ کی طرف سے سلسلہ سہروردیہ میں نسبت رکھتے تھے۔ اور جب اپنے باپ کا نام لیتے تو ادب کے طریقے سے لیتے۔ اور انہیں "رشتینے" کہتے۔ یعنی راستگو۔ اور اگر کبھی پیر سباک کا نام لیتے۔ تو خٹک قوم کے کہنے کے مطابق لیتے کہ خٹک اولس کے بعض لوگ اسے سبا کی بیر کہتے تھے۔"

"اور شاہی فقیر سے منقول ہے کہ جب میں ابتدائے حال میں اپنے شیخ کی قدمبوسی سے مشرف ہُوا۔ تو کچھ مدت کے بعد پیر سباک کے خاندان نے کہا، کہ آنحضرت پیر سباک کے مریدوں میں سے تھے۔ اس لئے میں انکی طرف مائل ہُوا۔" اس کے بعد جب میں آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہُوا تو اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا، کہ میں ایک دن سبا کی بیر کو دیکھنے کے لئے گیا تھا جب میری نظر اس پر پڑی تو دیکھتے ہی سبا کی بیر اٹھا اور وجد میں آیا۔ اور ناچا۔ اور سماع میں آیا یا ہُوا۔ پس شاہی فقیر نے کہا کہ میں بہ تحقیق جان گیا۔ کہ آنحضرت پیر سباک کے مرید نہ تھے۔ افتراتھا۔"

راقم الحروف (یعنی عقاب خٹک) عبدالحلیم اور شاہی فقیر کے بیانات کو اخوند اسمٰعیل اور حسن بیگ اتمانخیل کے کہنے پر ترجیح دیتا ہے، کہ آپ نے پیر سباک کو اپنا پیر کہا۔ لیکن عبدالحلیم کا یہ کہنا درست نہیں۔ کہ آپ پیر سباک سے صرف ایک بار ملے تھے۔ کیونکہ مراقبات کے بعض نسخوں میں آپ کا پیر سباک کے پاس جانے کا ذکر دو دفعہ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو مناقب ۲، ۱۶۔ نیز آپ کے طریقے سے عبدالحلیم کے لکھنے کی تردید ہوتی ہے۔

اور تحفۃ المشائخ کے لکھے کو اس لئے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ اس [illegible] پیر سباک کے مریدوں میں سے صرف [illegible] لکھنے پر اکتفا کیا

ہے۔ اس کا کیا مطلب؟ (کتابچہ صفحہ ۵)

مندرجہ بالا اقتباس جناب سرفراز خان عقاب کے کتابچے موسوم بہ کاکا صاحب کے صفحہ ۲ تا صفحہ ۵ سے لیا گیا ہے۔ اِس اقتباس سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ قصۃ المشائخ کے مطابق حضرت پیر سباک کے بہت سے مرید تھے۔ مثلاً شیخ رحمکار کاکا صاحب۔

۲۔ مراقبات کے منقبت صفحہ ۱۶ کے مطابق حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ نے حسن بیگ اتمان خیل سے فرمایا، کہ وہ ایک بار اپنے پیر دستگیر پیر سباک سے ملنے کیلئے دلی گیا ہوا تھا۔ وغیرہ۔

۳۔ حضرت عبدالحلیم صاحب نے اپنی کتاب مقاماتِ قطبیہ کے منقبت ۲۶ میں اس بات کو غلط بتایا ہے۔

۴۔ شاہی فقیر سے منقول ہے کہ جب میں حضرت رحمکار کی قدمبوسی سے پہلی بار مشرف ہوا۔ تو کچھ مدت کے بعد خاندانِ پیر سباک کے افراد نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت رحمکار پیر سباک صاحب کے مرید تھے۔ اس لئے میں ان کی طرف مائل ہو گیا۔

۵۔ شاہی فقیر مزید یہ کہتا ہے، کہ جب میں دوبارہ حضرت رحمکار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو حضرت رحمکار نے میرے سامنے خود فرمایا کہ میں ایک بار پیر سباک کے دیکھنے کیلئے گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

۶۔ اس بات سے شاہی فقیر کو یقین ہو گیا۔ کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب کا جناب پیر سباک کے مرید ہونے کی بات غلط تھی۔

۷۔ عقاب صاحب کے خیال میں حضرت عبدالحلیم صاحب کا یہ کہنا درست

نہیں، کہ حضرت رحمکار جناب پیر سباک کے دیکھنے کے لئے ایک بار گئے تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے۔ کہ مراقبات رحمکار کے بعض نسخوں میں آپ کا پیر سباک کے پاس دو بار جانے کا ذکر ہے۔

جناب عقاب صاحب نے خود بھی قصۃ المشائخ کی عبارت پر شک ظاہر کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ عبارت نہ صرف مشکوک بلکہ بالکل ایک خود ساختہ کہانی ہے۔ اور اس کی تردید شاہی فقیر کے صریح اور واضح قول سے ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ قصۃ المشائخ کا مؤلف ایک ہوشیار آدمی تھا۔ اُس نے سوچا کہ ایسی عبارت لکھنی چاہیے کہ "ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔" چنانچہ اُس نے مختصر طور پر ایک سادہ اور بے ضرر سا جملہ لکھا کہ "حضرت پیر سباک کے بہت سے مرید تھے۔" ظاہر ہے کہ مرید تو انسان ہی ہوتے ہیں اور بحیثیت انسان کے ان کے نام بھی ہوتے ہیں۔ اور اُن کا کوئی نہ کوئی نام بھی ہوتا ہے۔ اور پھر کسی عظیم مقدس ہستی سے دامنگیر ہونے کے باعث وہ خود بھی عوام میں مشہور ومعروف ہوتے ہیں۔ اور اگر سارے نہیں تو "بہت" میں سے کچھ کے نام تو عوام کو معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ جتنے بڑے بڑے اولیائے عظام گزرے ہیں، مثلاً غوث الاعظم حضرت عبدالقادر جیلانی قدس سرہ۔ حضرت بایزید بسطامی قدس سرہ، خواجہ اجمیری قدس سرہٗ اور اس طرح حضرت رحمکار کاکا صاحب قدس سرہ کے تمام مریدوں کے نام اگر معلوم نہیں تو انکے خاص الخاص مریدوں کے نام تو ہر ایک کو معلوم ہیں۔ پھر "بہت" میں سے صرف حضرت رحمکار کاکا صاحب کا نام لینا اس بات کی غمازی ہے، کہ یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے۔ اور اسی بات کی تائید شاہی فقیر کے واضح قول سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب کی

زندگی میں بھی حضرت پیر سباک کے خاندان والے یہ پردہ پابندہ کیا کرتے تھے۔ پھر "صحابی" کا لفظ استعمال کرنا بھی میرے خیال میں غیر موزوں ہے۔ اگرچہ لغوی معنے کے لحاظ سے صحابی کے معنے ہیں ساتھی، رفیق، دوست۔ لیکن یہ لفظ خصوصی طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کے لئے مخصوص ہے۔ اور کوئی دل اللہ خواہ کتنا ہی بلند وارفع مقام پر فائز کیوں نہ ہو، اس کے مر یکو صحابی کہنا میرے خیال میں سوء ادبی میں داخل ہے۔ پھر صحاب کا اطلاق عموماً ایسے شخص پر کیا جاتا ہے جو اپنے قائد، مرشد اور رہنما کی خدمت میں اکثر بیشتر حاضر رہتا ہے۔ اور اس کی فیض صحبت سے زیادہ مستفید ہوا کرتا ہے۔ لیکن اگر ایک شخص زندگی بھر میں صرف ایک یا دو بار کسی دوسرے شخص کی ملاقات کے لئے چلا جائے تو اسے اس شخص کا صحابی کہنا کہاں تک جائز ہے؟ پھر اس لحاظ سے حضرت رحمکار کاکا صاحب حضرت پیر سباک کے صحابی کیسے ہوئے۔

اب میں اس بارے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب اور جناب شاہ فقیر کا بیان ان کے اپنے الفاظ میں یہاں لکھتا ہوں، تاکہ قارئین کو تصویر کے دونوں رخ معلوم ہو سکیں۔

حضرت پیر سباک سے حضرت کاکا صاحبؒ کے ارادت یا بیعت رکھنے

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب لکھتے ہیں۔

"وبعض مردم پندارند کہ حضرت شیخ المشائخ شیخنا قدس سرہٗ یک مرتبہ برحضرت پیر سباکی رفتہ بودند۔ پس این علامت ارادت است۔ واین فقیر از اکثر اہل حضرت ایشان تفتیش کردہ منظور نداشتند۔ واین قول را بغلط خطا نسبت کردہ اند۔ وحضرت ایشان اصلاً جہت ارادت پیر سباکی نرفتہ این فقیر

درمیان نیاوردے۔ واگر از مدح بزرگان گفتے۔ درمیان مدح پدر خود حضرت شیخ بہادر قدس سرہ آغاز نمودے۔ وبسیار گفتے۔ وچون احیاناً نام پیر سباک یاد میکردندے۔ برسم لفظ اولس خشک یاد میکرد کہ بعض اولس خشک او را سباکی پیر خواندے"۔

"واز شاہی فقیر منقول است، کہ چون در ابتدائے حال بقدم بوسی حضرت شیخ المشائخ شیخنا قدس سرہ مشرف شدم۔ بعداز مدتے خاندان پیر سباک گفتند کہ حضرت شیخ المشائخ از مریدان پیر سباک است، من طرف ایشان مائل شدم۔ بعدازان چون بخدمت حضرت ایشان حاضر شدم، بزبان مبارک خود فرمود "یک روز بہ دیدن سباکی پیر رفتہ بودم۔ چون نظر من بدو افتاد۔ بمجرد دیدن سباکی پیر برخاست وتواجہ نمود، ورقص کرد۔ ودر سماع آمد یا شد۔ وبعداز قرار او یک شخص دران دہ مرا طلبانید، وضیافت کرد وماده گاو ذبح کرد"۔ وحضرت ایشان در شان پیر سباک گفت۔ کہ آن خلق نیک بود۔ حسد درمیان نیاورد"۔ پس شاہی فقیر گفت کہ من بہ تحقیق دانستم، کہ حضرت شیخ المشائخ مرید پیر سباک نیست؟ افترا بود"۔ (قلمی نسخہ مقالات ص ۲۳۲)

مندرجہ بالا عبارت بالکل صاف اور واضح ہے۔ اور اس سے ان تمام روایتوں کی واضح تردید ہوتی ہے، جو اس بارے میں گھڑلی گئی ہیں۔ اسی سے اخون اسمٰعیل کی اس بات کی بھی تردید ہوتی ہے کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب نے حضرت پیر سباک کو اپنا پیر دستگیر کہا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ دو بار پیر سباک صاحب کے دیکھنے کے لئے گئے تھے۔ جب حضرت کاکا صاحب خود فرماتے ہیں کہ ایک بار سباکی پیر کے دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ تو اس صورت میں حضرت رحمکار کے اپنے قول پر اخون اسمٰعیل کی سنی سنائی بات کو ترجیح دینا حقیقت

سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔ پھر عقاب صاحب خود بھی مانتے ہیں، کہ "مراقبات رحمکار" کے بعض نسخوں میں دو دفعہ لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل کتاب کئی ہاتھوں میں سے نقل در نقل ہو کر اس میں غلطی کا بہت زیادہ امکان ہو سکتا ہے۔ اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے، کہ مراقبات رحمکار کے جن دو نقلوں میں حضرت رحمکار کاکا صاحب کا جناب پیر سباک کے پاس جانے کا دو دفعہ ذکر ہے۔ مقامات قطبیہ اور مناقب شمس الدین سے صرف ایک بار حضرت رحمکار صاحب حضرت پیر سباک کے پاس جانا معلوم ہوتا ہے۔ پھر مراقبات رحمکار کا مصنف کسی روایت کا چشم دید گواہ نہیں بلکہ وہ دوسروں سے سنی ہوئی باتوں کو شاعرانہ مبالغے کے ساتھ مزے مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے، کہ اخون اسمٰعیل نے حسن بیگ اتمان خیل کے الفاظ اپنے الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ اور حسن بیگ نے بھی اپنے الفاظ میں حضرت کاکا صاحبؒ کے الفاظ کا مفہوم بیان کیا ہے۔ یعنی پیر دستگیر کے الفاظ حضرت رحمکار کے اپنے الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ اخون اسمٰعیل کے الفاظ ہیں۔ حضرت رحمکار نے جہاں بھی پیر سباک کا ذکر کیا ہے، ہر جگہ عوام کے محاورے کے مطابق ان کو "سباکی پیرؒ" کے لفظوں سے یاد کیا ہے۔ اسلئے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب نے پیر سباک صاحب کے لئے "پیر دستگیر خود" کے الفاظ استعمال کئے ہونگے۔ میں اپنے اس موقف کی تائید میں میاں شمس الدین مرحوم کے منظوم مناقب سے چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں۔ مگر یہاں اس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ میاں شمس الدین صاحب نے اپنے مناقب کے ماخذ میں تین کتابوں کے نام لئے ہیں۔ یعنی یہ لکھا ہے۔ کہ میں نے اخون اسمٰعیل، حضرت جمیل بیگ صاحب اور حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کی کتابوں سے اخذ و استفادہ

کیا ہے۔

یہاں میں مراقباتِ رحمکار کے اُس نقل سے چند جملے لکھتا ہوں، جس میں اخون اسمٰعیل صاحب نے لکھا ہے:۔

"نقل است کہ روزے آنحضرت جہت ملاقات پیر سباک توجہ فرمود عازم گردید۔ چون بدریائے آب کابل رسید" وغیرہ وغیرہ۔

اب یہی واقعہ میاں شمس الدین صاحب نے اپنی منظوم مناقب میں اسطرح لکھا ہے:۔

دا شہ غوږ کړہ زما جانہ	دا قصہ وادرہ لہ مانہ
ھسے رنګ ئے دی ویلی	د کتاب پہ ورق کښلی
چہ شیخ جی عالی جناب	اولیسی قطب الاقطاب
یوہ ورځ وو دے پہ ځان	وو نوښهر وتہ روان
د رسرہ ھم مریدان دَوو	د وی لہ سیلے کاملان وَو
چہ رسید شو تر ګودرہ	د نوښهر تر بندرہ
یو بیړئ ورسرہ مل شو	ملاتی ئے سارق غل شو

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہ اپنے مریدوں کے ہمراہ ایک دفعہ نوشہرہ جارہے تھے اور جب وہ نوشہرہ کے گھاٹ پر پہنچے، تو کشتی میں انکے ساتھ ایک چور بھی بیٹھ گیا۔۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

میاں شمس الدین نے ان اشعار میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب جناب پیر سباک کی ملاقات کے لئے جارہے تھے، حالانکہ مراقبات کے اسی نقل میں پیر سباک صاحب کے پاس جانے کا ذکر ہے چونکہ میاں شمس الدین نے مراقبات کا ذکر اپنی کتاب میں بطور ماخذ کیا ہے اس لئے

ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ روایت یا نقل مراقبات سے ہی ادا کیا ہے۔ پھر انھوں نے پیر سباک کے پاس جانے کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اس کا صاف مطلب یہی ہو سکتا ہے۔ کہ اخون اسمٰعیل نے جس شخص سے یہ بات سنی ہے یہ اضافہ اس کا ہے۔

اب میں مراقبات کے اس نقل میں سے چند جملے یہاں لکھتا ہوں جس میں بقول اخون اسمٰعیل صاحب حضرت رحمکار صاحب نے حضرت پیر سباک کو پیرِ دستگیر خود کہا ہے۔

"نقل است، کہ شیخ عبدالرحیم کہ یکے از مریدان آں حضرت است۔ بدعوت التماس نمود۔ .... چوں ازاں طرف عدد عزیمت بصوب دولت خانہ معطوف داشتہ۔ بر پشتہ کہ الحال مدفن آں پیر ... الٰہی است رسید۔ عنان فرس را باز کشید۔ ...... و با حسن بیگ اماں خیل کہ یکے از مریدان آنحضرت بود۔ بزبان فیض جریان تقریر این (مقابلہ؟) فرمود۔ کہ این خیر خواہ خلائق بہ شرف قدمبوسی پیرو دستگیر خود پیر سباک در و... کہ باغ آں پیر بود مشرف شدم۔ پیر بزرگوار بہ تنۂ درخت سپیدار تکیہ زدہ نشستہ بود۔ ...... وغیرہ وغیرہ۔

اب یہی واقعہ مقامات قطبیہ کے قلمی نسخے (۲۷-۲۲۶) پر اس طرح لکھا ہے:-

(ترجمہ) حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہ کو حضرت شیخ المشائخ کے ایک مرید نے (نام نہیں لکھا ہے۔ شاید یہی حسن بیگ اتمانخیل ہو) بتایا کہ ایک دفعہ حضرت شیخ المشائخ کسی جگہ سے آ رہے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں آجکل آپ کا مزار مقدس واقع ہے۔ تو حضرت شیخ المشائخ نے مجھ سے فر...

"موضع ... میں ... ایک ... باغ تھا۔ اس باغ میں سفیدار کے

درخت بھی تھے۔ ان درختوں میں سے ایک کے ساتھ سبا کی پیر ٹیک لگا کر بیٹھتا وہ درخت اُسے زبان حال سے آواز دیتا، کہ میں آپ کے لئے تابوت بنوں گا معلوم نہیں سبا کی پیر وہ آواز سنتا تھا یا نہیں۔ لیکن بعد میں جب وہ فوت ہوا۔ تو اسی درخت سے اُس کے لئے تابوت بنایا گیا اور اسے ٹل لیجایا گیا۔ اور وہاں دفن ہوا۔

(وہ مرید کہتا ہے) کہ "شیخ المشائخ نے فرمایا۔ اس طرح یہ زمین بھی مجھے کہتی ہے کہ آپ کی قبر میں بنوں گی۔ مگر میں نہیں جانتا کہ کیا ہوگا۔ محض کسر نفسی کی وجہ سے تھا ورنہ اُن پر سفیدار اور زمین دونوں کا راز مکشوف ہو چکا تھا"

اب ظاہر ہے ایک ہی واقعہ دو مختلف افراد نے مختلف الفاظ میں لکھا ہے۔ دونوں افراد متقی، پرہیزگار، عالم، دیندار اور ایک ہی منبع فیض سے سیراب ہوئے تھے۔ ایک ان کا مرید تھا۔ دوسرا ان کا فرزند۔ اور فرزند بھی نہایت متقی، دیندار عالم و فاضل و حقیقت شعار۔ دونوں بیانات قارئین کے سامنے ہیں۔ وہ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ ایک عالم فاضل بیٹے کی شہادت کے مقابلے میں ایک غیر شخص کی شہادت کہاں تک مستند ہو سکتی ہے۔ اور پھر خصوصاً اس صورت میں جبکہ بیٹے کے مدنظر اپنے گرامی قدر والد کے پیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے دلچسپی بھی ہو۔ پھر مقاماتِ قطبیہ میں حضرت رحمکار کے اپنے الفاظ یا راوی کے اپنے الفاظ درج ہیں۔ جبکہ مراقبات رحمکار کے مصنف نے جوش عقیدت میں شاعرانہ زبان میں سنی سنائی باتوں کو نہایت مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا ہے اس لئے مقاماتِ قطبیہ کے مقابلے میں مراقبات کی شہادتوں کی وقعت اور اہمیت بہت کم ہے۔

پھر مراقبات رحمکار کا موجودہ نسخہ جو جنوبی سرکل میں اکثر افراد کے پاس موجود

ہے۔ اور جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ سب سے زیادہ قدیم نسخہ ہے۔ یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ پشتو اکیڈیمی میں مراقبات کا جو نسخہ ہے اور جس کے آخر میں یہ لکھا ہے "تمت تمام شد بحکم خان عالی جاہ شہباز خان خٹک تحریر یافت"۔

یہ شہباز خان مشہور صاحب سیف و قلم خوشحال خان خٹک کا والد نہیں ہے وہ شہباز خان تو ۱۰۵۰ھ میں فوت ہو چکے تھے اور اس وقت حضرت رحمکار کاکا صاحب بقید حیات تھے۔ یہ شہباز خان، شہباز خان اول کی چھٹی پشت میں گزرا ہے۔ اور اسکی تفصیل یہ ہے :۔ شہباز خان ابن سعد اللہ خان ابن افضل ابن اشرف خان ابن خوشحال خان ابن شہباز خان۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ یہ شہباز خان اٹھارھویں صدی کے آخری سالوں کی شخصیت ہے۔

بہرام خان ابن خوشحال خان کے فوت ہو جانے کے بعد افضل خان ابن اشرف خان تمام قبیلہ خٹک کا رئیس تھا۔ افضل خان کے آٹھ بیٹے تھے جن میں سعد اللہ خان اور محمد علی خان زیادہ مشہور ہیں۔ سعد اللہ خان اپنے بھتیجے لشکر خان کے ہاتھوں اکوڑہ خٹک میں مارا گیا۔ اس کے بعد سعد اللہ خان کا بیٹا سعادتمند خان نواب خٹک ہوا۔ سعادتمند خان احمد شاہ ابدالی کے حملات ہند میں بھی اس کے ساتھ اپنے لشکر سمیت کئی بار شامل ہوا تھا۔ اور تیمور شاہ کے زمانے میں بھی نواب خٹک تھا۔ اس کے فوت ہو جانے کے بعد اسکی جگہ شہباز خان نواب ہوا اس کے بیس بیٹے تھے۔ منصور خان اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا ناصر خان۔ اور ناصر خان کے بعد خوشحال خان نواب ہوا۔

یہ شاہ محمد سدوزئی کا زمانہ تھا۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہے کہ شہباز خان نواب ٹیری کے حکم سے مراقبات کا جو نسخہ لکھا گیا ہے۔ وہ اٹھارھویں صدی کا ہے۔ اور اخوند اسمٰعیل کے ہاتھ کا

لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ کسی اور قلمی مسودے سے نقل کیا گیا ہے اور اسی زمانے میں میاں محمد مبین مرحوم اور میاں شمس الدین مرحوم کے منظوم منتسبات بھی لکھے گئے ہیں۔ پس یہ تمام کتابیں تقریباً ایک زمانے کی ہیں۔ اور مقامات قطبیہ ان سب سے زیادہ قدیم ہے۔ کیونکہ وہ اصل شکل میں آج تک قلمی مسودے کی شکل میں بھی موجود ہے۔ اور مطبوعہ شکل میں بھی۔

یہاں میں یہ بات واضح کرے دیتا ہوں، کہ مجھے حضرت پیر سباک صاحب قدس سرہ کے بارے میں مصدقہ معلومات بہت کم حاصل ہیں۔ لیکن جو کچھ میں جانتا ہوں اسکی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت پیر صاحب کی زندگی میں حضرت کاکا صاحب کے والد حضرت شیخ بہادر بھی بقید حیات تھے اور مسند رشد و ہدایت پر متمکن تھے۔ اب جبکہ حضرت کاکا صاحب کے اپنے گھر میں منبع فیض موجود تھا۔ تو ان کو فیض حاصل کرنے کی غرض سے دوسروں کے پاس جانے کی ضرورت کیا تھی۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن کسی جگہ میں یہ بات دیکھی ہے، کہ حضرت پیر سباک صاحب ۱۰۲۵ھ میں فوت ہو چکے تھے اور اگر یہ تاریخ درست ہو، تو اس کا یہ مطلب ہے، کہ حضرت شیخ بہادر صاحب اس کے بعد بھی دو سال تک بقید حیات تھے۔ کیونکہ انکی وفات ۱۰۲۷ھ میں ہوئی ہے۔

یہ بات بھی عرض کرے دیتا ہوں۔ کہ اہل اللہ کے اذہان و قلوب بغض و حسد اور کینے سے قطعاً پاک و صاف ہوتے ہیں۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ کسی ولی اللہ کو بلند و ارفع درجات عطا کرنا اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اور اللہ تعالےٰ جس طرح مناسب سمجھتا ہے، اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ کسی شخص سے ارادت و عقیدت پر منحصر نہیں ہے۔ اس لئے میں یہی کہونگا، کہ اگر حضرت رحمکار قدس سرہ حضرت پیر سباک صاحب کے پاس ایک یا دو بار تشریف لے گئے ہوں تو ایک

اہل اللہ کا دوسرے اہل اللہ کے پاس جانا ہی متصور ہو سکتا ہے۔ اور جب کہ خود حضرت رحمکار کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے، کہ "آن خلق نیک بود حسد در میان نیاورد" اس کا صاف اور صریح یہی مطلب ہو سکتا ہے۔ کہ یہ ملاقات یا ملاقاتیں عام نوعیت کی تھیں۔ اور حضرت رحمکار کاکا صاحب کی مریدی کا شوشہ پیر سباک صاحب کے لواحقین نے پیر سباک صاحب کی وفات کے بعد چھوڑا ہے۔ اور کیوں چھوڑا ہے؟ محض اس لئے کہ اپنے بزرگ شخصیت کا نام زندہ رکھ سکیں۔

کیا حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہٗ حضرت حاجی بہادر صاحبؒ کے مرید یا ماذون تھے؟

(اقتباس از کتابچہ موسوم "بہ کاکا صاحب" از سرفراز خان عقاب خٹک)

محمد درویش لکھتا ہے: "ایک دن ایک شخص نے میرے مخدوم ...... کی مجلس میں یہ بات شروع کی۔ کہ مشائخ پناہ ...... شیخ رحمکار قوم خٹک نے لوگوں میں فقر کا ہنگامہ ...... برپا کیا ہے۔ اور خٹک، یوسف زئی اور بنیاوشئی وغیرہ سب لوگ ان کے پاس طلب اور باطنی کمالات حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اور یہاں کوئی نہیں آتا۔ ظفر)

"یہ سنکر ایک ساعت خاموش رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد اخون الہ داد اوان کو بلوایا اور اُسے کہا کہ کل اُس شخص کے پاس جاؤ، اور اُسے کہو کہ تم نے لوگوں کی تلقین و ارشاد کی راہ اختیار کی ہے اور طالبان حق کو اپنا مرید بناتے ہو۔ حالانکہ ظاہر میں تمہارا پیر اور مرشد نہیں ہے اور پیر طریقت کے اذن و اجازت کے بغیر پیری کرنی جائز اور روا نہیں ہے جو کوئی ظاہری پیر اور مرشد نہ رکھتا ہو وہ باطنی کمالات ... آپ اویسیوں کے گروہ میں سے ... احوال

اور اشغال سے اجتناب فرمائیں۔"

جب اس نے یہ سنا۔ تو نعرہ لگایا۔ کہ چاہئے کہ یہاں سے ہر شخص رخصت ہو جائے اور چلا جائے۔ اس پر سب لوگ جو وہاں جمع تھے تتر بتر ہو گئے۔

بیس اکیس دن کے بعد اللہ داد کو دوبارہ اس کے پاس بھیجا۔ اور دعا اور توجہ کرنے کی اجازت دے دی۔ تب شیخ رحمکار نے پھر زور سے نعرہ لگایا کہ کوہاٹ کے صاحب نے مجھے اذن اور اجازت دی ہے۔ آداب ممانعت نہیں ہے۔"

تحفۃ السالکین کے آخر میں جو اشعار ہیں ان میں حاجی بہادر صاحب کے مریدوں کا ذکر ہے ان میں ایک شعر یہ ہے ؎

شیخ رحمکار عاشقِ صادق   ہم از وبہرہ یافت شد لائق

مراقبات رحمکار نقل ص۸ میں لکھا ہے۔ کہ شیخ دریا خان نے ایک دن آنحضرؒ سے عرض کیا۔ کہ آپ کا پیر کون ہے۔ آنحضرت نے اس کے جواب میں فرمایا، یہ پوچھنے سے تجھے کیا حاصل، اگر تو خود ہی حال کی افزائش کی مٹھاس پاتا ہے، تو جلدی اور تیزی سے ساتھ آؤ۔ ورنہ اس قصے کو جانے دو، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

عبدالحلیم نے بھی اس مضمون کا قصہ قائل کا نام لئے بغیر لکھا ہے:۔

" اس قدر لکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں، کہ کاکا صاحب حضرت حاجی بہادر صاحب کے مأذون تھے، لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ یا تو ظاہر ہوا کاکا صاحب کا کوئی پیر ہی نہ تھا۔ یا وہ کسی کو وہ اپنے پیر کا نام نہیں بتلانا چاہتے تھے۔ اور نہ کبھی کسی مجلس میں اس کا تذکرہ کیا تھا۔ چنانچہ اُن کے بیٹوں اور مریدوں کو بھی کاکا صاحب کے پیر کا علم نہ تھا۔ اور کبھی کسی نے پوچھا بھی تو ٹال دیا

چونکہ آپ نے حضرت حاجی صاحب سے صرف اذن پایا تھا، طریقہ نہیں کیا تھا۔ اسلئے آپ نقشبندی تو نہ تھے۔ اور چونکہ اپنے باپ سے سہروردیہ طریقے میں نسبت رکھنا عبدالحلیم کا محض گمان ہے۔ اور پیر سباک سے آپ کا طریقہ کرنا پوری طرح ثابت نہیں، اسلئے ہم آپ کو سہروردی ماننے پر مجبور نہیں ہیں۔ آپ کا اخون پنجو کا مرید ہونے کا بعید ترین احتمال بھی نہیں پایا جاتا۔" (کتابچہ ص۵۳)

عقاب صاحب کے اس لمبے چوڑے اقتباس کا مطلب اگر ہم مختصراً بیان کرنا چاہیں، تو اسمیں صرف دو باتیں ہیں:-

(۱) یہ کہ کاکا صاحب کا کوئی پیر نہ تھا۔ اور اگر تھا بھی تو وہ کسی کو معلوم نہ تھا۔
(۲) یہ کہ کاکا صاحب حاجی بہادر صاحب کے مأذون تھے۔

میں کہتا ہوں یہ دونوں باتیں قطعاً غلط اور من گھڑت ہیں۔ اور اس کا ہر ہر لفظ پکار پکار کر ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہ ایک خود ساختہ کہانی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب اپنے والد قطب عالم حضرت شیخ بہادر صاحب کے مرید تھے۔ یہ بات حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کی دو تحریروں سے ثابت ہوتی ہے۔ اور جو ان صفحات میں موجود ہیں۔ جناب عقاب کا یہ کہنا کہ شیخ عبدالحلیم صاحب کا اس بارے میں گمان ہے۔ تو یہ درست ہے، کہ حضرت عبدالحلیم صاحب نے اس سلسلے میں "پندارم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ قرائن و علائم کی بنیاد پر انہوں نے استعمال کیا ہے اور قطعی اور فیصلہ کُن لفظ اس لئے نہیں لکھا ہے۔ کہ حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کے دریافت کرنے پر بھی حضرت رحمکار کاکا صاحب نے اُن کو اپنے پیر کا نام نہیں بتایا۔ اس کے جواب میں یہ فرمایا کہ "پیری بہ پیران بخشیدم و تصوف بہ صوفیان و سلوک بہ سالکان" وغیرہ یہ تمام بیان گذشتہ صفحات میں موجود ہے۔ اسلئے

یہاں دوبارہ اسے تفصیل سے لکھنا محض باعث طوالت ہے۔ جب رحمکار قدس سرہٗ نے خود اپنے فرزند کے دریافت کرنے پر بھی اپنے پیر کا نام نہیں بتلایا تو پھر بیٹے کا کیا حق تھا کہ وہ بضد ہو کر بار بار پوچھا کرتے۔ کہ نہیں حضرت آپ کو بتانا پڑیگا اور چونکہ حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب نام نہاد عقاب نہ تھے، بلکہ شریعت و طریقت کے واقعی شہباز تھے۔ اس لئے انہوں نے محتاط الفاظ میں "پندارم" کا لفظ استعمال کیا۔ (یعنی ان کا یہ لفظ "پندارم" "دانم" کے مترادف ہے)۔

مجھے انتہائی افسوس ہے کہ عقاب صاحب محض بات سے بتنگڑ بناتے ہیں وہ خان خوشحال خان خٹک اور دوسرے تیسرے کے حوالے تو دیتے ہیں مگر اُن کو خوشحال خان کے یہ الفاظ نظر نہیں آتے جو انہوں نے حضرت رحمکار کا کا صاحب سے اپنے آخری ملاقات کے موقع پر اپنے بیاض میں لکھے ہیں کہ:-

"او په وخت د رخصت مے التماس وکړ، په زبان دُرافشان دا وُوے چې د رځه هر مشکل چې درپېښ شي حق تعالیٰ به ئے په تا آسان کا۔ په تمامي عمر کښ ئے دا رنګ صریحًا دُعا په حق د هیچا نهٔ وه وئیلی یب د دے احقر شوه"

(ماخوذ از تاریخ مرصع، پنجاب پبلک لائبریری)

جیسا کہ میں نے گزشتہ صفحات میں لکھا ہے۔ مراقبات رحمکار کی تمام روایتیں سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ مراقبات رحمکار کا جو حوالہ شیخ دریاخان کے بارے میں دیا گیا ہے، مقامات قطبیہ میں خود شیخ دریاخان کا بیان اس بارے میں موجود ہے۔ اور وہ مراقبات کے بیان سے قطعی مختلف ہے۔ یہ بیان بھی گزشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔ قارئین "حضرت رحمکار کے پیر طریقت کے عنوان میں" اسے دوبارہ پڑھیں۔ اس بیان میں یہ ذکر ہے

[illegible] ۱۶۸ [illegible]

کہ شیخ دریا خان نے اپنے پیر و مرشد حضرت رحمکار سے ایک دن پوچھا کہ یا حضرت! آپ کا پیر کون ہے؟ حضرت نے جواب دیا، سنو! خدا کا ایک بندہ تھا۔ ہاتف غیبی نے اسے آواز دی اے میرے بندے! روئے زمین کی بادشاہی لینا چاہتے ہو یا میری بندگی۔ اُس بندہ نے جواب دیا، یا الٰہی میں آپ کی بندگی قبول کرتا ہوں۔ اور روئے زمین کی بادشاہی پر لات مارتا ہوں"۔ یہ بیان جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا، مراقبات کے بیان سے قطعی مختلف ہے۔ اور حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کے بیان سے بالکل مطابقت رکھتا ہے۔ ہر دو بیانات سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت رحمکار صاحب اپنے پیر طریقت کا نام نہیں لینا چاہتے تھے۔ اور نہ اپنے طریقے کے بارے میں کچھ کہنا پسند کرتے تھے۔ رہی یہ بات کہ وہ کیوں اپنے پیر کا نام نہیں بتاتے تھے۔ اسکی مصلحت ہم نہیں جانتے۔ اور نہ ہمیں اسکے جاننے کی ضرورت ہے، کیونکہ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ خود حضرت رحمکار کا مقام اس کا شافی جواب ہے۔ پھر خان خوشحال خان خٹک مرحوم کی واضح شہادت بھی اس بارے میں موجود ہے۔ ان دو واضح شہادتوں کے علاوہ مجمع البرکات میں بھی صریحاً لکھا ہُوا ہے کہ آپ نے دوسرے اولیاء اللہ سے ملاقاتیں تو کی ہیں لیکن طریقہ صرف اپنے والد سے کیا ہے۔ اور کسی دوسرے ولی اللہ سے فیض حاصل نہیں کیا ہے۔ اور اگرچہ عقاب صاحب مجمع البرکات سے الرجک معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ کس منطق اور اصول کی رو سے جائز ہے۔ کہ جس کتاب پر عقاب صاحب کی تصدیق ثبت نہ ہوگی وہ جعلی ہوگی۔ اگر مجمع البرکات قابل سند نہیں تو پھر درویش کی تحفۃ السالکین قابل سند ہے؟ محض اس لئے کہ اس میں عقاب صاحب کی پسند باتیں لکھی ہوئی ہیں؟

جن لوگوں کو قدرت نے معقولیت سے تھوڑا بہت حصہ دیا ہوتا ہے، وہ حق کو حق ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مؤلف صوفیائے سرحد نے عقاب صاحب کا تمام کتابچہ اپنی کتاب میں نقل کرنے کے بعد اپنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے۔ "عقاب صاحب کے ان دلائل کے باوجود بھی ہم اپنے آپ کو اُن کا ہمخیال نہیں پاتے۔ بلکہ ہم آپ کے صاحب زادے عبدالحلیم صاحب مؤلف مقامات قطبیہ کے اس قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب سلسلۂ سہروردیہ میں اپنے والد سے مأذون تھے۔ چونکہ شیخ عبدالحلیم صاحب آپ کے صاحبزادے ہیں۔ علم و فضل کے مالک اور صاحب تقویٰ ہیں۔ ایک بیٹے سے زیادہ اپنے باپ کے حالات کو اور کون جان سکتا ہے۔ اس لئے ہم انہی کے قیاس کو قرینِ قیاس سمجھتے ہیں۔ اور پھر ہمارا قیاس یقین کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جبکہ آپ کا ایک اور مرید اور معتقد سید عبداللہ شاہ مرتب مجمع البرکات کی روایت صراحت کے ساتھ اس قیاس کی تائید میں ملتی ہے۔ اور جسے ہم گزشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں جس میں واضح طور سے مذکور ہے۔ کہ حضرت شیخ اپنے والد سے بیعت تھے"۔ ؏

"کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا"

اب رہی عقاب صاحب کی یہ بات "کہ چونکہ اپنے والد سے سہروردیہ طریقے سے ماذون ہونے کے بارے میں حضرت عبدالحلیم صاحب کا صرف گمان ہے اور پیر سباک سے آپ کا مرید ہونا ثابت نہیں ہے۔ اس لئے ہم آپ کو سہروردی ماننے پر مجبور نہیں ہیں"۔ اس سلسلے میں میری گزارش ہے، بڑی خوشی سے آپ ہرگز کاکا صاحبؒ کو سہروردی تسلیم نہ کریں۔ بلکہ میں تو آپ سے یہ گزارش بھی کروں گا کہ آپ ان کو ولی اللہ بھی تسلیم نہ کریں۔ آپ کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے

حضرت رحمکار کے مجد و شرف میں پرِ کاہ کے برابر بھی تو فرق نہیں آسکتا۔ پھر آپ سے کس نے درخواست کی ہے کہ آپ حضرت رحمکار کو سہروردی یا کچھ اور تسلیم کرلیں۔ آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں جو جی میں آئے وہ کریں۔ لیکن براہِ کرم غلط بیانی نہ کریں۔ ورنہ بقول صائب ؎

دہن خویش بہ دشنام میالا صائب

کیں زر قلب بہ ہر کس کہ دہی باز دہد

آپ کی نام نہاد تحقیق کا جواب آپ ہی کے سکے میں دیا جائیگا۔

اب میں عقاب صاحب کی اس بات کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، جس میں وہ محمد درویش کے حوالے سے لکھتے ہیں، کہ حضرت کاکا صاحب حاجی بہادر صاحب کے ماذون تھے۔

تصویر کا ایک رخ :۔ خان خوشحال خان خٹک اور فقیر جمیل بیگ صاحب خود کا بیان ہے۔ کہ آپ ابتدائے بلوغ ہی سے:۔

(۱) اپنے والد حضرت شیخ بہادر صاحب سے فیض یافتہ تھے۔ اس لئے خان موصوف کے الفاظ میں انکی عمر عزیز ضائع نہ ہوئی۔

(۲) چونکہ آپ کی تاریخ پیدائش ۹۸۳ھ ہے، اس لئے نہایت محتاط اندازے کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ اپنے والد سے ۱۰۰۰ھ کے لگ بھگ بیعت ہوئے ہوں گے۔

(۳) حضرت شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ ۱۰۲۷ھ میں رحلت فرما گئے ہیں۔ اور آپ ان کے جانشین ہوئے۔ گویا آپ کے رشد و ہدایت کا باقاعدہ سلسلہ ۱۰۲۷ھ سے شروع ہوتا ہے۔

(۴) تین سال بعد یعنی ۱۰۳۰ھ کے لگ بھگ آپ اپنے آبا کی روحانی

مقام سے نقل مکانی کرکے مقام میلہ پر جو موجودہ قصبہ زیارت کاکا صاحب سے بجانب غرب و جنوب میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے مقیم ہوئے اور بندگانِ خدا کے رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے۔

(۵) چونکہ آپ سنہ ۱۰۶۳ھ میں رحلت فرما چکے ہیں اس طرح سے گویا چھتیس ۳۶ سال تک آپ مسند رشد و ہدایت پر متمکن رہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ:۔ حضرت حاجی بہادر صاحب کی تاریخ ولادت و تاریخ وفات ہر دو میں اختلاف ہے۔ لیکن ان کی ایک

(۱) تاریخ سنہ ۹۹۷ھ بتائی جاتی ہے۔ آپ بھارت کے شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ (روحانی رابطہ۔ قاضی اثر)۔

(۲) حضرت حاجی بہادر صاحب نے پہلی بیعت سلسلہ چشتیہ میں بمقام قصور (پنجاب) حضرت میاں کریم داد ابن حضرت اخون درویزہ قدس سرہ سے سنہ ۱۰۳۲ھ میں کی۔ یہاں انہوں نے دیوان حافظ کی ایک شرح (حرف ش تک) تحفۃ الفراست کے نام سے لکھی۔

(۳) اسی شرح کی ایک اور شرح نابغہ عصر علامہ دہر جناب میاں محمد وسیم کاکاخیل ساکن جندول (باجوڑ) نے تحفۃ الناظرین کے نام سے لکھی۔ میاںصاحب مرحوم اپنی شرح کے آخر میں یہ لکھتے ہیں ؎

مبین پیش قصوری کتابم بر حقارت
مضاعف زو بمطلب منصف درعبارت

یعنی قصوری کی کتاب کے مقابلے میں میری کتاب کو حقیر نہ سمجھیں۔ کیونکہ ضخامت میں یہ اس سے نصف ہے اور مطالب میں اس سے دو چند۔

(۴) روحانی رابطے کے مطابق میاں محمد وسیم کاکاخیل مرحوم مختلف علوم خصوصاً

ریاضی، ہیئت، منطق، فلسفہ، فقہ، حدیث اور تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ادیب، مورخ اور شاعر بھی تھے۔ ۱۲۷۰ھ تا ۱۳۰۲ھ لشبادر میں بھی مقیم رہے تھے۔ مشہور بین الاقوامی شخصیت جناب سید جمال الدین افغانی بھی انکے شاگرد تھے۔ فقہ، اصول، منطق ہیئت، جغرافیہ، تاریخ اور عروض وغیرہ مختلف علوم میں ایک سو پچاس کتابیں لکھی ہیں۔ میاں صاحب مرحوم کی اس کتاب تحفۃ الناظرین سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ حاجی بہادر صاحب عبداللہ قصوری اور عبداللہ بیجاپوری کے ناموں سے مشہور تھے۔

(۵) میاں نور محمد ابن میاں کریم داد کے مطابق حاجی بہادر صاحب اپنے مرشد کے ہمراہ بیجاپور میں بھی کافی عرصہ رہے ہیں۔ یہاں انہوں نے دیوانِ حافظ کی باقی ماندہ شرح بھی مکمل کرلی۔ جس کی طرف میاں محمد وسیم کاکاخیل نے اپنی کتاب میں اشارہ کیا ہے۔

(۶) بیجاپور سے آپ میاں نور محمد کی معیت میں آگرہ چلے آئے اور حضرت آدم بنوری سے بیعت کی۔ (سلسلۂ نقشبندیہ میں) اور انکے مریدوں میں شامل ہوگئے۔

(۷) ۱۰۵۰ھ میں شاہ جہان نے حضرت سید آدم بنوریؒ کو آگرہ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ مریدوں کے ہمراہ آگرہ سے دہلی آئے۔ لیکن دہلی میں بھی ان کو قیام کی اجازت نہیں دی گئی۔ بلکہ آپ کو لاہور بھی چھوڑنا پڑا۔ آپ حج کے ارادے سے افغانستان کی طرف آنے لگے۔

(۸) اٹک پار کرکے جب اکوڑہ پہنچے۔ تو حضرت رحمکار ان کو خوش آمدید کہنے کی خاطر اکوڑہ آئے۔ اور ان کو خانقاہ رحمکاریہ آنے کی دعوت دی چنانچہ حضرت آدم بنوریؒ اپنے خاص خاص مریدوں کے ہمراہ خانقاہ رحمکاریہ

تشریف لائے۔ اور تین دن تک آپ حضرت رحمکار کے مہمان رہے۔ اور اس کے بعد بارادۂ حج افغانستان کی طرف چل پڑے۔ اس موقع پر آپ کی معیت میں حضرت رحمکار کے فرزند حضرت محمد گل صاحب بھی حج پر گئے۔

(۹) ۱۴ر شعبان ۱۰۵۲ھ کو بمقام مکہ معظمہ حضرت آدم بنوری نے حضرت حاجی بہادر صاحب کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔ اور یہاں سے آپ معہ تمام مریدوں کے مدینہ منورہ چلے گئے۔ اور وہاں حضرت سید آدم بنوری ۱۰۵۳ھ کے آخر میں فوت ہوئے۔ اور مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے۔

(۱۰) اپنے مرشد کی وفات کے بعد بھی حضرت حاجی بہادر صاحب حجاز مقدس میں چند سال ٹھہرے رہے۔

(۱۱) ولایت افاغنہ میں حضرت حاجی بہادر صاحب کے آنے کا یقینی سال تو معلوم نہیں ہے۔ لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق آپ ۱۰۵۸ھ کے لگ بھگ یا اس کے کچھ بعد آئے ہونگے۔ اور کوہاٹ میں مقیم ہوئے ہونگے۔

اب تاریخ کے ان شواہد کی روشنی میں محمد درویش کی اس کہانی کا جائزہ لینا چاہیئے:۔

۱۔ جیسا کہ گزشتہ تفصیلات سے ظاہر ہوا، حاجی بہادر صاحب نے پہلی بیعت ۱۰۴۲ھ میں میاں کریمداد صاحب سے کی ہے، اور دوسری بیعت حضرت آدم بنوریؒ سے ۱۰۵۲ھ میں کی ہے۔

۲۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ حضرت رحمکار کاکا صاحب اس سے تقریباً چھبیس سال پہلے مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہو چکے تھے، اور اس وقت حاجی بہادر صاحب بھارت کے شہر آگرہ میں تھے۔ اور روحانی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ پھر اس صورت میں اگر محمد درویش کی کہانی کو من گھڑت

نہ کہیں تو اسے اور کیا کہیں ؟ ۔

۳ ۔ حضرت رحمکار کاکا صاحب پشت بہ پشت ولی ابن ولی تھے ۔ اس بات کا واضح ثبوت ہے ۔ کہ یہ تمام حضرات اپنے اپنے والد کے مرید تھے ۔ اور سب سے پہلے ان سے فیض حاصل کیا کرتے ۔ اور مصدقہ تاریخی شواہد کی روشنی میں حضرت رحمکار حاجی بہادر صاحب سے کم از کم چھبیس سال قبل ولایت کے اس مقام پر فائز ہو چکے تھے ۔ کہ جناب حاجی بہادر صاحب کے مرشد حضرت سید آدم بنوری خانقاہ رحمکار یہ میں ان کو امامت کیلئے مجبور کرتے ہیں ۔ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہیں ۔ اور پھر ان کے مقام بلند کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔" جو چند نمازیں میں نے شیخ رحمکار کی اقتداء میں پڑھیں ، ان کی حلاوت ایسی محسوس کرتا ہوں ، جس طرح اپنے پیر و مرشد شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی اقتداء میں نماز پڑھنے میں محسوس کیا کرتا تھا ۔"

اس بات سے حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کے مقام بلند کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ کیونکہ جس بلند ہستی کے یہ الفاظ ہیں ۔ وہ خود بھی طریقت کے بہت بڑے شہباز ہیں ۔ کوئی ڈبہ پیر نہیں ۔

۴ ۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ایک نو وارد (حاجی بہادر صاحبؒ) اس قدر جلد شہرت و مقبولیت حاصل کر لیتا ہے ، کہ وہ حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ جیسے عظیم المرتبت ولی اللہ کو جو انکے آنے سے کم و بیش چھبیس (۲۶) سال قبل مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہو چکے تھے اور تمام پشتونخوا میں ان کے فقر کا غلغلہ گونج رہا تھا ۔ اور طالبان حق اور جویائے معرفت اس قدر کثرت سے ان کی خدمت میں آتے رہتے تھے ۔ کہ درویش ... [illegible]

کڑھتا رہتا تھا) آتے ہی ان کو رشد و ہدایت سے منع کرتا ہے۔ اور پھر از خود
بغیر کسی مطالبے اور درخواست کے بیس پچیس دن کے بعد اسکو صرف دعا
اور توجہ کی اجازت دیتا ہے، کیا اس قسم کی باتیں بقائمی ہوش و حواس
ماننے کی ہیں؟

اب ان تاریخی شواہد کو ذہن میں رکھتے ہوئے درویش محمد کے اس
افسانے کی قدر و قیمت کو جانچیں، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک
خود ساختہ افسانہ ہے۔ اور "پیر نمے پرد مریدانش مے پرانند" کی خواہش کا آئینہ دار
ہے، چنانچہ میں اس بارے میں یہی کہوں گا ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است

اگر اس بات پر اصرار کیا جائے کہ محمد درویش نے جو واقعہ لکھا ہے وہ
حضرت کاکا صاحب کی زندگی میں ہوا ہے، تو آخر کیسے ہوا؟ کیونکہ ۱۰۵۸ھ
تک تو حاجی بہادر صاحب کی یہاں موجودگی متعذر ہے۔ اور ۱۰۶۳ھ میں
حضرت کاکا صاحب رحلت فرما چکے تھے۔ پھر چار پانچ سال کے قلیل عرصے
میں حاجی بہادر صاحب نے ایسی عالمگیر شہرت حاصل کی، خصوصاً اس
زمانے میں کہ نہ تو ذرائع آمد و رفت کے وسائل آسان اور بے شمار تھے، اور
نہ ذرائع ابلاغ میسر تھے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے۔ کہ
حضرت رحمکار کاکا صاحب کے متعدد مناقبوں میں سے کسی ایک میں بھی اس
بات کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ اگر حقیقت میں اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہوتا۔
تو اس کا علم محمد درویش اور عقاب کے علاوہ دوسرے اہل علم کو بھی ہوتا۔
لیکن نہیں ہے۔ اور اس لئے نہیں ہے کہ ایسا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی

شہادت

اس لئے مجھے یقین ہے، کہ محمد درویش نے بقول عقاب حضرت رحمکار اور حضرت حاجی بہادر صاحب کے درمیان تین ملاقاتوں کا اور تذکرۂ رحمکار میں مجمع البرکات کے حوالے سے اُن کے درمیان آٹھ ملاقاتوں کا جو ذکر ہُوا ہے، میرے خیال میں یہ محض سنی سنائی روایتوں پر منحصر ہے۔ اور تاریخ کی روشنی میں ان کے درمیان ایسی ملاقاتیں ہوئی ہی نہیں ہیں؟

میری معلومات کے مطابق ان ہر دو صاحبان کے درمیان صرف دو بار ملاقات ہوئی ہے۔ یعنی ایک اس وقت جبکہ حضرت آدم بنوری صاحب بہ ارادۂ حج افغانستان جاتے ہوئے چند دن خانقاہ رحمکار یہ میں بطور مہمان عزیز کے تشریف لائے تھے، ان کے مریدوں میں اس وقت حاجی بہادر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ لیکن اس وقت حاجی بہادر صاحب ابھی زیر تربیت تھے۔ اور دوسری بار جب آپ حج بیت اللہ سے واپس آئے، تو آپ حضرت رحمکار سے ملنے کے لئے آئے تھے۔

اب میں یہاں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کی ایک روایت نقل کرتا ہوں جس سے حضرت کاکا صاحب اور حضرت حاجی بہادر صاحب کے درمیان پیری مریدی کا قطعی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

حضرت عبدالحلیم صاحب اپنی کتاب مقامات قطبیہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت رحمکار قدس سرہٗ کا ایک مرید روحانی تربیت میں مصروف تھا۔ اور ابھی تکمیل تک نہیں پہنچا تھا کہ حضرت شیخ صاحب رحلت فرما گئے۔ اس واقعے کا اس مرید پر بہت برا اثر ہُوا۔ اور وہ بہت متفکر اور پریشان رہنے لگا آخر اپنی اس پریشانی کا ذکر اس وقت کے ایک فاضل سے کیا۔ اور اس نے مشورہ مانگا۔ اس فاضل نے اُسے مشورہ دیا۔ کہ زندہ اولیاؤں سے جس سے تمہیں دلچسپی ہو۔

اسکی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ اور اس سے سلسلہ قائم کرو۔ اگر حضرت شیخ آپ
کے اس روش سے خوش ہوں تو آپ کی حالات میں ترقی ہوتی جائیگی۔ اور
اگر ان کی مرضی نہ ہو، تو کسی طرح وہ آپ کو اس سے باز رکھینگے۔ اس مشورے
کے مطابق وہ پہلے شیخ اللہ داد مندوری کی خدمت میں آنے جانے لگا۔ اور کچھ عرصہ
وہاں گزارا۔ مگر اس کی تسلی نہ ہو سکی۔ اور نہ پریشانی دور ہوئی۔ اس کے بعد وہ
عبد اللہ کوہاٹی (حاجی بہادر صاحب) کی خدمت میں آنے جانے لگے۔ کچھ عرصہ
یہاں بھی بسر کیا۔ مگر یہاں بھی اسکی حالت میں کچھ بہتری کے آثار پیدا نہ ہوئے۔

ایک دن اچانک حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ نے باطنی طور پر اس مرید
پر ظہور فرمایا۔ ایسے حال میں کہ وہ اپنے ہاتھوں میں دو پہاڑ اٹھائے ہوئے
تھے۔ اور اس مرید سے مخاطب ہو کر فرمایا "کیا تم چاہتے ہو کہ اس ایک پہاڑ
سے عبد اللہ کوہاٹی کو کچل دوں اور اس دوسرے سے اللہ داد مندوری کو۔"
وہ مرید کہتا ہے۔ کہ میں خوف کے مارے کچھ جواب نہ دے سکا۔ آخر حضرت
شیخ نے خود فرمایا۔ چلو جانے دو۔ دونوں عالم ہیں اور پہاڑ اپنی اپنی جگہ
پر رکھدیئے۔ اس کے بعد اس مرید کے کان کو چھیدا اور فرمایا۔ جاؤ میں نے تم کو
اپنا نشاندار بنایا۔ اور پھر غائب ہو گئے۔ وہ مرید کہتا ہے۔ اس کے بعد میری
تمام پریشانیاں دور ہو گئیں۔ اور بہت جلد میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اس واقعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کاکا صاحب اور حاجی بہادر صاحب
کے درمیان معمولی سا روحانی رابطہ بھی ہوتا۔ تو وہ ایسا ہر گز نہ کہتے۔ اس
سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ حاجی بہادر صاحب کی شہرت کے زمانے میں حضرت
رحمکار کاکا صاحب فوت ہو چکے تھے۔ اور اس واقعے سے یہ بات بھی صاف
ظاہر ہے کہ محمد درویش کا افسانہ محض خوش عقیدگی اور سنی سنائی بے بنیاد

باتوں پر بنی ہے۔ اور اس لئے جناب عقاب کا یہ فیصلہ کہ ہمارے خیال میں کاکا صاحبؒ حاجی بہادر صاحبؒ کے ماذون تھے"۔ اس سے بھی زیادہ من گھڑت اور اس کی اپنی خواہش کا آئینہ دار ہے۔ اور پھر عقاب صاحب کی دیانت داری پر بھی تعجب ہے۔ کہ اسکو مقاماتِ قطبیہ میں یہ روایت نظر نہیں آئی۔

اب تک جو کچھ کہا گیا، اگر میں اسے مختصر اور سادہ لفظوں میں بیان کروں، تو میں یہی کہوں گا کہ حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کے معاصر اولیاء اللہ کے مریدوں اور معتقدوں میں سے ہر ایک نے یہ کوشش کی ہے کہ حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کو اپنے متعلقہ پیر کا مرید ظاہر کرے۔ اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ ان تینوں صاحبان میں سے کسی کے مرید تھے۔ اور نہ فیض یافتہ۔ اور یہ تمام باتیں من گھڑت ہیں۔ اور اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو ایسی مقبولیت بخشی کہ آپ ابتدا ہی سے زائرین و معتقدین کے آنے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور ان کو روکنے کی کئی تدابیر اختیار کیں۔ لیکن بمصداق ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں ؛؛ مردم و مور ملخ گرد آیند

طالبان حق اور جویائے معرفت جوق در جوق آپکے آستانہ عالیہ پر حاضر ہونے لگے۔ اور آپ کے منع کرنے کے باوجود بھی منع نہ ہوتے تھے۔ بلکہ ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بمصداق ؎

تو خواہی آستیں افشاں و خواہی دامن اندر کش
مگس ہرگز نخواہد رفت از دکان حلوائی

یہ صورت حال حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کی زندگی میں تھی [illegible]

تھی۔ اور بعد از وفات چار سو سال گزرنے کے باوجود بھی آپ کے مزار پُر انوار پر زائرین و معتقدین کا اتنا ہجوم رہتا ہے۔ کہ اسے دیکھکر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اور یہ مبالغہ اور نرا دعویٰ نہیں بلکہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے جس کا جی چاہے آکر دیکھ لے۔ اور یہ نہ کسی پروپیگنڈے کا مرہون منت ہے۔ اور نہ ذرائع ابلاغ کا۔ بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور حضرت شیخ رحمکار کی ایک زندہ کرامت ہے ۔

این سعادت بزور بازو نیست ؛ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ صورت حال دیکھکر آپ کی وفات کے فوراً بعد آپ کے ہم عصر اولیاء اللہ کے مریدین و معتقدین میں جو پڑھے لکھے لوگ تھے، انہوں نے اپنے اپنے پیران طریقت کی اہمیت ظاہر کرنے کی خاطر کئی جعلی افسانے بنائے۔ اور اس کام کی ابتداء حضرت رحمکار کاکا صاحب کی زندگی میں ہوئی تھی۔ جیسا کہ شاہی فقیر کے اس قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعد از مدتے خاندان پیر سباک گفت کہ آنحضرت مرید پیر سباک اند۔ (یہ بات شاہی فقیر نے حضرت رحمکار کی زندگی میں کہی ہے۔ ظفر) چنانچہ ایک طرف اگرا خون پنجو صاحب کے متعلقین نے حضرت رحمکار کو اخون پنجو صاحب کا مرید ظاہر کیا، تو دوسری طرف پیر سباک صاحب کے معتقدین و متوسلین بھی پیچھے نہ رہے۔ اور انہوں نے بھی حضرت رحمکار کو پیر سباک صاحب کا مرید کہنا شروع کیا بلکہ وہ تو آج تک حضرت کاکا صاحبؒ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اور اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ان ہر سہ صاحبان میں سے پیر سباک صاحب، حضرت رحمکار صاحب سے نسبتاً زیادہ نزدیک تھے۔ لیکن اس بارے میں محمد درویش ان سب سے بازی لے گیا ہے۔ اور پھر عقاب صاحب نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ آپ ایک مؤرخ سے جج بھی بن بیٹھے۔ اور بحث فیصلہ دیدیا کہ ہمارے خیال میں حضرت کاکا صاحب

حضرت حاجی بہادر صاحب کے صرف ماذون تھے۔ اور اُن کو محض دعا اور توجہ کی اجازت تھی۔ اس بارے میں میں یہی کہوں گا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ؛ چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

ان من گھڑت باتوں سے قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب کے بارے میں ان جھوٹے افسانوں کا واحد مقصد "یک انار و صد بیمار" ہے۔ ہر ایک نے یہی کوشش کی ہے۔ کہ حضرت کاکا صاحب کو اپنے مرشد کا مرید ظاہر کرے۔ اور یہی ثبوت ہے اس بات کا کہ تمام باتیں غلط ہیں۔ آخر حضرت کاکا صاحب کس کس کے مرید ہوتے اور کیوں؟

جناب سرفراز خان عقاب نے اپنے کتابچے میں بہت زیادہ غلط بیانیاں کی ہیں۔ بدقسمتی سے وہ گولڈ میڈلسٹ ہونے کے علاوہ دبی زبان میں اپنی غوثیت کے مدعی بھی بنے بیٹھے ہیں جب کہ اپنے کتابچے کے صفحہ ۵۶ پر درجہ کے عنوان سے لکھتے ہیں: "عبدالحلیم [illegible] آپ کا درجہ قطب وحدت اور معشوقیت لکھا ہے۔ یہ ایک نام [illegible] ، متصرفین ، اہل تکوین ، یا رجال الغیب یا غائبان یا جو گی [illegible] سردار ہوتا ہے۔ اور وہ پورا پیر ہوتا ہے۔ قطب اس کا نائب اور [illegible] ہوتا ہے۔ قطب سے نچلے درجوں سے پیری مریدی سے سروکار نہیں [illegible] میں سالک بھی ہوتے ہیں مجذوب بھی اور روحانی بھی۔" سچی بات [illegible] صاحب نے جو کچھ لکھا ہے۔ میں تو اس کا مطلب نہیں سمجھتا [illegible] اگر قارئین میں سے کسی نے کچھ سمجھ لیا ہو تو اس کی خوش قسمتی ہوگی۔ [illegible] شیخ عبدالحلیم صاحب نے اپنے والد حضرت رحمکار [illegible] کا [illegible] اور مقام لکھا ہے وہ اُنہی کے الفاظ میں [illegible] لکھا جاتا ہے۔

آپ لکھتے ہیں :-

"وحضرت ایشان از مردان اللہ تعالیٰ عز وجل و از اخص اولیاء اللہ بودند وفرد و قطب حقیقی بودند وبمرتبۂ قطب وحدت کہ قطب منتہی است و بمعشوقیت رسیدہ بودند" (مقامات ص۲۷)

جناب عبدالحلیم صاحب نے اولیاء اللہ کے مختلف مدارج کی تفصیل بیان کی ہے لیکن اس مختصر سی کتاب میں ان تمام باتوں کے ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلئے میں ان کی عبارت کے چند آخری جملوں کا ترجمہ لکھتا ہوں۔

"عبادت کا پہلا مقام عادت ہے جوکہ ناسوت ہے۔ اور جب ایک درویش عادت پرستی کے اس مرحلے سے گزرجاتا ہے یعنی اخلاص کی عبادت کا ملکہ حاصل کرلیتا ہے، تو فرشتوں کے مقام یعنی مقام ملکوت میں پہنچ جاتا ہے۔ اور جب اخلاص حاصل کرلیتا ہے، تو عادت پرستی سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اخلاص کے ذریعے مقام جبروت میں پہنچ جاتا ہے۔ یعنی اسے ارض وسمائے عرش وکرسی، ملائک و افلاک، کشف وکرامات اور جبروت حاصل ہوجاتا ہے۔ اور اسکو مقام جبروت کہتے ہیں۔ اسکے بعد بھی جب سلوک میں ترقی کرجاتا ہے۔ تو مقام لاہوت میں جو فردانیت کا مقام ہے اور جہات وحدود سے منزہ ہے، پہنچ جاتا ہے۔ اور ہمیشہ باری تعالیٰ کی تجلیات میں مشغول ہوتا ہے"۔

حضرت شیخ عبدالحلیم نے جو کچھ لکھا ہے وہ پیش خدمت ہے۔ اب اس کا عقاب صاحب کے بیان سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوجائے گا۔ کہ عقاب صاحب حقائق کو مسخ کرنے میں کتنے بے باک ہیں۔

[illegible] اپنے کتابچے کے صفحات ۵۷ تا ۶۱ میں جناب عقاب صاحب نے حضرت [illegible]

[illegible]ت کا کا [illegible]

کاکاصاحب کے مریدوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن چونکہ ایک ذہنی کرب میں مبتلا ہے، اس لئے یہاں بھی اس کا قلم ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ میں اس عنوان میں سے صرف "نظر مرید" کا واقعہ یہاں پیش کرونگا۔ یہ واقعہ جناب عقاب نے اپنی عادت کے مطابق خوب نمک مرچ لگاکر بڑے مزے سے بیان کیا ہے۔ اور غالباً اس پر اتراتا بھی ہوگا کہ "کارے کردم" اس لئے یہ واقعہ آپ بھی سن لیجئے۔ اور عقاب کی بدگمانی اور بہہ دانی کی داد دیجئے۔

اصل واقعہ:۔ نظر نام یوسف زئی سوات کا رہنے والا تھا۔ اور حضرت کاکاصاحب کا مرید تھا۔ حضرت کاکا صاحب نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے اسے میاں جعفر اٹک والے کے پاس بھیجدیا، جو ان دنوں بھی سوات میں مقیم تھا۔ نظر سوات جاکر میاںصاحب جعفر کے پاس رہنے لگا۔ آب جناب عقاب کی بدگمانی دیکھیئے۔ لکھتا ہے: اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کاکا صاحب ولی حیاتی تھے۔ ولی مماتی نہ تھے۔ اور اس سے ملا مبین کی اس لکھے کی تکذیب ہوتی ہے کہ کاکا صاحبؒ نے اپنی موت کے بعد قبر سے باہر آکر عبدالحلیم کو فیض پہنچایا تھا۔" یعنی اسکو کہتے ہیں "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ"۔

نظر مرید کا واقعہ حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۵۷ پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا مقدمہ یہ ہے۔ کہ نظر نام سوات کا رہنے والا حضرت کاکا صاحب کا مرید تھا۔ کئی بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ آپ نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے اسے میاں جعفر سکنہ اٹک کے پاس بھیجدیا۔ اور ان کے پاس رہنے کی اجازت دے دی۔ حضرت رحمکار کی وفات کے بعد اتفاقاً حضرت عبدالحلیم صاحب کی ملاقات شیخ جعفر کے ساتھ ہوئی انہوں نے وہاں نظر مرید کو بھی دیکھا۔ اس نظر نے حضرت عبدالحلیم صاحب سے خود کہا۔

کہ میں حضرت شیخ جی صاحب کی اجازت سے یہاں آیا ہوں۔ کیونکہ وہ طبیب حاذق تھے۔ اگر میں یہاں نہ آتا، اور وہ رحلت فرماتے۔ تو میں دیوانہ بن جاتا شیخ عبدالحلیم صاحب مزید فرماتے ہیں، کہ حضرت شیخ رحمکار صاحب نے اس مرید کو اس لئے اجازت دی تھی کہ وہ دل میں شیخ جعفر صاحب کی طرف مائل تھے۔ جب میاں جعفر نے حضرت شیخ صاحب کی یہ کرامت سنی تو کہنے لگے کہ حضرت شیخ صاحب بڑے مرتاض تھے۔" بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ بنایا گیا۔

ولی حیاتی اور مماتی کے الفاظ عقاب صاحب کے خود ساختہ ہیں۔

رہی یہ بات کہ شیخ عبدالحلیم صاحب نے اپنے والد ماجد حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب سے بعد از وفات فیض حاصل کیا ہے۔ تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس کا اقرار حضرت عبدالحلیم صاحب خود کرتے ہیں۔ تو پھر اس کے لئے میاں مبین یا کسی دوسرے کی گواہی کی اور پھر اسکی تصدیق یا تکذیب کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضرت عبدالحلیم صاحب کا اپنا اقرار و اعتراف اس وقت مصدقہ سمجھا جائیگا جب اُسکی تصدیق عقاب صاحب کی طرف سے کوئی مقرر کردہ گواہ یا کمیشن کرے۔

اب رہا عقاب صاحب کا یہ لکھنا کہ کاکا صاحب قبر سے باہر آیا اور عبدالحلیم صاحب کو فیض پہنچایا۔ یہ عقاب صاحب کی کج فہمی کی دلیل ہے مرجانے کے بعد قبر سے باہر کوئی بھی نہیں آسکتا۔ اس بات کے لئے عقاب صاحب نے میاں مبین کا جو حوالہ دیا ہے۔ ان سطور کے لکھتے وقت میرے سامنے میاں مبین مرحوم کی منظوم مناقب موجود ہے۔ یہ تمام مناقب حضرت عبدالحلیم صاحب کے مقامات قطبیہ کا منظوم جریہ ہے۔ میری نظر سے تو یہ بات کبھی بھی نہیں گذری ہے کہ میاں مبین نے کاکا صاحبؒ کے قبر سے باہر آنے کے بارے

میں بھی کچھ لکھا ہے۔ اسلئے عین ممکن ہے، کہ جس طرح عقاب صاحب نے دوسری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے، اسمیں بھی اپنے ہاتھ کی صفائی دکھائی ہو۔

بہر حال اس سلسلے میں حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے :۔

(ترجمہ) جان لو اے میرے دوست! اولیاء اللہ تین قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ بعض تو ولایت کے حامل ہوتے ہیں لیکن سرایت نہیں رکھتے کہ ان کی تاثیر دوسروں کو پہنچ سکے۔

۲۔ دوسرے وہ جو ولایت وسرایت دونوں رکھتے ہیں لیکن صرف زندگی تک۔ اور وفات کے بعد اُن کی سرایت منقطع ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے اولیاء کو کامل کہتے ہیں۔

۳۔ اور بعض ولایت وسرایت دونوں کے حامل ہوتے ہیں۔ زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی۔ اور ان کو مکمّل کہتے ہیں۔ اور اس زمانے میں یہ خصوصی مرتبہ حضرت شیخ رحمکار قدس سرہٗ کو حاصل ہے۔ جیسا کہ زمانہ سابقہ میں حضرت بایزید بسطامی کو حاصل تھا۔"

فیض یابی :۔ اور جس طرح انبوہ کثیر نے حضرت شیخ المشائخ کی زندگی میں ان کے جام سے شراب محبت نوش کیا ہے اور درخت معرفت کا ثمر کھایا ہے۔ اور ان کے علاوہ تین ہزار غلاموں کو ان کے مالکوں سے خرید کر اُن کو آزاد کرالیا ہے۔ اور پھر اُن کو جمال بے مثال کی انتہا پر پہنچایا بھی ہے۔ اور جن لوگوں نے ان سے فیض پایا ہے۔ ان میں اکثر ملک بنگش، کرم، ٹل، اور مروت وغیرہ وطنوں میں سکونت رکھتے ہیں۔ اور یا مدفون ہیں اور بعضوں نے شہرت حاصل کی ہے۔ اور انکے مزارات

معلوم ہیں۔ اور بعض اسی طرح اخفا میں ہیں۔ اور ان کو جو فیض پہنچا ہے۔ محض تاثیر سے، بعضوں کو تاثیر مجلس سے۔ بعض کو خواب میں اور بعض کو توجہ باطنی کے ذریعے فیض پہنچایا کرتے تھے۔ اور اب ان کی وفات کے بعد بھی بہت سے لوگوں نے ان سے فیض پایا ہے۔ اور حاصل کر رہے ہیں بدستور۔ بعض خواب میں بعض مزار پر حاضری کے وقت۔

اور ان مناقبات کے جامع فقیر (عبدالحلیم) نے بھی روضۂ متبرکہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ اور اس سے بہت حظ اٹھایا ہے۔ اور اکثر اوقات روضۂ متبرکہ میں حاضری کے دوران مجھے انواع و اقسام کے فیوض حاصل ہوئے ہیں۔ جو کچھ دیکھا وہ میرے دل کی آنکھوں نے دیکھا۔ اور جو کچھ سُنا وہ میرے دل کے کانوں نے سُنا۔ اس ضمن میں لمبی چوڑی بحث کرنا خلاف ادب ہے۔ اسلئے مختصراً میں نے اپنا حال بیان کیا۔ کیونکہ مشہور مقولہ ہے۔ کہ بہترین کلام وہ ہوتا ہے، جو مختصر اور مدلل ہو"

قارئین کرام! جب شیخ عبدالحلیم صاحب خود فرماتے ہیں کہ جو کچھ دیکھا وہ میرے دل کی آنکھوں نے دیکھا۔ اور جو کچھ سُنا وہ میرے دل کے کانوں نے سنا۔ اور محسوس کیا۔ تو پھر اس صورت میں کسی دوسرے کی تصدیق اور شہادت کی کیا تُک ہے؟۔ کیونکہ ؎

اکنون کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات صاف ظاہر ہے، کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب اپنے مریدوں اور متوسلین کو کس طریقے سے فیض پہنچایا کرتے تھے۔ اور یہ سلسلہ آج تک بہ تسلسل جاری ہے۔ نیز یہ بھی ملحوظ خاطر رہے، کہ اس عبارت کا لکھنے والا بھی انتہائی قابل اعتماد ہے۔ اب اگر عقلاً صاحب مقامات قطبیہ میں تمام

تفاصیل نہ دیکھ سکیں۔ اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر تشکک اور شبہات پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ تو اس میں ہم انکی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟

دیانت داری اور شرافت کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرۂ جو اس راستے کے راہ و رسم و منازل سے خوب اچھی طرح واقف ہیں خود اقرار کرتے ہیں تو پھر اس کے ماننے میں ہمیں ذرہ بھر بھی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اپنی حالت تو یہ ہے کہ ؎

نہ رنج خار کشیدم نہ روئے گل دیدم
زعندلیب شنیدم کہ نو بہارے ہست

ہم تو اس سفر کے راہ و رسم و منازل سے قطعی کورے اور نابلد ہیں۔

قاعدہ ہے کہ اگر آپ نے چاند نہ دیکھا ہو۔ اور دوسرے قابلِ اعتماد اشخاص چاند دیکھنے کی گواہی دیں، تو آپ کو اس کی شہادت مان لینی چاہیئے۔

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب قدس سرہٗ کی اس بیان کی تصدیق دو اور بڑے عظیم المرتبت صوفیاء نے بھی کی ہے۔ جناب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت ابوبکر شبلی رحمہم اللہ علیہم دونوں فرماتے ہیں کہ :۔

"بعض اولیاء اللہ کا فیض ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے" اور یہ بات حد تواتر تک پہنچی ہے۔"

شجرہ نسب جیسا کہ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے، حضرت کاکا صاحبؒ تینتیسویں (۳۳) واسطے سے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں ہیں۔ جناب عبدالحلیم صاحب اثر نے اپنی کتاب "روحانی رابطہ" میں حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کے اس شجرے کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ شجرہ نامکمل ہے یعنی اس میں کچھ نام رہ گئے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی طرف سے اس شجرے میں چند ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ اب یہ شجرہ مکمل ہے۔ اثر صاحب کی دلیل یہ ہے۔ کہ تین (۳) پشتوں کے لئے کم از کم ایک صدی کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس معیار پر یہ شجرہ پورا نہیں اترتا۔ اس ضمن میں میری یہ گزارش ہے۔ کہ تین پشتوں کے لئے ایک صدی کا معیار ریاضی کا کوئی عام فارمولا نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ جس طرح ریاضی میں دو جمع دو ہر حال ہر وقت اور ہر جگہ چار ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر شجرے میں تین پشتوں کیلئے ایک صدی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بلکہ بہت سے علمائے انساب کے نزدیک تین پشتوں کے لئے معیار ایک سو بیس (۱۲۰) سال ہے۔ اب اگر تین پشتوں کے لئے ایک سو بیس سال کا معیار درست مانا جائے تو پھر حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کے شجرے میں کوئی خاص کمی معلوم نہیں ہوتی۔ اور بالفرض دو تین نام رہ بھی گئے ہوں، تو اس سے اصل حقیقت پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ناموں کی کمی بیشی صرف حضرت رحمکار کاکا صاحب کے شجرے سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ننانوے (۹۹) فیصد شجروں میں ناموں کی کمی بیشی پائی جاتی ہے۔

اسی طرح آج سے تقریباً بیس سال پہلے جناب سرفراز خان صاحب عقاب [illegible] کتاب "[illegible] کاکا صاحب" میں بھی حضرت رحمکار کاکا صاحب [illegible]

[illegible] میں بہت سی [illegible] نام [illegible] لکھی ہیں، [illegible]

سب باتوں کا جواب دینا موزوں نہیں سمجھتا۔

دنیا جانتی ہے اور مانتی ہے کہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ نے خود کو فقر کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ وہ نہ اپنے پیر کا نام بتاتے تھے۔ اور نہ طریقے کا نہ خود کو پیر، مرشد اور مشیخیت پناہ حتیٰ سالک کہتے تھے۔ اور نہ دوسروں کو اپنے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو عبداللہ یعنی خدا کا بندہ کہتے اور اسے اپنا فخر سمجھتے تھے۔ وہ بندۂ عشق تھے۔ اور بندۂ عشق حسب نسب کے بکھیڑوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ بقول مولانا جامیؒ ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلان ابن فلان چیزے نیست

لیکن اسکے باوجود بھی وہ کسی نسل سے تو ضرور تعلق رکھتے تھے۔ اور اس کا تعین ہو چکا ہے۔ یہاں میں حضرت کاکا صاحبؒ کی سیادت کے بارے میں دلائل دینا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کاکا صاحبؒ کی سیادت پر شبہ کیا جاتا ہے۔ تو صوبہ سرحد کے دوسرے سینکڑوں خاندان جو سیادت کے مدعی ہیں، تو کیا انکی سیادت پر خدائی مہر تصدیق ثبت ہے؟ عقاب صاحب نے خود اپنے کتابچے کے ص ۳۲ پر لکھا ہے، حاجی بہادر صاحب کوہاٹی کو بعض لوگ سید اور بعض لوگ پشتون بتلاتے ہیں "تحفۃ السالکین" میں آپ کے لئے ہمیشہ میاں صاحب کوہاٹی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ سید کا لفظ کہیں بھی نہیں آیا۔ نیز اورنگ زیب نے جب آپ کو لوٹنے سے روکنا چاہا تو آپ نے کہا چلا جاؤں گا۔ وہ میرے باپ دادا کا وطن ہے۔ نیز اس کتاب میں لکھا ہے، کہ اللہ داد منددری نے آپ کی بابت کہا "وہ عالم سیدی تھے، جنہیں ایک پشتون نے شکست دی"۔ اس عبارت سے عقاب صاحب

یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ حاجی بہادر صاحب کو ہاٹی سید نہ تھے۔ لیکن ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ صاف اور واضح الفاظ میں اس قسم کی رائے کا اظہار کرے۔ لیکن دوسری طرف عقاب صاحب کے ہی انکشاف کے باوجود بھی حاجی بہادر صاحب کے معتقدین ان کو سید سمجھتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ اور ان کی اولاد کو بھی سید کہتے ہیں ملاحظہ ہو ۲۰ اپریل روزنامہ مشرق پشاور کا ایک مضمون تحریر اسلم فیضی۔ مضمون کا عنوان شہ سرخیوں کے ساتھ ہے۔ "حضرت سید عبداللہ حاجی بہادر"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار صاحب نے جناب عقاب سے اپنے مقالے پر مہر تصدیق ثبت کرالی ہے۔ ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو جناب عقاب ضرور حاجی بہادر صاحب کی سیادت پر بھی اعتراض کر بیٹھتے۔ پھر جناب عقاب صاحب حضرت پیر سباک صاحب اور حضرت اخون پنجو صاحب کی سیادت کے بارے میں بھی چپ سادھے ہوئے ہیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ آپ ان کے بارے میں بھی کچھ ارشاد فرماتے۔

عقاب صاحب اپنے کتابچے کے صـ۳۳ـ پر لکھتا ہے:-

"غرضیکہ سید اور غیر سید کا تنازعہ کئی خاندانوں میں چل رہا ہے۔ اور کئی میں حل ہو چکا ہے۔ یہاں ہم کاکا صاحب کی قومیت کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ جنہیں سابقین تو خٹک کہتے چلے آئے ہیں۔ لیکن متاخرین کا ایک گروہ انہیں سید کہتا ہے"۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ سید اور غیر سید کا تنازعہ جو بقول عقاب کے کئی خاندانوں میں چل رہا ہے اور کئی خاندانوں میں حل ہوا ہے۔ اس تنازعہ کا آپ کی ذات یا آپ کے خاندان پر بھی کچھ اثر پڑ رہا ہے کہ آپ اسے حل کرنے کی تکلیف گوارا فرما رہے ہیں؟ کن کن خاندانوں میں یہ تنازعہ فیصل ہوا ہے اور

کن کن خاندانوں میں ابھی تک غیر فیصل ہے؟ ان تنازعات میں مدعی کون ہے اور مدعا علیہ کون؟ کیا صوبہ سرحد کے دوسرے اولیائے کرام کی قومیت کا مسئلہ حل ہو چکا ہے صرف کاکا صاحب کی قومیت کا مسئلہ باقی تھا کہ آپ اس کے حل کرنے کے لئے بلا کسی درخواست و مطالبے کے آمادہ ہوئے؟ کیا اولیائے کرام کی قومیت کے تصفیۂ کے لئے آپ ٹریبونل کے طور پر مقرر کئے گئے ہیں۔ یا یہ ذمہ داری آپ نے از خود اپنے اوپر عائد کی ہے۔ کیا عقاب صاحب وہ وجوہات بتائیں گے۔ جن کے پیش نظر آپ نے صوبہ سرحد کے تمام دوسرے اولیاء اللہ کو چھوڑ کر اپنے شغل تحقیق کے لئے حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کی ذات والاصفات کو تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ عقاب صاحب نے حضرت کاکا صاحبؒ کے مجد و شرف کا خیال کئے بغیر ان کے اور ان کی اولاد کے بارے میں ایسی زبان استعمال کی ہے۔ جس سے ہتک کا پہلو نکلتا ہے۔ اور اس طرح حضرت رحمکار کاکا صاحب کے لاکھوں عقیدتمندوں کے جذبات کو صدمہ پہنچایا ہے۔ ایک قانون دان ہو کر بھی عقاب صاحب اس بات سے واقف نہیں۔ کہ ان کا یہ فعل قانون کی نظر میں جرم ہے۔ کیونکہ اس سے معاشرے کے مختلف طبقات میں منافرت پھیلنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

کسی عظیم شخصیت یا کسی علمی اور تاریخی مسئلے کے بارے میں علمی اصولوں کی روشنی میں تحقیق و تفتیش کرنا ایک مستحسن فعل ہے، بشرطیکہ اس تحقیق کا مقصد واقعی تحقیق ہو۔ نہ کہ اس سے اس عظیم شخصیت کی تنقیص کا پہلو نکل آئے اور اپنے من مانے نظریوں کو دوسروں پر ٹھونسنے کے لئے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خیالات و افکار

میں اختلاف کی گنجائش ہر وقت موجود ہوتی ہے، لیکن محض اختلاف خیالات وافکار کی بنا پر ایک عالم فاضل متقی پرہیزگار مسلمان کو خصوصاً جبکہ وہ فوت بھی ہو چکا ہو جھوٹا اور غلط بیان کہنا میرے نزدیک حد درجہ ناانصافی اور پست ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ اور اسلام اور انسانیت کی رو سے اسے ہرگز جائز نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ میں یہی کہونگا کہ جناب عقاب صاحب نے مجمع البرکات اور صاحب مجمع البرکات کے بارے میں اس قسم کے رکیک اور ناپسندیدہ الفاظ لکھکر صرف اپنی ذہنیت اور فطرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ کیونکہ "از کوزہ ہماں تراود کہ درواست"۔

مجمع البرکات کا جرم صرف یہ ہے کہ اس نے اپنی معلومات کے مطابق مستند مآخذوں کے حوالوں سے جو کچھ درست سمجھا ہے وہی لکھ دیا ہے۔ اب یہ قارئین کا کام ہے، کہ وہ اپنی معلومات کی روشنی میں اسے درست سمجھتے ہیں یا غلط، لیکن یہ کسی فرد کا بھی حق نہیں کہ وہ ایک مصنف کو محض اختلاف خیال کی بنا پر جھوٹا اور کذاب کہے۔ اسکی دیانتداری پر شبہ ظاہر کرے اور خود اپنے آپ کو عقل کل سمجھے۔ شریفانہ الفاظ میں دلائل کے ساتھ اس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مجمع البرکات کی تحریر چونکہ عقاب صاحب کے مقصد میں کھنڈت ڈالتی ہے اس لئے وہ عقاب کی نظر میں گردن زدنی ہے۔ اور نہ صرف مجمع البرکات بلکہ ہر وہ شخص اور کتاب بھی عقاب صاحب کی نظر میں معتوب ہے جس میں کاکا صاحب کو سید لکھا گیا ہو۔

جناب عقاب کے مندرجہ بالا بیان سے تو میں یہی سمجھ سکا ہوں، کہ گویا مجمع البرکات کی تالیف کا واحد مقصد یہ تھا کہ کاکا صاحب کو سید ثابت کیا جائے اور اس طرح انگریزوں سے کاکا خیلوں کو مفاد دلائے جاسکیں

دلوائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہی بات ہیر پھیر کے ساتھ بار بار کہتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عقاب صاحب بیمار ذہن کے مالک ہیں۔ اور دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "عوام میں آستانہ داروں کو جاگیریں اور معافیاں ملنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس لئے عبداللہ شاہ نے جھٹ بیٹھکر مجمع البرکات تصنیف کی تاکہ انگریزوں سے سید ہونے کے ناطے سے کاکاخیلوں کو جاگیریں اور معافیاں دلوائے۔" یہ ایک ایسی بات ہے۔ جسے ایک احمق ہی سچ سمجھ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں، فرض کریں کہ عوام میں آستانہ داروں کو معافیاں اور جاگیریں ملنے کی باتیں ہو رہی تھیں تو کاکاخیل تو پہلے ہی سے آستانہ دار تھے اگرچہ بقول عقاب کے یہ ایک خشک آستانہ تھا۔ تو مجمع البرکات کو اس بات کی ضرورت کیا تھی۔ کہ اس نے اس خشک آستانے کو سادات کے آستانے میں تبدیل کر دیا؟ کیا سادات اور دوسرے آستانہ داروں کی معافیوں اور جاگیروں میں کوئی گریڈ بندی تھی۔ مثلاً سادات کی معافیوں کا گریڈ ۲۲ اور دوسرے آستانہ داروں کا گریڈ ۱۵ تھا؟ اور اسے حماقت اگر نہ کہیں تو کیا کہیں کہ مجمع البرکات جیسی ضخیم معلوماتی کتاب جسکی ضخامت بڑی تقطیع میں کم از کم ایک ہزار صفحات سے زائد بنتی ہے۔ جھٹ بیٹھکر پٹ لکھی جا سکتی ہے؟ اور پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ عقاب صاحب کے نزدیک جھوٹ اور سچ کا معیار کیا ہے؟ جو بات آپ کے مقصد کے خلاف ہو وہ جھوٹی ہوگی؟ خواہ دوسرے ہزاروں افراد اسے سچ مانیں۔ مجمع البرکات کی یہ بات درست ہے کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب نے اپنے والد حضرت شیخ بہادر صاحب کے مناقب میں ایک کتاب لکھی تھی، جو بدقسمتی سے اب نایاب ہے، لیکن اس کا یہ مطلب کیسے دکھاتا ہے کہ مجمع البرکات کی یہ بات جھوٹی ہے۔ کیا میں کہوں جناب عقاب صاحب

میں لکھی ہوئی تمام کتابیں موجود ہیں ؟ سینکڑوں علماء و فضلا نے بڑی بڑی کتابیں لکھی تھیں۔ انکے نام تو بعض بعض کتابوں میں ملتے ہیں۔ مگر وہ کتابیں موجود نہیں ہیں۔ تو کیا ان کے وجود سے انکار کیا جائیگا اور کیوں ؟ حضرت داتا گنج بخش قدس سرۂ نے نو کتابیں لکھی ہیں۔ مگر ان میں صرف آج کل ایک کتاب کشف المحجوب موجود ہے۔ باقی کتابوں کے صرف نام ملتے ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی نے اس بات کو جھوٹ سمجھا ہے اور نہ اس پر شک ظاہر کیا ہے۔ کیا عقاب صاحب دُنیا بھر کے دانشوروں سے اپنے آپ کو ارفع اور بہتر سمجھتے ہیں ؟ اور کیوں ؟

مجمع البرکات نے بقول عقاب کے جعلی اور مصنوعی طریقے سے کاکاخیلوں کو سید بنا کر انگریزوں سے معافیاں اور جاگیریں دلوائیں، تو عقاب صاحب کو چاہیئے کہ ان جاگیروں اور معافیوں کی ایک فہرست بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں شائع کریں۔ جو مجمع البرکات کے اس کارنامے کی بدولت کاکاخیلوں کو ملی ہیں۔ اور اگر آپ یہ فہرست پیش نہیں کر سکتے، اور یقیناً نہیں کر سکتے، تو پھر اپنے خاندانی روایات کا اطلاق دوسروں پر کیوں کرتے ہیں ؟ کیا عقاب صاحب اس بات سے انکار کر سکتے ہیں، کہ انگریزوں کی جاگیریں اور معافیاں سیادت کے بدلے میں نہیں بلکہ قوم فروشی کے صلے میں ملا کرتی تھیں۔ اور کاکاخیلوں کا دامن خدا کے فضل سے اس داغ سے بالکل پاک و صاف ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ عقاب صاحب کا جھوٹ کے پلندے سے کیا مراد ہے ؟ کیا عقاب صاحب کا اپنا کتابچہ جھوٹ کا پلندہ نہیں ؟ کیا مخزن افغانی اور اسکی دیگر تاریخیں سے بھی زیادہ کوئی کتاب جھوٹ کا پلندہ ہو سکتی ہے ؟ کیا کاکا صاحب کو سید اپنا اور سمجھنا آپ کے نزدیک زیادہ جھوٹ ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات منسوب کرنا کہ آنحضرت نے جھوٹوں کو دوزخ کی [illegible] کہا ہے ۔ کیا حضرت کاکا صاحب [illegible]

کہنا بڑا جھوٹ ہے یا حضرت خالد بن ولید کو یہودی النسل کہنا اور سمجھنا۔ اور اسی پر اصرار بھی کرنا۔ مثل مشہور ہے کہ "نو نقد نہ تیرہ ادھار"۔ بقول عقاب صاحب مجمع البرکات کا مصنف جھوٹ گھڑنے میں اتنا ماہر تھا کہ جھٹ بیٹھکر پٹ مجمع جیسی ضخیم کتاب لکھ سکتا تھا۔ اور جھوٹے افسانہ طرازی میں اس حدتک ماہر تھا کہ حال کے آئینے میں مستقبل کی تصویر دیکھ سکتا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ چونکہ عالم تھا اسلئے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس حدیث سے ضرور واقف ہوگا یعنی کہ جو شخص اپنے باپ کو چھوڑ کر اپنا رشتہ دوسرے سے جوڑ دے۔ اور اس کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ اس کا والد نہیں ہے بس جنت اس پر حرام ہے " (اس حدیث کے راوی سعد بن ابی وقاص ہیں اور بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے)۔ اور پھر بقول عقاب انگریز جیسی بنیا قوم سے انعامات اور جاگیریں ہتھیانے کیخاطر اپنے ممدوح حضرت کاکا صاحب کے نسب کو بدل کر اتنی بھاری قیمت ادا کرنے کیلئے تیار ہوا۔ تو کیا مجمع البرکات کے مصنف کے لئے یہ بات آسان نہ ہوتی کہ اتنی بھاری بھرکم کتاب تصنیف کرنے کی بجائے جھٹ بیٹھکر پٹ ایک دوسرا شجرہ بنالیتا اور اس کے ساتھ عقاب صاحب کی طرح ایک اوٹ پٹانگ کتابچہ بھی لکھ دیتا۔ اور اس میں حضرت کاکا صاحب کی اولاد کو خوانین خٹک یا کسی دوسرے پشتون قبیلے کے خوانین سے ملا دیتا۔ اور نہ کاکا خیلوں کے ہاتھ میں تھما دیتا کہ لو یہ سرٹیفکیٹ ، یہ آپ کے پاس ایک دستاویزی ثبوت ہے ... تاکہ [illegible] اور اپنے آپ کو [illegible] اور [illegible] خٹک کی اولاد کہلاؤ۔ اور خوانین خٹک بن جاؤ۔ اور اس [illegible] کاکا صاحب کے [illegible] ان کے تمام علاقے کے مالک بن جاؤ [illegible]

[illegible]

کاکاخیلوں کے لئے انگریزی دور میں مراعات انعامات اور جاگیریں [illegible]
کا تقاضا کیا ہے۔ اس کے لئے کون سا طریقہ زیادہ مفید تھا؟ کیونکہ آپ کے سامنے
اس سے تو سارا ثبوت گزر گیا کہ انہوں نے اپنے ممدوح کی اولاد کو انگریزی دور میں جاگیریں
اور انعامات سے مالامال کیا۔ اور میرا اس بارے میں آپ سے سوال ہے کہ
دستاویزی ثبوت موجود ہے؟ کیا انگریزوں نے کاکاخیلوں کو ایک پیسہ بھی دیا۔ اگر
یا کوئی انعام میں جائیداد کے طور پر دیا ہے؟ کوئی ایک نام تو بتا دیا۔
بقول جناب صاحب کاکاخیل اگر خٹک تھے تو کیا یہ بات ان کے لئے مفید نہ ہوتا
کہ وہ اپنے آپ کو خٹک ہی رہنے دیتے اور انگریزوں کے تمام دور حکومت میں
ان کو غیر افغان اور غیر زراعت پیشہ اقوام کی فہرست میں شامل نہ ہونا پڑتا۔ کیا
آپ کو علم نہیں کہ انگریزوں کے تمام دور حکومت میں محض سیادت کی وجہ سے
کاکاخیل فوجی ملازمت سے محروم تھے۔ اس دور میں اگر کوئی کاکاخیل فوجی ملازمت
میں بھرتی ہوا بھی ہے۔ تو وہ کاکاخیل کے نام سے نہیں بلکہ اکوڑہ خٹک یا کسی
دوسرے نام سے ہوا ہے۔

بقول عقاب اگر کاکاخیل یسین خیل خٹک ہیں تو یسین خیلوں کی جائیداد میں
ان کا حصہ کیوں نہیں ہے؟ جائیداد کے مالکانہ حقوق تو حضرت رحمکار کاکا صاحب
کی رحلت کے زمانے کے بعد انگریزوں کے دور حکومت میں ملے ہیں۔ اور یسین خیلوں
کی نسبت آج کے مقابلے میں اس زمانے میں بھی کاکاخیل زیادہ مقتدر تھے۔ تو کیا
ان کے لئے یہ مفید نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو خٹک ہی رہنے دیتے۔ اور زیارت کاکا
[illegible] ان کے
کوئی بات مفید تھی [illegible]
[illegible]

کھسیانی بلی کھمبا نوچے"

عقاب صاحب ۔ نے اپنے کتابچے کے صـ۱۹ پر حضرت کاکا صاحب کا ایک
رہ کھ دیا ہے ۔ یہ شجرہ قطعی جعلی اور ... ہے ۔اور اس کے بارے میں میں
ی سنجیدگی سے عقاب صاحب کو دعوت دیتا ہوں ۔ کہ آپ نے اس
رے کے لئے جن کتابوں کے حوالے دئیے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی
نے یہ شجرہ لکھا ہوا ثابت کیا تو میں آپ کی (؟) تحقیق کیلئے دل وجان سے
ن ہونگا ۔ لیکن اگر آپ ایسا نہ کرسکیں تو پھر آپ نے صریحاً بددیانتی اور
خانہ خیانت سے کام لیا ہے ۔ اور میں یہی کہوں گا کہ ع
چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

س شجرے کے بارے میں آپ اپنے کتابچے کے صـ۲۷ پر لکھتے ہیں ۔ آپ کی
ت کے بارے میں بند و بستی شجرہ قابلِ التفات ہوتا لیکن وہ بھی مجمع البرکات
یا اور اس کے بعد لکھا گیا ہے ۔ اور بند و بست کی دوسری تالیفات کی
 لاپرواہی سے لکھا گیا ہے"۔

جیسا کہ اوپر کی عبارت سے ظاہر ہے ،عقاب صاحب کے اعصاب پر
برکات کا ہوا بری طرح سوار ہے ۔میں نہیں سمجھتا ۔ کہ یہ عبارت لکھتے وقت
 صاحب ہوش و حواس میں بھی تھے ؟ ۔ یہ بندۂ خدا اتنا بھی نہیں جانتا کہ
ع البرکات "بند و بست" سے بہت پہلے کی تصنیف ہے تو بند و بست کے
میں جو شجرہ لکھا ہوا ہے ، وہ لازماً مجمع البرکات کے بعد کا ہی ہوگا ۔ پھر عقاب
 کے پاس اس ... کونسا دستاویزی ثبوت ہے ، کہ بند و بستی شجرہ
کات کے ... کیا جاتا کہاں بند و بست کو ... کا علم تھا
... بند و بست

کے اہل کاروں کے سامنے پیش کی گئی تھی۔

اور پھر بندوبست کی تالیفات میں کسی قسم کی لاپرواہی برتی گئی ہے۔ انہوں نے تو جو حقیقت تھی وہی لکھی ہے۔ ان کی تحریریں آپ کے حسب منشا نہیں ہیں۔ تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ آپ کو اپنی ذہنی بیماری کا علاج کرنا چاہئے نہ کہ حاکمان بندوبست پر برسنا۔ کیا بندوبست کا عملہ کاکاخیلوں کے ماتحت تھا کہ وہ ان سے اپنے حسب منشا کام لیتے۔ آپ اپنی روایات کو دوسروں پر کیوں مسلط کرتے ہیں؟

اب عقاب صاحب تاریخ پشاور پر برستے ہیں۔ اپنے کتابچے کے ص۳۷ پر لکھتے ہیں۔ عملہ بندوبست کی لکھی ہوئی اس کتاب میں لکھا ہے کہ:۔

"عوام الناس کہتے ہیں کہ شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں سید بہادر خان جس کا لقب ابک بابا ہے، کابل کے قریبی علاقہ پشین سے پہلے کوہاٹ آئے۔" اس مختصر سی عبارت میں گوپال داس اور اس کے عوام الناس نے تین بڑی غلطیاں کی ہیں۔ (۱) بہادر خان سے بہت پہلے ہم اس کے دادا شیخ آدمؒ کو کربوغہ میں پاتے ہیں۔ (۲) اس کا بیٹا شیخ غالبؒ بھی خوڑہ سابق کوہاٹ حال پشاور میں دفن ہیں۔ (۳) اور اس کا بیٹا شیخ مستؒ نوشہرہ میں۔ تو اس کا بیٹا بہادر خانؒ پشین کب گیا۔ اور وہاں سے کب واپس آیا۔ شاہ جہان (۱۰۳۷-۶۹ھ) کا دادا اکبر (۱۰۱۴-۹۶۳ھ) ملک اکوڑ اور بہادر خان کا ہم عصر تھا۔ تو پھر بہادر خان شاہ جہان کا ہم عصر کیونکر ہو سکتا ہے۔"

ابھی تک تو مجھے عقاب صاحب کے پڑھے لکھے ہونے کے بارے میں تھوڑا بہت کچھ حسن ظن تھا۔ لیکن ان کی یہ تنقید پڑھ کر مجھے یقین ہوا کہ وہ بالکل نرے گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ عقاب صاحب کی نظر میں ہر وہ کتاب یا تحریر غلط ہے جو

اس کے خود ساختہ کھیل میں کھنڈت ڈالدے۔ اس کے من پسند انگریزوں نے کاکا صاحب اور کاکا خیلوں کے بارے میں جس لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ تو اسکو ذرہ بھر بھی نہیں کھٹکتی۔ بلکہ اسے بطور سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ پشاور میں ان کو کیڑے نظر آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں، تاریخ پشاور اس علاقے کے بارے میں بہت مستند اور مفصل کتاب ہے۔ لیکن عقاب صاحب کی نظر میں اس لئے مستند نہیں۔ کہ اس میں کاکا خیلوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بقول عقاب کے مجمع البرکات کے زیر اثر لکھا گیا ہے' حالانکہ یہ ایک ایسی بات ہے جیسے یا تو پرلے درجے کا ایک احمق ہی درست مان سکتا ہے' اور یا وہ شخص جو تعصب کی وجہ سے حقیقت نہ دیکھ سکتا ہو۔

اب عقاب صاحب کو کون سمجھائے کہ مجمع البرکات کے بعد تو سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تو کیا وہ تمام کتابیں اب غیر مستند ہیں؟۔ انگریزی دورِ حکومت کے آغاز میں خصوصاً ضلع پشاور و مردان کی حد تک تاریخ پشاور واحد کتاب ہے جو بڑی احتیاط اور چھان بین کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں اس کا مؤلف گوپال داس اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اس طرح لکھتا ہے:۔

"تاریخی حالات میں نے اکثر تاریخ کی کتابوں سے اخذ کئے ہیں اور قومی حالات بعد از تحقیق لکھے ہیں۔ اور اکثر حالات میرے چشم دید ہیں"۔

عقاب صاحب نے اپنے کتابچے میں تاریخ پشاور کا جو حوالہ دیا ہے اور گوپال داس اور اس نے عوام الناس پر جو برس پڑے ہیں اس پر بھی حسب عادت اس نے ڈنڈی ماری ہے۔ [illegible] ان تاریخ پشاور کے صفحہ ۲۲۷ پر اس طرح لکھا ہوا ہے۔

"یہ گاؤں بوبہ حضرت شیخ کستیر صاحب المعروف بہ کاکا صاحب [illegible] رحمتہ اللہ علیہ کے [illegible] عوام الناس [illegible] ہیں کہ [illegible]

بہادر خان الملقب بہ ایک صاحب جو اپنے زمانے کے ولی کامل تھے علاقہ پشین نواح کابل کے بہ تقریب سیر پہلے علاقہ کوہاٹ میں آئے۔ اور وہاں سے موضع کناخیل مضافات علاقہ خٹک اس ضلع میں آکر اقامت گزین ہوئے۔

"اسی تاریخ پشاور کے صفحہ ۲۲۱ پر کاکاخیل غیر افغان قوموں کی فہرست میں درج ہے۔ اور اس تاریخ کا مولف گوپال داس یہ بھی لکھتا ہے۔ کہ جس جگہ حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کا مزار واقع ہے اور جہاں زیارت کاکا صاحب کا موجود قصبہ واقع ہے۔ یہ زمین شیخ کستیر گل صاحب نے موضع سبین کائی کے مالکوں سے قیمتاً خریدی تھی۔"

اب میں ان اعتراضات کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، جو جناب عقاب صاحب نے تاریخ پشاور پر کئے ہیں۔

۱۔ گوپال داس اور اس کے عوام الناس نے کبھی بھی جناب عقاب کی طرح اپنے بارے میں ہیرو ڈوٹس ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آیا عوام الناس کا یہ بیان تاریخ سے لفظ بہ لفظ بقید سن و سال مطابق ہے یا نہیں؟ بلکہ اصل مسئلہ اس بیان کی روح ہے جو اس میں بہر حال واضح شکل میں موجود ہے، یعنی یہ کہ شیخ بہادر صاحب قدس سرہ اس علاقے کے اصل باشندے نہ تھے بلکہ باہر سے آئے ہوئے تھے۔

۲۔ یہ ظاہر ہے کہ عوام الناس تاریخ کے طالب علم نہیں ہوتے، کہ ان کو تاریخ کے تمام واقعات ترتیب وار بقید سن و سال یاد ہوں۔ کیا موجودہ زمانے میں جبکہ گوپالداس کے زمانے کے مقابلے میں تعلیم میں بہت وسعت اور ترقی ہو چکی ہے اور ذرائع ابلاغ میں بھی بہت زیادہ پیش رفت ہو گئی ہے کتنے فیصد عوام الناس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ ان کو اکبر اور شاہجہان کے درمیان حقیقی رشتے کا علم ہوگا۔ یا کہ

اکبر اور شاہ جہان کا عہد حکومت بلقید سن و سال یاد ہوگا؟

پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے، کہ حضرت شیخ بہادر قدس سرہ اور تاریخ پشاور کی تالیف کے درمیانی زمانے میں کئی پشتیں گذر چکی تھیں اور شیخ بہادر صاحبؒ اور اس سے متصلہ زمانے کے لوگ مر کھپ چکے تھے۔ اس کے باوجود بھی یہ روایت تواتر کے ساتھ عوام الناس میں پشت بہ پشت تاریخ پشاور کی تدوین کے زمانے تک چلی آرہی تھی۔ اور لوگوں میں مشہور تھی۔ اور ان کو اس بات کا یقین تھا کہ حضرت شیخ بہادر صاحب قدس سرہٗ اس علاقے کے اصل باشندے نہ تھے۔ اور ان کے اجداد اس علاقے میں باہر سے آئے ہوئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو جن لوگوں نے گوپال داس کے سامنے یہ روایت بیان کی تھی، ان کے راستے میں اسکے برخلاف بیان دینے میں کونسی رکاوٹ تھی؟ رہی یہ بات کہ انہوں نے شیخ بہادر صاحب کے اجداد کا نام کیوں نہیں لیا تھا۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ آجکل کے اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی ننانوے فیصد عوام الناس کو اس بات کا علم نہ ہوگا۔ کہ حضرت شیخ بہادر صاحب کے دادا کون تھے اور پردادا کون؟ عوام الناس کو اس بات کی ضرورت کیا ہے کہ وہ حضرت شیخ بہادر صاحب، یا حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کے اجداد کرام کے ناموں کا وظیفہ کرتے رہیں۔ اور ان کو پشت بہ پشت یاد رکھیں، جبکہ آجکل تو یہ حالت ہے۔ کہ عوام الناس کو خود اپنی تین پشتوں کے اجداد بھی معلوم نہیں ہوتے عوام کو آم کھانے سے غرض ہوتی ہے، پیڑ گننے سے ان کو کیا غرض؟ اس لئے میں کہتا ہوں کہ کاکا خیلوں کی سیادت کے بارے میں اگر اور کوئی شہادت بھی نہ ہوتی تو یہ شہادت اتنی وزنی اور معقول ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کے اجداد اس علاقے کے اصلی باسی نہ تھے۔ بلکہ باہر سے آئے

ہوئے تھے۔

یہ بات کہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب سید تھے، نہ صرف مجمع البرکات اور تاریخ پشاور میں لکھی ہوئی ہے، بلکہ مہتد اللہ کاکاخیل مرحوم کے مطابق حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب نے خود اپنے والد حضرت شیخ بہادر قدس سرہٗ کے مناقب میں ایک کتاب لکھی تھی۔ جس میں اپنی قومیت کا اظہار بھی کیا تھا لیکن بدقسمتی سے دوسری بہت سی کتابوں کی طرح وہ کتاب بھی آجکل ناپید ہے۔ لیکن جب اتنے دیانتدار لوگ عرصہ دراز سے پشت بہ پشت ان کا حوالہ دیتے ہوئے چلے آرہے ہیں تو ان کی شہادت پر ہم کیوں یقین نہ کریں۔ قاعدہ ہے۔ کہ اگر آپ نے چاند نہ دیکھا ہو، تو جن دوسرے لوگوں نے چاند دیکھا ہو، انکی شہادت تسلیم کرلینی چاہیئے۔ باقی رہے عقاب صاحب تو اگر کاکا صاحب کی سیادت کی بات مخزن افغانی میں بھی لکھی ہوتی تو وہ اس کتاب کو بھی جھوٹ کا پلندہ ہی کہتے۔ کیونکہ ان کے مدنظر تحقیق نہیں ایک خاص مقصد ہے۔ اور اس ضمن میں یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ جب عقاب صاحب حضرت رحمکار کاکا صاحب کی قومیت کی تصدیق کے لئے صرف اپنی تصدیق ضروری سمجھتے ہیں۔ تو پھر ان کے پاس اپنی قومیت یعنی خٹک ہونے کا کونسا ثبوت ہے؟ یعنی یہ بات کہاں سے ثابت ہوتی ہے کہ عقاب صاحب واقعی خٹک ہیں؟

اس سلسلے میں مزید کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ پھر بحث ذاتیات کے حدود میں داخل ہوجاتی ہے۔ البتہ اشارتاً اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ عقاب صاحب نے اپنے کتابچے کے صفحہ ۱۹ پر حضرت رحمکار کاکا صاحب کا جو شجرہ درج کیا ہے وہ بالکل جعلی ہے۔ اور اسکے جعلی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ خود عقاب صاحب نے اس کے ساتھ یہ نوٹ دیا ہوا ہے کہ مخزن افغانی، تاریخ مرصع

خورشید جہان میں" آپ کے بزرگوں کا شجرہ کچھ یوں دیا ہے"

ظاہر ہے یہ عبارت قارئین کو دھوکہ دینے کے لئے لکھی گئی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مخزن افغانی وغیرہ میں حضرت کاکا صاحبؒ کے شجرہ کا ذکر تک نہیں۔ عقاب صاحب کا ذاتی اور خاندانی شجرہ میرے پاس موجود ہے۔ اس شجرے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عقاب صاحب بنوں کے ایک مشہور و معروف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے دوسرے افراد اپنے علم و فضل، تمول اور سیاسی شعور و دانش کی بدولت نہ صرف معاشرے میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بلکہ ہر دور میں حکومتِ وقت کے دوائر میں بھی ان کو اثر و رسوخ واقتدار حاصل رہا ہے۔ چنانچہ ایسے مقبول و مشہور مرنجان مرنج خاندان میں عقاب صاحب کا وجود ایک حادثے سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے، کہ میں ان کا خاندانی شجرہ[1] یہاں نہیں لکھنا چاہتا۔ اور نہ اس کے بارے میں کچھ کہنا موزون سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز
ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کہ نیست

ذاتیات میں پڑنا میں منافی اخلاق سمجھتا ہوں۔ بہرحال میں حضرت کاکا صاحبؒ کی سیادت کے بارے میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ جو لوگ حقیقت سے انکار کرنے پر تل جاتے ہیں، ان کو کسی بھی دلیل سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت غوث الاعظم جناب عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی سیادت تو تمام اسلامی دنیا میں مسلّم ہے، اور غالباً ان کی سیادت پر عقاب صاحب کو بھی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن جو لوگ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنانے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ ہر ایک بات پر اعتراض کرتے ہیں۔ ؎

نیش عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

---

[1] یہ شجرہ میں نے [illegible] جہان [illegible]

تو جناب والا حضرت غوث الاعظم کی سیادت پر بھی اعتراضات کئے گئے ہیں۔ اور انکی تردید میں کئی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ دیکھئے مناقب ... (بحوالہ الانوار البیہا)۔

اسی طرح کسی فرد کے دو یا زیادہ شجروں میں ناموں میں کمی بیشی اور ناموں میں اختلاف بھی صرف حضرت کاکا صاحب کے شجرے سے مخصوص نہیں سینکڑوں ہزاروں بڑی بڑی شخصیتوں کے جتنے بھی مختلف شجرے ملتے ہیں، ان میں ناموں میں اختلاف اور افراد کی تعداد میں کمی بیشی موجود ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ تمام شجرے ایک ہی شخص اور ایک ہی وقت میں تو مرتب نہیں ہوتے۔ اس لئے مرور زمانہ کے ساتھ مختلف اوقات میں مختلف ناموں کے ذریعے نقل در نقل ہوجانے کی وجہ سے مختلف عوامل کے باعث ان میں اختلاف ضرور پیدا ہوجاتا ہے۔ میں اپنے دعوے کی تائید میں صرف دو شخصیتوں کا ذکر ... انکا حضرت سید آدم بنوری قدس سرہ کے ایک شجرے میں انکے اسلاف کی تعداد تیرہ اور دوسرے میں اٹھائیس ہے۔ اور ناموں میں بھی اختلاف ہے۔ اس بات سے تو جناب عقاب صاحب کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سچے رسول اور فرستادہ ہیں۔ ان کے ماننے والوں کی تعداد بھی اربوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں محققوں، دانشوروں قدیم و جدید زبانوں کے ماہرین کی بھی کمی نہیں۔ اور ہر قسم کے وسائل دولت پر پہلی قابض ہیں۔ اور اس دولت علم کی بدولت ہر قسم کے رازہائے سربستہ کھولنے کی مہارت بھی رکھتے ہیں۔ اب اس جلیل القدر پیغمبر کے شجرے میں بھی اختلاف ہے۔ اور اس سے میرے موقف کی تائید بخوبی ہوسکتی ہے۔

انجیل متی میں حصہ باب ۱ آیت ۱ سے آیت ۱۷ تک حضرت مسیح کا شجرہ سیالیس افراد پر مشتمل ہے۔ لیکن انجیل لوقا باب ۳ آیت ۲۳ تا ۳۸ پر اس شجرہ میں حضرت ابراہیم تک چھپن افراد کے نام ذکر کئے گئے ہیں۔ اور ناموں میں

بھی اختلاف ... لیکن اس اختلاف کے باوجود بھی آج تک کسی نے بھی حضرت مسیح کے شجرے ... بیان نہیں کیا ہے۔

اس سلسلے میں میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں، کہ جن لوگوں نے حضرت کاکا صاحب کے شجرے میں ان کے ایک جد اعلیٰ سید یسین اور قبیلہ خٹک کے شجرے میں "یسین خیل" کو ایک فرد سمجھا ہے۔ یا تو ان کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یا جان بوجھ کر ایسا سمجھا ہے۔ کیونکہ کسی بھی تاریخ میں نہ تو یسین خیل کی ذیلی شاخیں لکھی ہوئی ہیں۔ اور نہ کسی تاریخ میں یسین خیل کا بیٹا آدم اور آدم کا بیٹا غالب اور غالب کا بیٹا نادر وغیرہ کے نام موجود ہیں۔ اور یہ سب کچھ عقاب صاحب کے اپنے دماغ کی اُپج ہے۔ اور جب تک اس بارے میں کوئی ٹھوس تاریخی شہادت موجود نہ ہو محض ظن و قیاس کو تاریخی شہادت قرار دینا میرے نزدیک بڑی زیادتی ہے۔

اگرچہ مجمع البرکات پر عقاب صاحب نے بے جا اعتراضات کئے ہیں یہ ان کی ذاتی رائے ہے اور اسکی کوئی وقعت نہیں۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ جس کتاب پر عقاب صاحب کی مُہر تصدیق ثبت نہ ہوگی وہ جعلی اور ناقابل تسلیم ہوگی۔ یہ درست ہے کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق مجمع البرکات میں بھی رطب و یابس بہت زیادہ ہیں لیکن یہ ایک ایسی بات ہے کہ ع

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس قسم کے ڈھکوسلے اس زمانے کی تمام کتابوں میں موجود ہیں اور مخزن افغانی وغیرہ بھی اس سے خالی نہیں۔ میرے خیال میں مجمع البرکات میں تحقیقی رنگ زیادہ ہے۔ اس نے جو واقعہ بھی لکھا ہے اس کا ماخذ بھی لکھا ہے اور بہت سی کتابوں کے مطالعے کے بعد اپنی کتاب مرتب کی ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ اگر حضرت

رحمکار کاکا صاحب واقعی سید نہ ہوتے تو آخر مجمع البرکات کے مصنف کو کیا ضرورت
تھی کہ وہ جعلی طور پر حضرت کاکا صاحب کو سید لکھتے۔ پھر مجمع البرکات نے سلطان
صدرالدین، اخوند شرف بلخی اور اسی قسم کے دوسرے بزرگوں کے حوالے دئیے ہیں:
آخر ان سب بزرگوں نے حضرت رحمکار کو سید ہی لکھا ہے۔ اور مجمع البرکات سے پہلے
میاں شمس الدین مرحوم اور میاں محمد مبین مرحوم نے بھی کاکا صاحب کی قومیت
سید ہی لکھی ہے۔ آخر یہ تمام حضرت جو آج سے تقریباً دو سو سال قبل گزرے ہیں۔
اور بڑے عالم و فاضل و پرہیزگار بھی تھے۔ اُن کو اس بات کی کیا ضرورت تھی۔
کہ انہوں نے حضرت رحمکار کاکا صاحب کی قومیت کو تبدیل کر لیا ہوگا۔ کیونکہ جان بوجھکر
اپنے نسب کو تبدیل کرنے کی سزا تو دوزخ کی آگ میں جلنا ہے۔ پھر یہ بات بھی حد تواتر
تک مشہور ہے کہ شیخ یحیٰ المعروف حضرت حاجی صاحب اٹکؒ نے بھی اپنی کتاب
جامع المناقبین میں حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کو سید ہی لکھا ہے۔ اگر جامع المناقبین
اب نایاب ہے تو جن لوگوں نے اسکے حوالے دئیے ہیں وہ حوالے کیوں تسلیم نہ کئے جائیں
اسکے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اگر کاکا صاحب سید نہ ہوتے اور خٹک ہوتے
تو کیا خٹک ہونے میں ان کی کسر شان تھی۔ خٹک تو کوئی گھٹیا قوم نہیں بلکہ سیجے اور کھرے
پشتون ہیں نسلاً آرین ہیں اور قدیم تاریخ میں شاندار ماضی کے حامل ہیں۔ پھر وہ
کونسی دُنیوی یا اُخروی منفعت تھی جس کی خاطر مجمع البرکات یا دوسرے بزرگوں
یعنی حضرت سلطان صدرالدین، اخوند شرف بلخی اور خواجہ قلندر صاحب وغیرہم
نے آپ کی نسل تبدیل کر کے آپ کو خٹک کی بجائے سید لکھا ہے؟ اور میں یہ بھی کہونگا
کہ حضرت کاکا صاحبؒ کی اولاد میں بھی ہر دور میں بڑے بڑے متقی اور علوم دینیہ
کے فاضل گزرے ہیں۔ اور اب بھی ان میں نہ صرف علوم دینیہ کے بلکہ دوسرے مروجہ
علوم کے فاضل و دانشوروں کی کمی نہیں ہے۔ ان تمام فضلا اور دانشوروں نے ...

دور میں حضرت رحمکار کو سید کہا اور سمجھا ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے۔ کہ یہ سب حضرات اس بات کو مانتے اور جانتے ہیں کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب نسباً سید تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو آخر وہ کونسی ضرورت یا کشش تھی۔ جس کے لئے یہ تمام حضرات ایک جھوٹی بات کو سچ ثابت کرنے پر آمادہ ہوئے؟ بمصداق "صاحب البیت ادری بمافیہ"۔ یعنی گھر کا مالک جانتا ہے کہ اس کے گھر میں کیا ہے۔ چونکہ ان تمام حضرات کو حضرت رحمکار کاکا صاحب کی سیادت کا یقین ہے۔ اس لئے اس یقین کی بنا پر ان کو ہی کہتے اور سمجھتے ہیں، اور خود کو بھی ان کی اولاد ہونے کے ناطے سے سید کہتے اور سمجھتے ہیں۔ اور پھر حضرت کاکا صاحب کے نسب پر اعتراض کوئی انوکھی بات بھی نہیں۔ دوسرے بہت سے حضرات کے نسب پر بھی اعتراضات ہوئے ہیں اور کیئے جاتے ہیں۔

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ مخزن افغانی اور اسکی مقلد تاریخوں میں قبیلہ خٹک کے مبینہ مورث اعلیٰ "لقمان" کے ساتھ جو افسانہ وابستہ کیا گیا ہے اور جس کے نتیجے میں لقمان خٹک بن گیا ہے یہ ایک مذاق ہے، جو مغل امراء کی خوشنودی کی خاطر پشتونوں کے دوسرے متعدد مورثانِ اعلیٰ کے ساتھ بھی جائز رکھا گیا ہے۔ اسکی کوئی اہمیت واصلیت نہیں۔ اس بارے میں میرا موقف یہ ہے کہ "خٹک" ایک علاقائی اور جغرافیائی نام ہے۔ اور اس علاقے میں رہنے والے تمام لوگ خٹک ہیں۔ اس لئے اس لحاظ سے کاکا صاحب کا خاندان بھی علاقائی لحاظ سے خٹک ہے۔ نہ کہ نسل کے لحاظ سے۔ اس سلسلے میں میں اپنا موقف وضاحت کے ساتھ پیش کردونگا۔

چونکہ عقاب صاحب کے دعوے کی بنیاد تمام تر لفظ خٹک پر قائم ہے اس لئے سب سے پہلے ہمیں لفظ "خٹک" کی اصلیت معلوم کرنی چاہئے ہے۔ لہٰذا خٹک کا مطلب کیا ہے۔ کیا اس سے مراد قوم ہے، قبیلہ ہے، نسل ہے، مذہب ہے؟ آخر

لفظ خٹک کا مطلب کیا ہے؟ گویا معاملے کا تمام تر دارو مدار اس لفظ کے مفہوم متعین ہوجانے پر ہے۔ اور جب یہ مفہوم متعین ہو جائے۔ تو پھر:۔

"نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی"

جناب عقاب نے اپنے کتابچے میں اپنے ایک آنیوالی کتاب "خٹک" کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ بہت زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے۔ کہ ان کی کتاب خٹک اب تک آچکی ہوگی۔ مگر چونکہ میں نے نہیں دیکھی ہے۔ اس لئے میں نہیں جانتا کہ جناب عقاب نے خٹک کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اس لئے میں مجبور ہوں، کہ پہلے مخزن افغانی اور اس کی مقلد تاریخوں میں لفظ خٹک کی تلاش کروں۔ لیکن چونکہ خٹک اور کرلانڑ کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اور شجرہ نولیسوں کے مطابق پشتونوں کے بارہ تیرہ مقتدر قبائل کا مورث اعلیٰ ہے، جن میں خٹک بھی شامل ہیں۔ لہٰذا پہلے کرلانڑ کے بارے میں کچھ کہنا موزوں ہوگا۔ مگر اس وقت میرے پاس مخزن افغانی نہیں ہے۔ اسلئے کرلانڑ کی کہانی خورشید جہان کی زبانی سنیئے اور داد دیجئے۔

کرلانڑ بحوالہ خورشید جہان

"و بعض از طائفہ سفید ریشان سشینک می گویند کہ کرلانڑ فرزند کدام شہزادہ نام نامعلوم بود کہ از فرودگاہ لشکر کدام بادشاہ در زیر کڑاہی آہنی یافتہ شدہ بود و عبداللہ اورمڑ او را بہ بدل کڑاہی گرفتہ بود۔ لہٰذا موسوم بہ کڑان یا کرلانڑ ساخت۔ ازین بیان ہا واضح شد، کہ از اولاد قیس عبدالرشید پٹھان نیست۔ و نہ سید است۔ مگر حق تعالیٰ او را آن قدر در اولاد کثرت بخشید کہ عدد او از افاغنہ اصل کم نیست۔"

و مے گویند کہ عبداللہ اورمڑ بسبب نداشتن اولاد نرینہ او را متبنی کردہ بود

و بعد بہ رسیدن سن بلوغ او را بہ دختر خود [illegible] آن عفیفہ دو فرزند

یکے گگے و ددم کودے بوجود آمدند۔ قوم دلہ زاک، اورکزی، خوگیانی آفریدی شیتک، وزیری، خٹک، دوڑ، زدران واتمان خیلان" این ہمہ فرقہ ہائے کلاں از نسل کرلانڑ محسوب شدند۔

اس کہانی میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، جو کچھ کہا گیا ہے، اسکی تاریخی قدر و قیمت ایک بے بنیاد اور من گھڑت افسانے سے زیادہ نہیں ہے اور یہ سب کچھ مغل امراء کی خوشنودی کی خاطر کیا گیا تھا مگر مجھے تعجب اس بات پر ہے۔ کہ خورشید جہان کا محترم مؤلف بھی اس من گھڑت افسانے کو سچ مانکر مزے مزے سے اسے بیان کرتا ہے۔ بہر حال اس بیچ وقت ضائع کئے بغیر اب لقمان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

لقمان قبیلہ خٹک کا مبینہ مورثِ اعلیٰ

لقمان خٹک کیسے بنا؟ یہ تاریخ مرصع سے سنیئے:۔

"وائی چہ لقمان سرہ د خپلو وروڼرو (عثمان، اتمان، زدران) پہ شکار وتلی وو۔ پہ غونڈئ کښ دری خلور جونہ لہ ورایہ ولیدے۔ دوئ یخپلو کښے اُووے چہ یہ د دوئ بانلے ھسک اچیل پکار دی۔ مگر لقمان چہ یہ د دوئ کښے مشر وو پہ ھسک راضی نشو او وئے وئیل چہ اول بہ زۂ یوہ خوښہ کړم لیسے پہ نورو تاسو ھسک وُکاندئ۔ وروڼرو وئے اومنلہ۔ او دۂ یہ د غہ جلکو کښے لہ ورایہ یوہ مدسوطہ ښخہ خوښہ کړہ۔ لیکن چہ وئے لیدہ نو حسن ئے د لباس سرہ موافق نۂ وو ...... ھغہ نورے جینکی پہ نبالست کښے لہ دے نہ زیاتے وے۔ ھغوئ پرے ھسک واچاوہ او ھسک مطابق [illegible] یوہ ترلاسہ کړہ۔ [illegible] د لقمان پہ حال خبر شول [illegible] دۂ [illegible] چہ لقمان پہ [illegible]

یعنی د بنوئیدلو۔ خطا شو۔ اود دے ختک شو۔[له]

تو یہ ہے جناب لقمان کا خٹک ہونے کا واقعہ۔ اور یہ لطیفہ پہلے لطیفے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز اور بیہودہ ہے۔ اس قسم کے واقعات تو پشتون معاشرے میں اس آزادی کے زمانے میں بھی ممکن الوقوع نہیں ہیں۔ پھر آج سے صدہا سال پہلے اس قسم کے واقعات کا تو تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر پشتون معاشرے میں سوئمبر رچانے کا رواج کسی دور میں بھی نہیں رہا ہے۔ بالفرض اگر تھوڑی دیر کے لئے ان لطیفوں کو درست مان بھی لیا جائے، تب بھی ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کرلانڑ اور لقمان زیادہ سے زیادہ تیرھویں چودھویں صدی عیسوی کی شخصتیں ہونگی۔ اور اسکا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اس سے پہلے ان قبائل کا وجود ہی نہ تھا۔ حالانکہ یہ بات قطعی غلط ہے۔ یہ تمام قبائل کم وبیش تین ہزار سال پہلے سے موجود تھے۔ پھر اگر لقمان کا یہ مبینہ رومان درست مان بھی لیا جائے۔ یعنی یہ کہ ایک واقعے کے نتیجے میں لقمان خٹک بن گیا۔ پھر بھی یہ نالہ ذہن میں رہتا ہے جہاں کہ پہلے تھا۔ یعنی یہ نیا لفظ "خٹک" زیادہ سے زیادہ لقمان کا عرف ہوا۔ اور جب تک لقمان زندہ رہا وہ لقمان کے ساتھ خٹک بھی رہا۔ اور جب وہ فوت ہوا، تو اس کے ساتھ اس کا عرف بھی ختم ہوا۔ پھر اس کی اولاد کو قیامت تک خٹک کہنے کا کیا جواز ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہم اسے ایک تلمیحی لفظ کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جب ہم لفظِ خٹک دیکھتے یا لکھتے ہیں، تو ہمارا ذہن اس مبینہ واقعے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جسکے نتیجے میں لقمان خٹک بنا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

پھر لفظ خٹک کا مطلب کیا ہے؟ اس سلسلے میں میرا موقف اور نظریہ یہ ہے کہ لفظ خٹک ایک علاقائی نام ہے۔ اور علاقے کے طبعی ماحول کی مناسبت سے اس علاقے کے باسی اس نام سے مشہور ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ

[له] [illegible] ۱۲۵

علاقے کی طبعی ماحول نے یہاں کے باسیوں کی معاشرت میں چند خصوصیات بھی پیدا کی ہیں۔ اور یہ لفظ ان خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ سادہ الفاظ میں ہم اس مطلب کو اس طرح بھی ادا کر سکتے ہیں، کہ لفظ خٹک ایک طرف تو علاقائی رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ دوسری طرف اس علاقائی ماحول کے زیر اثر یہاں کے باسیوں کی ایک تہذیبی پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ میں اپنے اس موقف اور نظریے کی مزید تشریح میں حسب ذیل شواہد پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے میں لفظ خٹک کے لغوی معنی لکھتا ہوں۔

خٹک: (لغوی معنی) ا۔ سوسک۔ نام یک خزندہ است ۲۔ نام یک طائفۂ افغان (پشتو فارسی ص۴۱۹)

ب۔ خٹک: A Kind of beetle (ریورٹی ص۴۰۵)

ج۔ ": A Kind of black beetle (بیلو ص۶۳)

د۔ ": (دکونکٹ یو قسم۔ ایک قسم کا پردار کیڑا۔ گبریلا (ظفر اللغات)

جیسا کہ مندرجہ بالا وضاحت سے ظاہر ہے، لفظ "خٹک" کے ایک معنی گبریلا ہے گبریلے کی دو قسمیں ہیں، ایک چھوٹا ہوتا ہے، جسے پشتو میں "گونگٹ" کہا جاتا ہے جیسا کہ خوشحال خان خٹک مرحوم نے اپنے ایک شعر میں اسطرح استعمال کیا ہے ؎

نۂ به سبک [illegible] خپل [illegible] نام [illegible]
که بورا غوندے گونگټ په گل شي ناسته

دوسری قسم کو پشتو میں "سنڈا" کہتے ہیں (یعنی سانڈ)۔ یہ پہلے کی نسبت موٹا اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے ماتھے پر دو سینگ ہوتے ہیں۔ ان سینگوں اور اپنی ٹانگوں کی مدد سے اپنے لئے بل بناتا ہے۔ اس کی [illegible] اور [illegible]

[illegible] اردو ترجمہ [illegible]

...ہوتی ہے۔ اس کی ایک عادت یہ ہوتی ہے کہ بل بناتے وقت جو مٹی ... سے باہر لا کر ... سے اپنے بل کے اوپر ایک ڈھیر سا ... میں بنا دیتا ہے۔ چھوٹے بچے ایسے ڈھیروں کو دیکھ کر اسے "سنڈا" ... بل ہی سمجھتے ہیں اور اس میں پانی ڈال کر اسے باہر نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور پھر اسے پکڑ کر اور اسکی ٹانگ میں دھاگا ڈال کر کھیل ... رہتے جاتے ہیں۔

لفظ خٹک کے لغوی معنیٰ دکھانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ اس گبریلے (خٹک) کی فطرت میں بلندی یا ٹوپ سے رغبت ہے اور بلندی کے ساتھ اس فطری رغبت کی وجہ سے اس کا نام خٹک پڑ گیا ہے۔

۲۔ **خٹک قصبے کا نام:**۔ یہ لفظ قصبے کا نام بھی ہے جو ... کے حوالے سے ظاہر ہے۔

خٹک:۔ (بفتح خا و تا وسکون کاف عربی) ... آباد است۔ درمیان پشاور و اٹک مشتمل بر ہزار باب خانہ ... سکنہ آنجا افغان۔ و نام اٹک ... جا است۔ و ... است و بمعنی دامن صحرائے زیر دست است۔ و نام رودے بزرگ کہ اصل آں ... جانب کشمیر، پنجاب ... و از آنجا ... آب۔ و در آنجا ... اٹک نام یافتہ و ... دریائے ... (...)

اور ... کی عبارت میں جس قصبے کا ذکر ہے اس سے مراد موجودہ قصبہ اکوڑہ خٹک ... یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصبہ اکوڑہ خان سے پہلے بھی موجود تھا اور اس کا نام خٹک ... اکوڑہ ... اور جب شاہراہ کی حفاظت ... گیا ... آباد ...

اور اسے سرائے ملک پورہ کہا جانے لگا۔ بعد میں مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ ملک پورہ کا نام متروک ہوگیا۔ اور سرائے اکوڑہ یا اکوڑہ خٹک نام رہ گیا۔ اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قصبے کے لوگ اُس وقت افغان کہلائے جاتے تھے۔

۳۔ صوبہ سرحد کا جنوبی علاقہ قدیم زمانے میں "ستا یا ست گودیا" کے نام سے مشہور تھا۔ اور یہاں کے باشندے "ست گودے" کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ یہ لفظ دارائے اعظم کے کتبہ بہستون تھاتھا گوش" کے لفظ میں موجود ہے۔ اور یہ قدیم فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ یونانی مؤرخوں نے اپنے لہجے اور اپنی زبان میں "ستاگودیا" کے لفظ سے ضبط کیا ہے۔ "ستاگودیا" کا لفظ دارائے اعظم کے ممالک محروسہ کی فہرست میں "گندھارا اور اراکوزیا" کے ساتھ متصل ذکر ہے۔ اس لئے یہ پشتونخوا کا ہی ایک علاقہ ہے۔ روسی محقق یوری گنکوفسکی کے مطابق اس سے مراد درہ کرم اور درہ گومل کے درمیان کا علاقہ ہے۔ المانی محقق "مسٹر گریشمن" کے خیال میں یہ علاقہ گندھارا کے جنوب میں واقع ہے۔ بہرحال عمومی مضمون میں ہم اسے وہ علاقہ کہہ سکتے ہیں، جو ڈیرہ اسمٰعیل خان ڈویژن پر مشتمل ہے۔

ہم یہ ستاگودیا تو ہوا علاقہ اور ست گودئے ہوئے یہاں کے باشندے۔ اس لفظ کے دو جزو ہیں۔ ست بمعنی سو اور گودے بمعنی گائے۔ مجموعی لفظ کے معنے ہیں سو گایوں والے۔ یعنی زیادہ گائے پالنے والے۔ یہ علاقہ موجودہ زمانے میں بھی پرورش حیوانات کے لئے بہت موزون ہے۔ تو قدیم زمانے میں خواہ مخواہ اس سے بھی زیادہ موزون رہا ہوگا۔

۴۔۔ آریائی [illegible] میں (س) اور (ز) آپس میں تبدیل ہوتے ہیں جیسے [illegible]

۱۔ انگریزی [illegible] (Saisтaʀ) [illegible]

ب ۔ سنسکرت لفظ سُسر۔ فارسی خُسر، پشتو سخر

ج ۔ " " ساس۔ " خوشدامن۔ " خواښې (خواخې)

اب مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ "ست گودے" "خت گودے" میں تبدیل ہوا۔

۶ ۔ روایات کے مطابق خٹک لوگ قدیم زمانے میں کوہ شوال کے دامن میں وزیریوں کے ساتھ اکٹھے رہتے تھے۔ اُس وقت ان لوگوں کا نام ست گودے تھا۔ بعد میں ان لوگوں نے وہاں سے نقل مکانی اختیار کی۔ اور ان کا نام بھی تبدیل ہوگیا۔ یعنی ست گودے کی بجائے "خت گودے" ہوا۔

۷ ۔ پشتو زبان میں ایک لفظ ہے "خٹ" جس کے معنے ہیں پشتہ، ٹیلہ چٹان وغیرہ۔

خٹ: Khatt (S.M) A hill a hillock a mound.
(Reverty. P. 405)

(Khat (S.M.) A hillock as Knoll) a mound
(Bellow P. 637)

لفظ "خٹ" سے مراد کم اونچی پہاڑی۔ پشتہ۔ ٹیلہ یا چٹان وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن دراصل "خٹ" ایسی چٹان کو کہتے ہیں۔ جس کا بالائی پرت تو سنگریزوں اور پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ لیکن اُسکے بعد اس میں خالص مٹی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ اور پتھروں اور سنگریزوں کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

۸ ۔ پشتو زبان میں لفظ خٹ کا اسم تصغیر "خٹکے" اور "خٹ گوٹے" بنتا ہے پشتو زبان میں لفظ "خٹکے" کے کئی معنی ہیں۔ مثلاً کم اونچی پہاڑی اور چٹان۔ انسانی کالبد۔ سرخ گوشت کا بڑا لوتھڑا۔ وغیرہ۔ (پشتو قاموس ج ا ص ۲۱۹)۔ مگر یہاں میرا مقصد پہلے معنی سے ہے۔ یعنی کم اونچی پہاڑی، چٹان، ٹیلہ وغیرہ۔ اور یہ معنے "خٹ گوٹی" پر بھی اطلاق ہوتے ہیں۔

۹ ۔ الفاظ ست گودے، خت گودے، خٹ گوٹے کے ساتھ ہم وزن

اور ہم آہنگ ہیں ۔ میرا موقف یہ ہے کہ لفظ خت گودے مرور زمانہ کے ساتھ اپنی اصلی شکل کھو کر علاقے کی طبعی مناسبت کی وجہ سے پشتو زبان میں خٹگوٹی میں تبدیل ہوا ۔

۱۰ ۔ اگر ہم علاقہ خٹک کی طبعی کیفیت کا جائزہ لیں ۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام علاقہ چھوٹی چھوٹی "خٹوں" یا چٹانوں، سیلابی گزرگاہوں (جسے پشتو میں خوڑ اور الگڈ ے کہتے ہیں) اور کہیں تنگ اور کہیں چوڑے اور وسیع ہیں ۔ اور گہری گھاٹیوں پر مشتمل ہے ۔ اور یہ تمام علاقہ اپنے طبعی ماحول کی وجہ سے ایک خاص منظر پیش کرتا ہے ۔

۱۱ ۔ اگر ہم علاقہ خٹک کے دیہات کا جائزہ لیں تو صاف نظر آتا ہے ۔ کہ اکثر دیہات "خٹوں" یعنی ٹیلوں اور چٹانوں پر آباد ہیں ۔ یہی وجہ ہے ، کہ ان دیہات میں آبنوشی کے لئے کنویں نہیں کھودے جا سکتے ۔ اور ان کی آبنوشی کا انحصار زیادہ پہاڑی چشموں پر ہے ، جو عموماً ہر ایک گاؤں کے نزدیک ہوتے ہیں ۔

۱۲ ۔ زمانہ زیر بحث کی اکثر کتابوں میں جا بجا ملکِ خٹک ، ملکِ بنگش ، ملکِ مروت ، ممالک یوسف زئی وغیرہ کی ترکیبیں نظر آتی ہیں ۔ ظاہر ہے ان ترکیبوں میں ملک سے مراد علاقہ ہے ۔ یعنی علاقہ خٹک ، علاقہ بنگش ، علاقہ مروت وغیرہ وغیرہ اور اس سے ان لوگوں کا ان علاقوں سے علاقائی تعلق ظاہر ہوتا ہے نہ کہ نسلی یا قومی ۔ مثلاً اس شعر میں ؂

پیښاور زما وطن دے ؛ پہ خټک کښې مسکن دے

یعنی پشاور میرا وطن ہے ۔ اور علاقہ خٹک میں رہائش رکھتا ہوں ۔

یہ بات بھی نمونہ ظاہر ہے کہ یوسف زئی پر قیاس کر کے ہم خٹک زئی ہی

کہہ سکتے۔ کیونکہ یوسف زئی کا مطلب یوسف کا بیٹا یا اسکی اولاد۔ لیکن خٹک زئی کا مطلب ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ خٹک کسی شخص کا نام نہیں ہے۔

۱۳۔ اگر ہم علاقہ خٹک کی طبعی کیفیت چند لفظوں میں بیان کرنا چاہیں، تو کچھ اس طرح کہینگے :۔

"ټول علاقه کنډے کودرے دے۔ چرته خټان دی او چرته کټان"۔ یعنی "تمام علاقہ گھاٹیوں سیلابی گزرگاہوں، نشیب و فراز، ٹیلوں اور چٹانوں پر مشتمل ہے"۔

۱۴۔ ان شواہد و وضاحتوں کی روشنی میں میرا موقف یہ ہے کہ اس علاقے کے رہنے والوں کا تاریخی قدیم نام "ست گودے" تھا جو بعد میں "خت گودے" ہوگیا۔ اور پھر جب یہ لوگ اس موجودہ علاقے میں آئے تو علاقے کی طبعی کیفیت کی بنا پر یہ لوگ "خٹ گوٹے اور خٹکے" مشہور ہوئے۔ اور پھر مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ عام استعمال میں "خٹگوٹے اور خٹکے"۔ لفظ خٹک میں تبدیل ہوگیا۔

۱۵۔ لفظ خٹک کے دو جزو ہیں۔ (۱) خٹ، بمعنی چٹان یا اونچی زمین اور (۲) ک۔ نسبتی، مجموعی لفظ کے معنے ہوئے خٹ یعنی چٹان سے منسوب یا چٹان اور اونچی زمین کے رہنے والے۔ ہائی لینڈر۔ مقصد یہ کہ علاقے کی طبعی مناسبت کی وجہ سے ان لوگوں کو خٹک کہا جانے لگا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ خٹک ایسا لفظ ہے۔ جو علاقائی رشتے کو ظاہر کرتا ہے، نہ کہ نسلیاتی رشتے کو۔

اب میں اس لفظ کے تہذیبی رشتے کے بارے میں بھی تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

جب کسی معاشرے میں کوئی خصوصیت نمایاں ہوجاتی ہے تو وہ اس

معاشرے کی تہذیب کہلاتی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں لفظ خٹک کے حوالے سے ان لوگوں کے چند تہذیبی پہلوؤں پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالوں گا۔ اس سلسلے میں پہلے لباس کو لیں گے۔

ا۔ یہاں کے لوگوں کا لباس یعنی کرتا پاجامہ دوسرے پشتون قبائل مثلاً یوسف زئی، مندڑ کے مقابلے میں تنگ اور چست ہوتا ہے اور یہ اس علاقے کی طبعی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ یہاں کی پہاڑیاں اور چٹانیں عموماً جھاڑ جھنکاڑ اور کانٹے دار جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکی رہتی ہیں۔ راستے تنگ، دشوار گذار اور ڈھلوان پگڈنڈیوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ اسلئے یہاں تنگ اور چست لباس زیادہ مفید ہوتا ہے۔ بخلاف یوسف زیوں کے کہ ان کا علاقہ نہایت فراخ، وسیع و عریض اور ہموار ہے۔ اس لیے ان کا لباس یعنی کرتا پاجامہ نہایت کھلا اور لمبا چوڑا ہوتا ہے۔ پاجامے کے پائنچے بہت کھلے اور کشادہ ہوتے ہیں۔ کرتہ بھی بہت لمبا چوڑا اور ایک خاص وضع کا ہوتا ہے۔ جسے خلکہ کہتے ہیں۔ اسکے علاوہ یوسف زئی مندڑ کے لوگ عموماً ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ پگڑی کا استعمال ان میں بہت کم ہے۔ جبکہ خٹک لوگ چھوٹے بڑے پگڑی باندھا کرتے ہیں۔ اور ان کے لباس کا ایک اہم جزو ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ خان خوشحال خان خٹک مرحوم نے دستار نامہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب کا پہلا شعر یہ ہے ؎

چہ دستار تړی هزار دی ⁂ د دستار سړی په شمار دی

(شعر میں پگڑی کی لاج رکھنے اور اس کے آداب و قواعد کی طرف بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے)

۲۔ اگرچہ موسیقی اور رقص ... تمام پشتون قبائل شغف رکھتے ہیں۔

لیکن قبیلۂ خٹک اس باب میں سر فہرست ہے۔ آلات سرود میں "نے (بانسری) اور ڈھول سے انکو والہانہ محبت ہے۔ اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ڈھول کے ساتھ ان کا قلبی تعلق اس مثال سے ظاہر ہے:۔

"ډول په صحرا وهلے شي او خټک ورله په کور کښې ګډېږي" یعنی ڈھول تو صحرا میں بجتا ہے اور خٹک (اُس کی آواز پر) گھر میں ناچتا رہتا ہے"۔ اور یہ علاقے کی طبعی کیفیت کا نتیجہ ہے۔

۳۔ اس طرح یہ لوگ اپنے علاقے کی طبعی کیفیت کی وجہ سے ضروریات زندگی کے حصول میں دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے اس ماحول نے ان کو محنتی، جفاکش، بردبار اور باہمت بنادیا ہے۔ اس لئے جب کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو اسے پورا کئے بنا دم نہیں لیتے۔ اپنی ہٹ پر اَڑنے والے اور اپنی آن پر مرمٹنے والے ہیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے:۔

"یا به اټک نه وی او یا به خټک"

۴۔ یہ علاقہ چونکہ نہایت دشوار گزار ہے۔ ذرائع مواصلات مفقود ہیں، اس لئے یہاں علم کی روشنی بہت کم پہنچی ہے۔ اور مروجہ معنوں میں یہاں کے لوگ ناخواندہ ہیں۔ لیکن علاقے کی طبعی خصوصیت کی وجہ سے ان لوگوں میں غور وخوض کا مادہ زیادہ ہے، کیونکہ ہر وقت ہر جگہ فضا پر سکون اور ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے کسی معاملے کے بارے میں سوچنے اور غور کرنے کے مناسب اور موزون حالات موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ حالات کا اندازہ لگانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے: د خټک ګمان د یقین نه کم نه وی۔

۵۔ جس طرح یہ لوگ ظاہری وضع قطع میں سادہ ہیں۔ اسی طرح باطن میں بھی صاف اور مخلص ہیں۔ دشمن کے پکے اور دوست کے سچے ہیں۔ مردانہ [illegible]

[illegible] د خټک ګمان یقین سے کم نہیں [illegible]

دلچسپی رکھتے ہیں۔ مشہورِ عالم خٹک ناچ ان کا محبوب ترین رقص ہے۔ یہ ایک نہایت کیف آگین اور مسحور کُن رقص ہوتا ہے۔ اور صرف ان لوگوں سے مخصوص ہے۔ اپنے ہم جوار لوگوں سے نیک سلوک اور رواداری ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ مذہب سے بھی خاص دلبستگی رکھتے ہیں۔ مصیبت کے وقت دوسروں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دوسروں کو تکالیف میں دیکھکر کڑھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ مثل مشہور ہے۔

"خټک سرے به نهٔ زړېد دکه پردی غمونه نهٔ کولے"[1]

عرض پشتون قبائل میں قبیلہ خٹک ایک مقتدر اور باوقار قبیلہ ہے۔

بحیثیت مجموعی ان کا علاقہ بنجر اور غیر آباد ہے۔ قابلِ کاشت زمین کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لوگوں کا معیارِ زندگی پست اور غربت عام ہے۔ ذرائع مواصلات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تعلیمی لحاظ سے بھی یہ علاقہ پسماندہ ہے۔ اندرون علاقہ عام لوگوں کا گزارہ گھاس اور سوختنی لکڑی کی فروخت پر ہے۔ اگرچہ بعض بعض مواضعات میں بعض لوگوں نے ٹھیکوں اور تجارتی کاروبار میں بڑی دولت کمائی ہے۔ اور ملک کے مقبول ترین لوگوں میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی غربت اور بے کاری عام ہے۔

یہ لوگ بھی دوسرے پشتونوں کی طرح فطری شائستگی کے حامل ہیں۔ اپنی ملی روایات کے سخت پابند ہیں۔ اپنی آن پر جان دینے والے ہیں۔ مہمان نوازی میں مشہور ہیں۔ اپنے وطن سے محبت بھی ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور عساکرِ پاکستان میں قبیلہ خٹک کے افراد کی تعداد بہت کافی اور نمایاں ہے۔

قبیلہ خٹک میں ریاست کی ابتداء

۱۵۸۵ء میں مرزا حکیم والیِ کابل فوت ہوا۔ چنانچہ اکبر نے اسکے مقبوضہ علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے

[illegible]

کی غرض سے ایک بڑی فوج اپنے ایک جرنیل مان سنگھ کی سرکردگی میں کابل روانہ کی اور اس کے بعد خود بھی ایک دوسری فوج کے ہمراہ کابل کی طرف چل پڑا۔ اور ۱۵۸۶ء میں اٹک آیا۔ یہاں اس کے پاس علاقہ پشاور کے گرد و نواح کے سفید پوشوں اور ملکوں کا ایک جرگہ آیا۔ اور اس سے درخواست کی کہ شاہراہ اعظم کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اکبر نے ان ملکوں کے مشورے پر قبیلہ خٹک کے ایک ملک اکوڑ خان المعروف بہ اکوڑ خان کو شاہراہ کی حفاظت کا کام سونپا، اور اس کے بدلے میں اسے سڑک پر محصول راہداری وصول کرنے کا حق دے دیا۔ اور اٹک سے نوشہرہ تک علاقہ اس کی جاگیر میں دیدیا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار اس قبیلہ کا ذکر ہونے لگا۔ اور اُس وقت سے اس قبیلے میں ریاست کی بنیاد پڑی۔ خان خوشحال خان خٹک نے اپنی ایک طویل نظم میں ان واقعات کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

زۀ خوشحال دشهباز خان يم — چه تورزن يم کان به کان
شهباز خان ديحيٰ خان وو — چه بل نۀ وو هسے ځوان
يحيٰ خان د اکوړ خان وو — چه په توره شو سلطان
هم ئے تيغ وو هم ئے ډيک وو — هم ئے خُلق هم ئے احسان
د اکبر بادشاه په دور — دے د دے اولس شو خان

ترجمہ:۔ میں خوشحال شہباز خان کا بیٹا ہوں۔ اور پشت بہ پشت تلوار کا دھنی ہوں۔ شہباز خان یحییٰ خان کا بیٹا تھا۔ جو جوانمردی میں ہمسر نہیں رکھتا تھا۔ یحییٰ خان اکوڑ خان کا بیٹا تھا۔ جو تلوار کے زور سے حاکم بنا۔ وہ بہادر بھی تھا اور سخی بھی۔ خوش خلق بھی اور احسان کرنے والا بھی۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں وہ اس قبیلہ اور علاقے کا سردار بنا۔

جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے، اکوڑ خان نہایت دلیر، سخی اور نڈر انسان تھا۔ اس کے زمانے میں قبیلہ خٹک اور یوسف زئی کے درمیان دشمنی پیدا ہوئی۔ چونکہ قبیلہ یوسف زئی اپنی افرادی طاقت کی کثرت کی وجہ سے بہت طاقتور تھا۔ اس لئے اکبر اسے زیر کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح مغل فوجوں اور قبیلہ یوسف زئی کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں مغل فوجوں کو بارہا سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اور قبیلہ یوسف زئی کو زیر نہ کر سکا۔ اسکے نتیجے میں۔ مغلوں اور یوسف زیوں کے درمیان بھی مخالفت پیدا ہوئی۔ اور یہ مخالفت شاہجہان کے زمانے تک جاری تھی۔ اکوڑ خان نے شاہراہ کی حفاظت کی غرض سے دریائے لنڈا (یا کابل) کے کنارے مصری بانڈہ کے مقابل اپنے لئے چند مکانات بنوائے جنہیں سرائے ملک پورہ کہا جاتا تھا۔ اکوڑ خان' نادر خان بولاق کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان کی قبر مست بابا کی خانقاہ میں ابھی تک موجود ہے۔

خلاصہ:۔ اگر ہم اس تمام بحث کا خلاصہ چند سطروں میں بیان کرنا چاہیں تو میں یہ کہوں گا، کہ:۔

۱۔ مخزن افغانی اور اس کے مقلد تاریخوں میں لفظ خٹک کی جو توجیہ بیان کی گئی ہے وہ غلط ہے۔ اس سے نہ تو علاقائی رشتہ ثابت ہوتا ہے۔ نہ نسلیاتی۔ بالفرض اگر اس کے درست ہونے پر اصرار بھی کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اسے ایک تلمیحی لفظ کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ صوبہ سرحد کے جنوبی علاقے کا نام قدیم زمانے میں ستاگودیا تھا۔ اور یہاں کے باشندے "ستگودے" کہلاتے تھے "ستگودے" "ختگودے" میں تبدیل ہو گیا

۳۔ علاقے کی طبعی مناسبت کی وجہ سے "خٹ گوٹے" اور "خٹکے" میں تبدیل ہوا۔ بعد میں کثرت استعمال کی وجہ سے یہ الفاظ خٹک میں تبدیل ہو گئے۔

۴۔ لفظ خٹک کے دو جز و ہیں۔ خٹ یعنی چٹان یا اونچی زمین۔ اور "ک" حرف نسبت ہے۔ مجموعی لفظ کے معنے ہوئے چٹانی یا اونچی زمین کا رہنے والا۔ یعنی ہائی لینڈر۔

۵۔ اس مفہوم کو ہم اس طرح بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔ کہ یہ لفظ جغرافیائی اور علاقائی رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔

۶۔ اس علاقے کی طبعی کیفیت اور ماحول نے اس علاقے کے باسیوں کی معاشرت میں چند خصوصیات بھی پیدا کی ہیں۔ یہ لفظ اسکی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

۷۔ نسلاً یہ لوگ آرین ہیں۔ ان کا قومی نام پشتون ہے۔ تاریخی نام ست گودے اور علاقائی نام خٹک ہے۔ اور پشتون قبائل کے جرگے میں یہ لوگ بطور قبیلہ اس علاقائی نام کی وجہ سے خٹک کے نام سے مشہور و متعارف ہیں۔

۸۔ میرے اس تجزیئے اور نظریئے کی رو سے اس علاقے میں جتنے بھی مختلف النسل طبقے آباد ہیں۔ ان سب کو علاقائی مناسبت کی وجہ سے خٹک کہا جاتا ہے۔ اور وہ سب خٹک ہیں۔

۹۔ میرے اس موقف کی تائید مخزن افغانی اور اس کے مقلد تاریخوں سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی اس علاقے میں بعض قبیلے مثلاً "جلوزئی" مغلکی اور منداوری وغیرہ شجرہ نویسوں کے مطابق خٹک نہیں ہیں۔ یعنی یہ قبیلے لقمان کی اولاد میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن اس علاقے میں رہنے اور یہی معاشرت اختیار کرنے کی وجہ سے وہ بھی خٹک سمجھے جاتے ہیں۔

۱۰۔ بس اگر اس نظریئے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے، تو اس کے ماننے میں کوئی الجھن نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ اس علاقے کی طبعی اور جغرافیائی کیفیت کی وجہ سے یہاں کے رہنے والوں کو ختک کہا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس مفہوم کو اس طرح بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ختک ایک ایسا لفظ ہے، جو علاقائی رشتے کو ظاہر کرتا ہے، نہ کہ نسلیاتی کو۔

اب میں ان حوالوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو جناب عقاب کے بقول مجمع البرکات سے قبل کے ہیں۔ اس سلسلے میں میں صرف دو حوالوں پر اختصار کی خاطر اکتفا کروں گا۔

یہ درست ہے کہ جناب فقیر جمیل بیگ صاحب نے اپنی کتاب میں حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"فقیرِ غنی شیخ رحمکار ختک"

لیکن جناب عقاب نے اپنی عادت کے مطابق اس جملے کو سیاق و سباق سے الگ کر کے لکھا ہے۔ جناب فقیر صاحب کا مدعا یہ ہے۔ کہ وہ اپنے مرشد کے اخلاق حمیدہ، ان کی زندگی، عادات و اطوار، خوارق و کرامات اور تصوف و سلوک میں ان کے مقامات و درجات کو زمانہ ماضی کے بڑے بڑے صوفیائے کرام مثلاً حضرت بایزید بسطامی، حضرت جنید بغدادی، حضرت بشر حافی وغیرہم سے تطبیق دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر کرتے ہیں، کہ میرے مرشد اپنے زمانے کے بایزید بسطامی ...... وغیرہ وغیرہ جیسے تھے۔ اب اگر فقیر صاحب اپنے مرشد کو صرف حضرت رحمکار کے لفظ سے یاد کریں تو بیرونی دنیا کے لوگ ان سے کیسے واقف ہوں گے۔ گزشتہ صفحات میں میں نے وضاحت سے یہ بات ثابت کی ہے۔ کہ ختک ایک علاقائی نام ہے نہ کہ نسلیاتی یا قبائلی

کے زمانے میں صوبہ سرحد اور اس سے ملحقہ قبائلی علاقے ولایت افاغنہ کے نام سے موسوم تھے اور مختلف قبیلے اپنے علاقائی ناموں سے مشہور تھے۔ مثلاً رزڑ، بنگش، خٹک وغیرہ۔ اسلئے حضرت فقیر صاحب نے حضرت کاکا صاحب کے ساتھ لفظ خٹک بطور علاقائی نام کے ذکر کیا ہے۔ میں اپنے اس موقف کی تائید میں صرف ایک مثال پیش کرونگا۔

حضرت سید جمال الدین افغانی بین الاقوامی شخصیت کے حامل تھے لیکن اگر ان کے نام کے ساتھ افغانی نہ لکھا جائے۔ تو صرف سید جمال الدین سے بیرونی دنیا میں ان کا تعارف کیسے ہو سکے گا۔ کیونکہ سید جمال الدین نام کے سینکڑوں افراد اور بھی ہو سکتے ہیں۔ جو سید بھی ہوں، اسی طرح اگر حضرت بایزید کے ساتھ بسطامی کا لفظ نہ لکھا جائے تو بایزید نام کے سینکڑوں افراد سے ان کا امتیاز کیسے ہو سکیگا۔ اس لئے جناب فقیر صاحب کے لفظ خٹک لکھنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ شیخ رحمکار علاقہ خٹک کا رہنے والا۔

اسی طرح حضرت شیخ رحمکار کا مکہ میں نماز پڑھنے اور ایک سائل کے جواب اپنے نام کے ساتھ لفظ "خٹک"[1] کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شیخ رحمکار علاقہ خٹک کا رہنے والا۔ اگر جناب عقاب کو حضرت رحمکار کاکا صاحب کے اس کرامت پر اعتراض ہو، تو اس قسم کے واقعات دوسرے اولیاء اللہ سے بھی سرزد ہو چکے ہیں۔ اور ان سے منسوب ہیں۔ میں صرف ایک مثال پیش کرونگا۔ حضرت معروف کرخی بغدادی کی بابت لکھا ہے، کہ ایک دن عصر کے وقت انکے ایک مرید نے ان کی ٹانگ پر ایک زخم دیکھا [illegible] سے پوچھا۔ حضرت! آپکی

---

[1] میاں شمس الدین مرحوم نے حضرت کاکا [illegible] الفاظ [illegible] طرح بیان کئے ہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]

ٹانگ پر یہ زخم تو کچھ دیر پہلے موجود نہ تھا۔ یہ زخم کیسے ہوا ہے؟ فرمایا کہ جس بات کا تمہاری ذات سے تعلق نہ ہو، اُس کے پوچھنے سے تم کو کیا فائدہ۔ مگر مرید مصر رہا۔ آخر انہوں نے اُسے کہا کہ آج عصر کے وقت میں حرم شریف میں نماز پڑھنے گیا۔ زمزم پر وضو کرنا چاہتا تھا۔ اچانک میرا پاؤں پھسل گیا۔ اور میری یہ ٹانگ زخمی ہو گئی۔ یہ بات سنکر اس مرید کی تسلّی ہو گئی۔

اب یہ واقعہ یا حضرت رحمکار کا حرم شریف میں نماز پڑھنے کا واقعہ چونکہ یقین اور عقیدے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا ماننا یا نہ ماننا ہر شخص کے اولیاء اللہ کے کرامات پر اعتقاد سے متعلق ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب کا اس شخص کو یہ جواب دینا کہ "میں شیخ رحمکار خٹک ہوں" تو آپ کے خیال میں ان کو کیا کہنا چاہیئے تھا۔ اگر حضرت رحمکار اپنے نام کے ساتھ اپنا علاقائی نام ظاہر نہ کرتے، تو سائل کیا مطلب لیتا۔ کہ شیخ رحمکار کون ہیں! کہاں کے رہنے والے ہیں؟ مگر لفظ خٹک نے وہ استعجاب اور مزید استفسار کی گنجائش ختم کر دی۔ چونکہ خٹک ایک علاقائی نام ہے۔ اس لئے انہوں نے بطور ایک علاقائی نام کے اپنے نام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جناب عقاب نے اپنے تمام حوالوں میں لفظ خٹک سے قومیت کا جو مفہوم لیا ہے، وہ قطعی غلط ہے۔ مزید وضاحت کی خاطر میں یہ کہونگا، کہ اس جملے میں حضرت رحمکار کی بجائے کوئی دوسرا نام مثلاً حاجی بہادر صاحب کوہاٹی کا نام لکھ لیں۔ یعنی اگر یہ واقعہ حضرت حاجی بہادر صاحب کوہاٹی سے منسوب ہوتا، تو وہ سائل کو کیا جواب دیتے۔ کیا وہ ایسا نہ کہتے کہ میں حاجی بہادر کوہاٹی ہوں۔ اور اگر وہ صرف حاجی بہادر کہہ دیتے۔ تو کیا اس سے سائل کی تشفی ہو جاتی۔ اور وہ پھر استفسار نہ کرتا۔ اور پھر یہ بھی سوچیں۔ کہ کوہاٹی کہنے سے حاجی بہادر صاحب نسلاً قوم کوہاٹی ہو جاتے

اور کیوں ؟

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ جس طرح لفظ "خٹک" نسلیاتی نام نہیں ۔ اس طرح لفظ سید بھی نسلیاتی نام نہیں۔ بلکہ اس سے صرف خاندانِ نبوت سے رشتہ ظاہر ہوتا ہے ۔ ویسے عرب میں یہ لفظ ہر معزز و محترم شخص کے لئے بلا قید مذہب و ملت استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس بارے میں میں صرف ایک مثال پیش کروں گا ۔

۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن کے منصوبہ آزادئ ہند کی وضاحت کے سلسلے میں قائداعظم مرحوم، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ لندن جاتے ہوئے کچھ وقت قاہرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مصر میں اس وقت وفد پارٹی کی حکومت تھی جو ہند کانگریس سے متاثر تھی۔ چنانچہ قاہرہ کے تمام بڑے بڑے اخباروں نے پنڈت نہرو کو السیّد جواہر لال نہرو کی بڑی بڑی سرخیوں کیساتھ خوش آمدید کہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ عرب میں لفظ السید عزت و احترام کے طور پر ہر ایک شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ بخلاف ہمارے ملک کے کہ یہاں اس سے ایک خاص طبقہ مدنظر ہوتا ہے ۔

حرفِ آخر:- اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے۔ جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کرکے تین اہم اصولی حقیقتیں [illegible]

۱۔ ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہے۔ ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نسل وجود میں آئی ہے۔ اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ وہ درحقیقت ایک ہی ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں، جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی ہیں۔ تخلیق کے اس سلسلے میں کسی جگہ بھی اونچ نیچ کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہونا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ روئے زمین پر تمام انسانوں کا تو ایک ہی خاندان تو ہو نہیں سکتا۔ اس طرح زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ روپ، خدوخال، زبانیں اور طرز بودوباش بھی لامحالہ مختلف ہو جاتے تھے لیکن اس فطری فرق و امتیاز کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا، کہ اسکی بنیاد پر اونچ نیچ، شریف و کمین، برتر و کہتر کے امتیازات قائم کئے جائیں۔ ایک نسل دوسری پر اپنی فضیلت جتلائے۔ اور ایک قوم دوسری پر اپنا تفوق ظاہر کرے۔ اور اس طرح انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے پر تفوق حاصل ہو۔ خالق تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف طبقوں اور گروہوں میں اس غرض سے تقسیم کیا تھا کہ تمدن اور باہمی تعارف کی فطری صورت یہی تھی، کہ اس طریقے سے ایک گروہ، قبیلے یا قوم کے افراد باہمی تعاون سے زندگی کے معاملات خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔

۳۔ تیسرے یہ کہ انسانوں کے درمیان فضیلت اور تفوق کی بنیاد اگر کوئی ہے، تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ ورنہ پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان یکساں ہیں۔ ان کا پیدا کرنے والا بھی ایک ہے۔ اور ان کا مادہ پیدائش اور طریق پیدائش بھی ایک ہے۔ اور ان سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا

ہے۔ اس کے علاوہ کسی خاص ملک، برادری، خاندان یا طبقے میں پیدا ہو جانا ایک اتفاقی امر ہے۔ جس میں اپنے ارادے، انتخاب اور اسکی اپنی سعی و کوشش کا کوئی دخل ہی نہیں۔ اسلئے کسی کو کسی پر فضیلت کی کوئی معقول وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اصل چیز جو ذریعہ فضیلت بن سکتی ہے وہ یہ ہے، کہ وہ دوسروں سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہو۔ برائیوں سے بچنے والا اور نیکی اور پاکیزگی کے راستے پر چلنے والا ہو۔ ایسا شخص خواہ کسی بھی قوم یا قبیلے یا ملک سے تعلق رکھتا ہو۔ اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے قابل قدر ہے۔ اور اللہ کے نزدیک بھی اس کا درجہ افضل و اعلیٰ ہوتا ہے۔ اور جس کا حال اسکے برعکس ہو وہ کمتر درجے کا ہے، خواہ کسی بھی قوم، نسل اور ملک سے تعلق رکھتا ہو۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس حقیقت کو اپنے مختلف خطبات میں ارشاد فرمایا ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

"شکر ہے اُس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبر دور کر دیا۔ لوگو! تمام انسان بس دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار جو اللہ کی نگاہ میں قابلِ عزت ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنایا گیا تھا۔"

حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

"لوگو! آگاہ رہو، تم سب کا خدا ایک ہے، کسی عرب کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عرب پر اور نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔ مگر تقویٰ کے لحاظ سے اللہ کے نزدیک سب سے

زیادہ معزز ہے۔ یعنی جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ میں نے تمہیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ پھر فرمایا تو اچھا جو یہاں موجود ہے وہ اُن لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

۳۔ قرآن حکیم کی رو سے تخلیق جن و انس کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔

۴۔ گذشتہ صفحات میں حضرت کاکا صاحب قدس اللہ سرہٗ کی عبودیت کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ رحمکار کو جو مقام بلند عطا فرمایا ہے۔ اس کا باعث اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور بندگی ہے، نہ کہ اُن کا حسب و نسب۔ بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ خٹک یا سید ہونے کی وجہ سے ان کے مجد و شرف میں کمی بیشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵۔ اگرچہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب خود کو صرف اور صرف عبداللہ (بندۂ خدا) کہتے تھے۔ وہ بندۂ عشق تھے۔ اور بندہ عشق حسب و نسب کے جھمیلوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ کسی نسل سے تو ضرور تعلق رکھتے تھے۔ اور اس کا تعین ہونا چاہیئے۔

۶۔ گزشتہ صفحات میں سرفراز خان عقاب کے اعتراضات کے بارے میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ اسکی روشنی میں مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں، کہ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ نسباً سید ہیں۔ البتہ علاقائی لحاظ سے ان کو خٹک کہہ سکتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے حضرت کاکا صاحب کے شجرے میں ایک جدِ اعلیٰ شیخ لیسین صاحب اور قبیلہ خٹک کے شجرے میں "لیسین نیازی"

خٹک کو ایک سمجھا ہے۔ یا تو ان کو غلط فہمی ہوئی ہے، یا جان بوجھکر حقیقت سے سے چشم پوشی کی ہے۔ کیونکہ جب تک اس بارے میں کوئی ٹھوس تاریخی شہادت موجود نہ ہو، محض ظن و قیاس کو تاریخی شہادت قرار دینا میرے نزدیک بڑی زیادتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی تاریخ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ لیسین خیل خٹک کا کوئی بیٹا آدم اور اس کا بیٹا غالب اور اسکا بیٹا مست تھا۔

۷۔ لیسین خیل خٹک کی بہت سی ذیلی شاخیں ہیں۔ مگر آج تک کسی بھی ذیلی شاخ نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے۔ کہ حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کے اسلاف ہمارے ہم قبیلہ اور ہم جد تھے۔

۸۔ اسی طرح لیسین خیل خٹک کی تمام ذیلی شاخیں اپنی جدی اور موروثی جائداد کی مالک ہیں لیکن کاکاخیل لیسین خیل کے علاقے میں رہتے ہوئے لیسین خیلوں کی مشترکہ جدی جائداد میں ایک انچ زمین کے بھی مالک نہیں ہیں۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کاکاخیل لیسین خیلوں کے ہم جد اور ہم قبیلہ نہیں ہیں۔

۹۔ اگر پیر سباک صاحب یا اخون پنجو صاحب یا حاجی بہادر صاحب کے مریدوں اور معتقدوں نے حضرت شیخ رحمکار کو خٹک لکھا ہے۔ اور پھر ایک نے ان کو اپنے اپنے مرشدوں کا مرید اور فیض یافتہ ظاہر کیا ہے۔ اس کا باعث محض یہ ہے، کہ وہ حضرت رحمکار کاکا صاحبؒ کی مقبولیت اور بلندی مقام کے باعث اپنے اپنے مرشدوں کا نام زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ورنہ ان کی تمام تحریریں محض جعلی اور خود ساختہ ہیں۔ اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور پھر ان کے پاس اپنے اپنے مرشدوں کی سیادت کے بارے میں کونسا مصدقہ ثبوت ہے؟

۱۰۔ اگرچہ مجمع البرکات پیر عثاب صاحب نے ناجائز اور بے جا اعتراضات

کئے ہیں۔ یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ اسکی کوئی وقعت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں، کہ جس کتاب پر عقاب صاحب کی مہر تصدیق ثبت نہ ہوگی وہ جعلی ہوگی۔

۱۱۔ مجمع البرکات اور دوسری کتابوں میں نمایاں فرق یہ ہے، کہ یہ کتاب حضرت رحمکار کاکا صاحب کے سوانح پر مشتمل ہے۔ جبکہ دوسری کتابوں میں حضرت رحمکار اور ان کے اجداد کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے۔ اگرچہ زمانے کے دستور اور رواج کے مطابق مجمع البرکات میں بھی کہیں کہیں رطب و یابس موجود ہیں۔ پھر بھی مخزن افغانی جیسی کتابوں کے مقابلے میں اس میں تحقیقی رنگ زیادہ ہے۔ اس نے جو واقعہ بھی لکھا ہے اس کا مأخذ اور حوالہ دیا ہے۔ اور حتی الامکان بہت سی کتابوں کے مطالعے کے بعد اپنی کتاب مرتب کی ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر حضرت رحمکار کاکا صاحب واقعی نسباً سید نہ ہوتے، تو آخر مجمع البرکات کے مصنف کو کیا ضرورت تھی کہ وہ جعلی طور پر ان کو سیّد لکھتے۔ اور پھر جن کتابوں کے اس نے حوالے دیئے ہیں۔ ان میں ان کو سید کیوں لکھا جاتا۔ آخر ان حضرات کو اس کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔ کہ وہ حضرت رحمکار کاکا صاحب کا نسب تبدیل کرتے؟ کیونکہ خٹک تو کوئی گھٹیا قوم نہیں۔ تمام خٹک سچے اور کھرے پشتون ہیں نسلاً آرین ہیں اور قدیم تاریخ میں شاندار مقام کے حامل ہیں۔ پھر وہ کونسی دنیوی یا اخروی منفعت تھی جس کی خاطر مجمع البرکات کے مؤلف نے حضرت رحمکار کی نسل خٹک سے تبدیل کرنے کی ذمہ داری اُٹھائی۔ اگر وہ سید نہ ہوتے اور خٹک ہوتے تو کیا خٹک ہونے میں ان کی کسر شان تھی؟۔

۱۲۔ حضرت رحمکار کی اولاد میں ہر دور میں علوم دینیہ کے جید عالم [illegible]

ہیں۔ اور موجودہ دور میں بھی ان میں نہ صرف علومِ دینیہ کے جیّد عالم بلکہ جدید علوم و فنون کے فضلاء اور دانشور بھی موجود ہیں۔ اور یہ سب حضرات ان کو سید سمجھتے اور کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ سب حضرات اس بات کو مانتے اور جانتے ہیں۔ کہ حضرت رحمکار کاکا صاحب نسباً سید ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آخر وہ کونسی ضرورت یا کشش تھی جس کی خاطر یہ تمام حضرات ایک جھوٹی بات کو سچ ثابت کرنے پر آمادہ ہوئے؟

چونکہ ان کو حضرت رحمکار کاکا صاحب کی سیادت کا یقین ہے، اس لئے اس یقین کی بناپر انکو بھی سید سمجھتے اور کہتے ہیں۔ اور خود کو بھی ان کی اولاد ہونے کی وجہ سے سید کہتے اور سمجھتے ہیں۔

اور اس کے علاوہ حقیقی علم اللہ کے پاس ہے۔ اور وہ سب سے زیادہ اور بہتر جاننے والا ہے۔

آخر میں یہی کہوں گا ؎

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ کے زمانے کے
سیاسی حالات

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ ۹۸۳ھ ۱۵۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یعنی شہنشاہ اکبر اعظم کی تخت نشینی کا بیسواں سال تھا۔ ان دنوں میں حضرت شیخ رحمکارؒ کے والد ماجد قطب عالم حضرت شیخ بہادر خان (ایک بابا) ۔۔۔ مسند رشد و ہدایت پر متمکن تھے۔ حضرت قطب عالم نے ۱۰۲۷ھ میں رحلت فرمائی۔ اس کے بعد حضرت شیخ جی صاحب اپنے والد گرامی کے جانشین ہوئے ۔۔۔ طرح گویا حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحب قدس سرہ کی رشد و ہدایت ۔۔۔ جہانگیر کے عہد سلطنت کے آخری دس اور شاہجہان کے عہد حکومت کے چھبیس یعنی کل چھتیس سالوں پر محیط ہے۔

ہمایوں کی وصیت کے مطابق دریائے سندھ سے مغرب کی طرف ولایت افاغنہ (صوبہ سرحد) اور کابل، غزنی وغیرہ کے علاقے مرزا حکیم کی حکومت میں شامل تھے۔ جو اکبر کا سوتیلا بھائی اور ہمایوں کی وفات کے وقت تین سال کا بچہ تھا۔ مگر اب وہ جوان ہو گیا تھا۔ اور عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ ان دنوں میں حالات میں اچانک تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس تبدیلی کی ایک وجہ تو خود اکبر کی مذہبی پالیسی تھی۔ جس کی وجہ سے راسخ العقیدہ مسلمان امراء، حق پرست علماء اور عوام متنفر تھے۔ دوسری وجہ مرزا حلیم کی نوجوانی کے نوخیز تمنائیں تھیں جو ان دنوں عروج پر تھیں۔ مگر اس تبدیلی کا ایک بڑا عامل ولایتِ افاغنہ (صوبہ سرحد) میں ایک نئی مذہبی تحریک کا آغاز تھا۔ جس کو تحریک روشنیہ بھی کہتے تھے۔ اس تحریک کی بنیاد مرزا کامران کے زمانے میں ۔۔۔ مرزا حکیم کے زمانے میں اس نے بڑے بڑے

نکالے۔ اور مرزا حکیم کی وفات کے بعد جب اکبر نے ولایتِ افاغنہ اور صوبہ جات کابل کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ تو اس وقت یہ تحریک ایک ایسی ناقابلِ تسخیر قوت میں تبدیل ہو چکی تھی جس نے اکبر اعظم اور اس کے جانشینوں جہانگیر اور شاہجہان کو کم و بیش پچاس سال تک باوجود جاہ و جلال بے دست و پا کیئے رکھا۔

چونکہ اس تحریک کا براہ راست تعلق پشتون قبائل سے تھا۔ اور ان قبائل پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اس لئے اس تحریک کے بارے میں نہایت اختصار کے ساتھ کچھ لکھنا غیر موزون نہ ہوگا۔

تحریک روشنیہ کے بانی کا مختصر حال

تحریک روشنیہ کے بانی "بایزید انصاری" کے باپ کا نام قاضی عبداللہ تھا۔ جو کانی گرم (وزیرستان) کا باشندہ تھا۔ مگر اس کے خاندان کا ایک حصہ ہندوستان کے شہر جالندھر میں بھی مقیم تھا۔ اور عبداللہ نے وہاں بھی ایک شادی کی تھی۔ اور اس کے اس ہندوستانی بیوی سے بایزید ۳۲-۹۳۱ھ میں پیدا ہوا۔

جب پانی پت کی پہلی لڑائی کے نتیجے میں سلطنت ہندلیشتونوں سے بابر مغل کو منتقل ہوئی، تو ان دنوں میں یعنی ۹۳۷ھ کے لگ بھگ جبکہ بایزید پانچ چھ سال کا بچہ تھا۔ اپنے ایک چچا اور والدہ کی معیت میں جالندھر سے کانی گرم چلا گیا۔ اب کانی عبداللہ کے گھر میں دو بیویوں کی موجودگی سے ان بن ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بایزید کی والدہ اپنی سوکن کے سلوک سے تنگ آگئی اور تین سال بعد جبکہ راستے کسی قدر پرامن ہو گئے۔ اپنے میکے واپس چلی گئی۔ ... کے مطابق بایزید اپنے باپ کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوا۔

بایزید نے ابتدائی تعلیم مقامی طور پر حاصل کی۔ مگر وہ نہایت زیرک، فہیم اور حساس تھا۔ اسے تحصیل علوم کی شدید خواہش تھی۔ مگر اسے جلد ہی احساس ہو گیا، کہ سوتیلی ماں کی وجہ سے وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ اس نے باپ سے حصول علم اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے لئے بیرون ملک جانے کی اجازت مانگی، جو نہ دی گئی۔ اس سے باپ بیٹے کے تعلقات ناخوشگوار ہوئے۔

ان دنوں میں وزیرستان میں پیری مریدی کا بہت رواج تھا۔ بایزید نے اپنی علمی بے مائیگی کی تلافی کیلئے یہ طریقہ سوچا کہ اسے کسی پیر سے بیعت کر لینی چاہیئے۔ اور روحانیت میں ترقی کر لینی چاہیئے۔ اس لئے اس نے اپنے ایک چچا خواجہ اسمٰعیل سے بیعت کی۔ اور اپنے پیر کی ہدایت پر چلہ کشی شروع کی۔ اور سخت ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔ پیرِ کامل کی تلاش میں کئی سفر کئے۔ آخر کئی سالوں کے مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اب وہ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا ہے۔ اس بارے میں اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

"از حضرت عزت ندا رسید کہ یا بایزید! اگر طالب صادق پیش تو آید و طلب این حال براستی از تو کند اورا ازین حال آگاہ کن، تا از یک چراغ چراغہائے بسیار روشن شود۔ و نور در تزاید گردد"۔

اب چونکہ بایزید کامل ہو چکا تھا، وہ اپنے آپ کو "بایزید مسکین" کہنے لگا۔ اور لوگوں کو مرید بنانا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اس کا حلقہ ارادت وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے مخالفت کا خطرہ [illegible]

بائسند خان کے بیٹے محمد علی خان کے حوالہ نکاح میں دیدیا۔ اپنے دو بیٹوں شیخ عمر اور کمال الدین کی شادیاں دوسرے خوانین کی بیٹیوں سے کرا دیں خود بھی "دنی" نام کی ایک عورت سے شادی رچائی۔

اب بایزید کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ پشتونوں کے اکثر قبائل سوائے قبیلۂ یوسف زئی اور قبیلہ خٹک اس کے حلقہ ارادت میں شامل ہو چکے تھے۔ اور قبائل کے خوانین اس کی پشت پر تھے۔ اب اس نے اطراف وجوانب میں اپنے داعی بھیجے۔ اور تمام سرکردہ افراد، امراء، علماء، صوفیاء اور حکام کو اپنے مسلک میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس قسم کا ایک دعوت نامہ حضرت سید علی ترمذی (پیر بابا) کو بھی پہنچا۔ اور بقول اخوند درویزہؒ انہوں نے فرمایا کہ "پشتونوں پر یہ ایک بڑی آفت نازل ہوئی ہے۔ اس کا دفع کرنا مشکل ہوگا۔ کیونکہ یہاں اسلام کا بادشاہ نہیں ہے"۔

اس کے بعد اخوند درویزہ نے بایزید کے ساتھ کئی مناظرے کئے۔

بایزید کی یقینی تاریخ وفات معلوم نہیں ہے۔ البتہ بعض قرائن کی بنا پر اسکی تاریخ وفات سنہ ۹۸۶-۸۷ھ سمجھی جاتی ہے۔

بایزید کے بعد اُس کا بڑا بیٹا شیخ عمر اس کا جانشین ہُوا۔ شیخ عمر اور قبیلہ یوسف زئی کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں۔ مگر ایک لڑائی میں یوسف زیوں کے ہاتھوں شیخ عمر اور اس کے پیروکاروں کو سخت شکست ملی۔ اس لڑائی میں شیخ عمر اور اس کے دو بھائی ہلاک ہوئے۔ اور تحریک کے بہت سے پیروکار قتل ہوئے۔ اور باقی سب تتر بتر ہو کر بھاگ گئے۔ بایزید کا ایک نوعمر بیٹا جلال الدین یوسف زیوں کے بعض افراد کے ہاں قید ہُوا۔ انہوں نے اُسے نوعمری کی وجہ سے قتل نہ کیا۔ بلکہ اپنے پاس نظر بند رکھا۔ ان دنوں یعنی

اس کے علاوہ بایزید اپنے پیروکاروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو شرک کی نجاست سے آلودہ سمجھتا تھا۔ اس لیئے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ حصول مقصد کے لیئے ایک نیا میدان تلاش کرے۔

چنانچہ اس نے پہلے اپنا ایک خلیفہ بنگش، اورک زئی اور تیراہ کی طرف بھیجا۔ اور پھر خود بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ خلاف توقع ان علاقوں میں اسکی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اور ان علاقوں کے لوگ جوق در جوق اس کے مرید ہونے لگے۔ ان علاقوں پر اپنا روحانی اقتدار قائم کرنے کے بعد وہ پشاور کی طرف چل پڑا۔ اور علاقہ سہند میں ایک بڑے خان ملک شانی کے ہاں مقیم ہوا۔ یہاں بھی لوگ اسکے مرید ہونے لگے۔ لیکن یہاں بھی اسکی مخالفت شروع ہوئی۔ ان دنوں میں مرزا حکیم والی کابل کی طرف سے جانس خان نام کا ایک حاکم تھا۔ چند ملکوں اور پیروں نے بایزید کے خلاف اسے بارہ ہزار روپے کی رشوت پیش کی۔ اور درخواست کی کہ بایزید کو مذہبی الحاد کے جرم میں قتل کر ڈالے۔ مگر جانس خان اسکے لئے تیار نہ ہُوا۔

اب بایزید کے مخالفین نے مرزا حکیم کے پاس بایزید کی شکایت کی اور مرزا حکیم نے اسے بحث مباحثہ کے لئے کابل بلایا۔ چنانچہ بایزید اپنے چند عالم پیروکاروں کی معیت میں کابل گیا۔ مرزا حکیم نے اسے خان قاضی کے پاس بھیجا خان قاضی اور بایزید کے درمیان ملاقات ہوئی۔ بحث و مباحثہ کے بعد خان قاضی نے اسے تمام الزامات سے بری قرار دیا۔ اور بایزید سرخرو ہو کر کابل سے واپس آیا۔ لیکن اب وہ ہوا کا رخ دیکھ چکا تھا۔ اس لئے یہاں سے قبیلہ محمد زئی کے پاس ہشت نگر چلا گیا۔ یہاں سے اُس نے یہاں کے سرکردہ خوانین سے تعلقات قائم کئے۔ اپنی بیٹی کمال خاتون کو یہاں کے ایک بڑے خان

(۱۵۸۱ء) میں اکبر کابل جانے کے لیئے اٹک کے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ چنانچہ بایزید کے چند مرید فریادی بنکر اکبر کے پاس گئے۔ اور کہا کہ یوسف زیوں نے اُن کے پیرزادے کو قید کر رکھا ہے۔ اسے چھڑایا جائے۔ چنانچہ اکبر نے جلال الدین کو یوسف زیوں کی قید سے چھڑا لیا۔ اور اسے اپنے پاس دربار میں رکھا۔ مگر جلال الدین اپنے مریدوں کی مدد سے اکبر کے دربار سے بھاگ کر تیراہ چلا گیا۔ اور چند سال کے بعد ہی نوجوان جلال الدین اکبر اعظم کی فوجوں کے لیئے وبال جان بن گیا۔ ۱۵۸۶ء سے ۱۵۹۹ء تک جلال الدین مغل فوج کے لیئے ایک ہوّا بن گیا تھا۔ مگر اس سال (۱۵۹۹ء) میں اس نے جب غزنی پر حملہ کیا۔ تو ایک اتفاقی گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا۔ اور مر گیا۔ اور اس طرح مغل ایک ناقابل تسخیر دشمن سے نجات پا گئے۔ اس کے چند سال بعد یعنی ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں اکبر اعظم بھی فوت ہوا۔

لیکن جلال الدین کے مارے جانے کے نتیجے میں تحریک روشنیہ کی شدت و حدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ یہ تحریک جہانگیر کے تمام عہد حکومت اور شاہجہان کے تخت نشینی کے بعد چند سال تک پورے جوش و خروش سے جاری تھی۔ لیکن ۱۶۳۰ء میں عبدالقادر قائد تحریک روشنیہ نے مغلوں کے ساتھ مصالحت کی۔ اور اس طرح یہ تحریک عملاً ختم ہوئی۔

روشنائیوں کا سیاسی موقف

بایزید انصاری کی تعلیمات اور سیاسی موقف کو بالتفصیل بیان کرنے کی اس مختصر کتاب میں نہ گنجائش ہے اور نہ یہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ البتہ اس مضمون کی تکمیل کے طور پر میں اسکی تعلیمات اور سیاسی موقف کا ایک مختصر خلاصہ انتہائی شکریے کے ساتھ یہاں پیش کرنے پر اکتفا

کرتا ہوں جو ممتاز دانشور اور مشہور و معروف محقق جناب محترم قاضی عبدالقدوس قاسمی سابق سربراہ شعبہ اسلامیات پشاور یونیورسٹی نے بایزید انصاری کی کتاب "خیر البیان" کے مقدمے میں دیا ہے۔

محترم قاسمی صاحب لکھتے ہیں۔ بایزید انصاری نے مذہب کے نام پر جو تحریک شروع کی تھی۔ اس کے اخلاف کے زمانے میں اس نے سیاسی شکل اختیار کی۔ اکثر پشتون قبائل (افریدی، بنگش، اورک زئی، خلیل، مہمند) اس کے مرید ہوگئے تھے۔ اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے تیار تھے۔ چنانچہ ان پشتونوں کی جان نثاری اور تعاون کی بدولت ساٹھ ستر سال تک بایزید کے اخلاف نے مغل شہنشاہیت کو بے دست و پا کئے رکھا۔

مغلوں سے پہلے مغرب کی طرف سے ہندوستان پر جتنے حملے ہوئے تھے۔ وہ اسلام کے نام پر ہوئے تھے۔ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری پشتونوں سے اپنی افواج مرتب کرکے کافروں سے لڑتے تھے، مگر مغل پہلے مسلمان تھے جنہوں نے پہلے تو مسلمان پشتونوں سے بزور شمشیر سلطنت چھین لی اور پھر اُن کے آبائی وطن میں بھی ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنوائے۔

بایزید انصاری نے یہ بات محسوس کرلی ہوگی۔ کہ پشتونوں کے ساتھ مغلوں کا رویہ نہایت اہانت آمیز ہے۔ بایزید نے خود اپنی آنکھوں سے وہ تمام علاقے دیکھے تھے، جہاں بابر نے پشتونوں کی کھوپڑیوں سے مینار بنوائے تھے۔ تو یہ بات قرین عقل ہے کہ بایزید نے اپنے مریدوں کو اس کے لئے تیار کرلیا ہوگا۔ کہ ایک نہ ایک دن مغلوں سے لڑنا ہوگا۔

لیکن بایزید یہ لڑائی قومی بنیادوں پر نہیں لڑتا تھا۔ بلکہ اس کے جواز میں ایک بڑا بہانہ یہ تھا، کہ وہ اپنی جماعت کو موحّدین کی جماعت سمجھتا تھا۔ اور اپنی جماعت کے سوا باقی لوگوں کو شرک کی نجاست سے آلودہ جانتا تھا۔ چنانچہ وہ برملا کہتا کہ موحدین کو حق حاصل ہے کہ وہ ایسے لوگوں (مشرکوں) سے لڑیں۔

چونکہ بایزید کی تحریک میں پیر خدا کا نائب ہوتا تھا۔ اور جو کچھ بھی ہوتا تھا۔ اس کے حکم پر ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اپنی حکمت عملی سے اپنی تحریک مغل حکومت کے برخلاف استعمال کیا کرتا تھا۔ دوسرے لوگوں سے وہ تب لڑتے جب وہ بایزید کے مقابلے میں مغلوں کی طرفداری کرتے۔

مختصر الفاظ میں ہم یہ کہیں گے، کہ :۔

۱۔ زیادہ سے زیادہ بایزید کو اُن صوفیائے کرام کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ جو وحدت الوجود کے قائل تھے۔

۲۔ بزرگوں کے قلبی واردات چونکہ ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسرے لوگ ان کے ماننے پر مکلّف نہیں ہوتے۔

۳۔ بایزید جو اپنی بزرگی اور اپنی کتاب کی صداقت لوگوں سے منواتا تھا، اور نہ ماننے والوں کو مشرک اور کافر کہتا تھا۔ یہ صوفیائے وحدت الوجود کے مسلک سے گریز اور اسماعیلی مذہب کے نشانات ہیں۔

۴۔ جن صوفیائے کرام نے پوری تعلی کے ساتھ دعوے کئے ہیں۔ اور لوگ ان کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے علمی کمالات بھی مسلّم تھے۔ اور ان کا تقویٰ اور پاکبازی بھی حد تواتر تک مسلّم تھی۔ اس لئے لوگ ان کے اقوال کی تائید کرتے ہیں۔

۵ - حضرت اخوند درویزہ نے بایزید کی مخالفت مغلوں کی حمایت کی وجہ سے نہیں کی ہے۔ بلکہ درحقیقت اکبر کے مذہبی مسالک سے بایزید کا اپنا مسلک زیادہ قریب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکبر نے اس کے بیٹے جلال الدین کو یوسف زیوں کی قید سے چھڑایا تھا۔ (۱۵۸۱ء)۔

۶ - بایزید کی سیاسی اور مذہبی جدوجہد دونوں نامکمل اور ناکافی تھیں اس لئے بعد میں اس کے اثرات باقی نہیں رہے۔ لیکن پشتو زبان وادب کیلئے اُس کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ اسکی ان خدمات کے باعث پشتو زبان زندہ رہی۔ اور اس فرقے نے پشتو زبان کی جو خدمت کی ہے' وہ نہایت قابلِ ستائش ہے۔ اور ہم اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بایزید کی تعلیمات اور مسلک کے بارے میں عرصے تک مکمل معلومات دستیاب نہ تھیں، مگر اب اسکی کتابیں علمی دُنیا کے ہاتھ آگئی ہیں، جن سے بایزید کے افکار و تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے۔ بایزید کی تعلیمات اس کی ہر ایک کتاب میں موجود ہیں۔ لیکن "صراط التوحید" میں زیادہ وضاحت سے ملتی ہیں۔

خیر البیان کے بارے میں دبستانِ مذاہب کے مصنف یوں لکھتے ہیں:-

" او را تصانیف بسیار است۔ بہ عربی و فارسی، ہندی و افغانی۔ مقصود المؤمنین بہ عربی است۔ گویند حق تعالیٰ بے میانجی گری جبرئیل با او سخن مے کردے۔ و کتابے دارد خیر البیان نام، و آن بر چہار زبان است اول در عربی' دوم در فارسی سوم در ہندی و چہارم در افغانی۔ یعنی بہ پشتو۔ ہمان یک مطلب را بہ چہار زبان گفتہ۔ و آن خطابیست از حق تعالیٰ مر بایزید را، آن را صحیفہ دانند (دبستان مذاہب صفحہ ۲۰۸) بحوالہ مقدمہ خیر البیان)

بایزید انصاری کے سب سے بڑے مخالف اخوند درویزہ قدس سرہٗ تھے۔
آپ خیر البیان کا ذکر شد و مد سے کرتے ہیں۔ اس بارے میں لکھتے ہیں :-
"و ان ملعون کتابے نوشتہ بعض کلمات را بہ عربی بلا ادراک ترکیب و ترتیب جمع آوردہ و بعض را بزبان فارسی، بعضے را بزبان افغانی و بعضے را بزبان ہندی، اما ہر کدام ازین کلمات ناموافق و ناموزون افتاد بحدے کہ طبائع ازان متنفر گردد۔ و آن را خیر البیان نام بردہ۔ و چون مملو از کفر و الحاد و مشحون از افترا و فساد بود فقیر آن را شر البیان نامیدہ و اگر خر بیان نامندہم مناسب است۔ نعوذ باللہ من کفرہم۔ (تذکرۃ الابرار)
مسلکِ روشنیہ کے سمجھنے کیلئے خیر البیان اور مقصود المؤمنین کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی۔ لیکن مقصود المؤمنین الہامی کتاب نہ تھی۔ البتہ خیر البیان ان کے خیال میں الہامی تھی۔ اس کتاب کی فوٹوسٹیٹ کاپی پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اور اس پر ممتاز دانشور اور محقق جناب قاضی عبدالقدوس صاحب قاسمی نے ایک نہایت علمی مقدمہ لکھا ہے۔

لفظ "میاں" کے معنے اور مفہوم اور پشتون عوام میں اس لفظ کا رواج کب ہوا؟

۱۔ میرے خیال میں لفظ "میاں" فارسی لفظ "میراں" کا مخفف ہے' اور اس کے معنے ہیں' صاحب ، مالک ، آقا ، جناب وغیرہ ۔ اُردو زبان میں شوہر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ ان معانی سے ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ یہ عزت واحترام وعقیدت اور پیار کے اظہار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ۔ پشتون عوام میں یہ رواج ہے ۔ کہ ان کے علاقے میں اگر کوئی نیک ، متقی اور خدا رسیدہ شخصیت ہو تو اُسے میاں صاحب ، باچا صاحب ، اخونزادہ صاحب صاحب زادہ صاحب کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں اور اس میں عقیدت واحترام کا جذبہ شامل ہوتا ہے ۔ پشتو میں ان الفاظ کی جمع "میاگان" ، "باچاگان" "اخونزادگان" اور "صاحبزادگان" بنتی ہے ۔ میرے نزدیک پشتو محاورے کے مطابق لفظ "میاں" اور باچا مترادف الفاظ ہیں ۔

۲۔ میرے خیال میں پشتون عوام میں بزرگ شخصیتوں کے لئے لفظ "میاں" کا رواج بایزید انصاری کے زمانے سے ہُوا ہے ۔ بایزید انصاری کے مرید اور معتقدین اسے میاں روشن یا میاں روشان کہا کرتے تھے ۔ چونکہ تحریک روشنیہ میں اکثر پشتون قبائل شامل تھے ۔ اس لئے اس لفظ نے پشتون عوام میں رواج پایا ۔ اور تحریک روشنیہ کے ختم ہو جانے کے بعد مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ پھر ہر ایک نیک اور معزز شخصیت کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ اگر میرا یہ قیاس درست ہو' تو تو پشتون قبائل پہ بایزید انصاری کی تحریک کے اثرات میں سے ایک اس

لفظ کا رواج بھی ہے ۔ میں اپنے اس موقف کی تائید میں "حالنامے" کی ایک عبارت یہاں نقل کرتا ہوں ۔ یہ عبارت عبدالقادر قائدِ تحریکِ روشنیہ کا بمقام پشاور سعید خان مغل فوجدار کے کیمپ میں آنے سے متعلق ہے ۔ اس بارے میں حالنامے کا مصنف یوں لکھتا ہے :۔

"روزے کہ عبدالقادر داخلِ اُردوئے سعید خان مے شد، از آواز نقارہ و کرنا اسپ اومے ترسید، و از مردم بہ کنار می رفت ۔ افغانے با وگفت آنچہ میاں روشن فرمودہ است اسپ بر آن عمل مے کند و تو نے ۔ خمار این مستی خواہید کشید ۔ عبدالقادر پرسید ۔ میاں چہ فرمودہ است؟ افغان گفت، از مغلان دوری و اجتناب"۔

(حالنامہ بحوالہ مقدمہ خیر البیان از محترم مولانا عبدالقدوس صاحب)

ضمیمہ نمبر ۱

(وہ ترجمے جو بعض صفحات میں رہ گئے)

ص۱۱ شیخ رحمکار جس زمین میں دفن ہیں۔ میرے والد جس زمین میں دفن ہیں خوشحال کا تکیہ خدا پر۔ اور خدا کے بعد اے شیخ رحمکار آپ پر!

میں شیخ رحمکار (کے مزار پر جاکر) توبہ کی ہی تھی کہ اُس محبوبہ نے پھر اپنے عشوہ کے جال میں مجھے پھنسایا۔

میں (شہنشاہ) اورنگ زیب کا قیدی تو نہیں ہوں۔ مجھے تو شیخ رحمکار پیلے رنگ والے کاکا نے قیدی بنایا ہوا ہے۔

ص۲۶۶: آؤ دوست غور سے میری بات سنو۔ یہ قصہ مجھ سے سنو، یہ جو کچھ میں کہنے جارہا ہوں کتاب میں ایسا لکھا ہے۔ حضرت شیخ جی رحمۃ اللہ علیہ، جو اویسی ولی اللہ اور قطب الاقطاب تھے، ایک دن حضرت بنفس نفیس نوشہرہ تشریف لے جارہے تھے۔ اور آپ کی معیت میں کئی مرید تھے جو سب کے سب صاحبانِ مرتبہ تھے۔ جب آپ دریائے نوشہرہ کے کنارے گھاٹ پر پہنچے، تو جس کشتی میں آپ سوار ہونے لگے اُسی میں ایک چور بھی بیٹھا تھا۔

ص۲۶۸ میں نے رخصت کے وقت دعا کیلئے التماس کی۔ آپ نے اپنی زبانِ دُرافشان سے فرمایا، جاؤ جو مشکل تمہیں پیش آئیگی، حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے تم پر آسان کردے گا۔ تمام عمر میں حضرت نے صریح الفاظ میں ایسی دعا کسی کو نہیں دی تھی جو کہ اس حقیر کو نصیب ہوئی۔

ص۳۰۹: کہتے ہیں کہ لقمان مع اپنے بھائیوں (عثمان۔ اتمان۔ زدران) کے شکار کے لئے نکلا تھا۔ پہاڑوں میں اِن کو دور سے چار لڑکیاں دکھائی دیں۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ ان لڑکیوں کو ہم آپس میں بانٹ لیں گے۔ لیکن لقمان جو سب سے بڑا

بھائی تھا قرعہ اندازی کے لئے راضی نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ ان لڑکیوں میں سے پہلے میں اپنے لئے ایک کو پسند کر لیتا ہوں، بعد میں تم لوگ باقیوں پر قرعہ ڈالو۔ بھائی مان گئے۔ اور اتمان نے دور ہی سے ایک کو جو ذرا مضبوط بدن کی اور اچھے لباس کی لڑکی تھی پسند کیا۔ لیکن جب یہ لوگ پاس پہنچے تو اُس کی صورت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی جبکہ وہ باقی تینوں خوش شکل تھیں۔ جب تینوں بھائیوں نے اپنے اپنے حصے کی لڑکی لے لی۔ تو بڑے بھائی کا مذاق اڑانے لگے۔ اور کہا کہ نقصان "ختہ" (کیچڑ) میں پھنسا۔ چنانچہ اس لفظ "ختہ" سے وہ ختک کہلایا۔

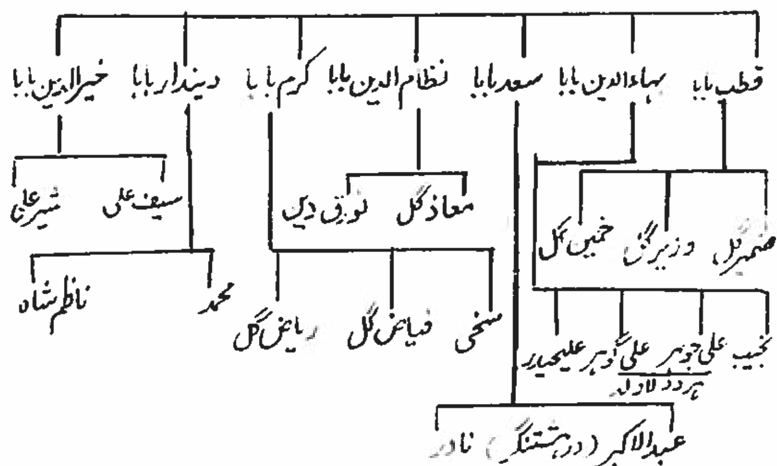
محمد [illegible] بہت [illegible] مہتالہ آباد [illegible]

ضمیمہ نمبر ۲

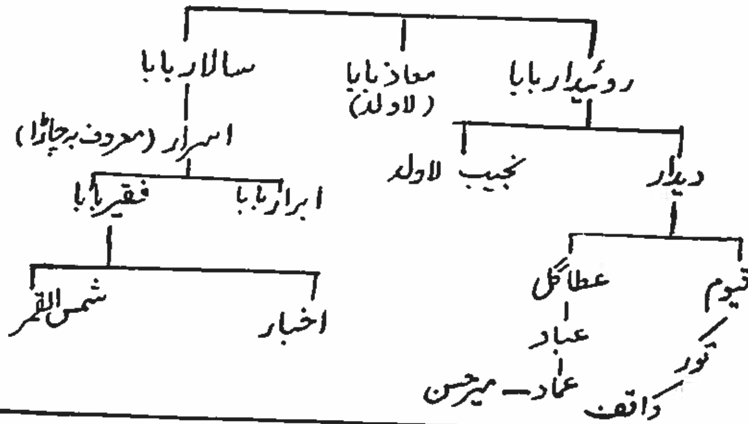
حضرت ضیاء الدین شہید کی اولاد کے مختصر شجرے

ایک روایت کے مطابق حضرت ضیاء الدین شہید کے گیارہ بیٹے اور ایک دوسری روایت کے مطابق نو صاحبزادے تھے۔ جن میں چار یا دو لاولد تھے۔ اور آجکل آپ کے سات صاحب زادوں کی اولاد کچھ زیارت کاکا صاحب میں اور کچھ بیرون زیارت موجود ہے۔ آپ کے بڑے صاحب زادے نجم الدین بابا تھے۔ آپکی تاریخ ولادت ۶ محرم سنہ ۱۰۶۶ھ اور سال وفات ۱۱۳۷ھ ہے۔ عالم فاضل، مدبر اور نہایت فہیم اللسان تھے۔ آپ کے گیارہ بیٹے تھے۔ جن میں سے چار لاولد تھے۔ باقی سات صاحب زادوں کا مختصر شجرہ درج ذیل ہے:۔

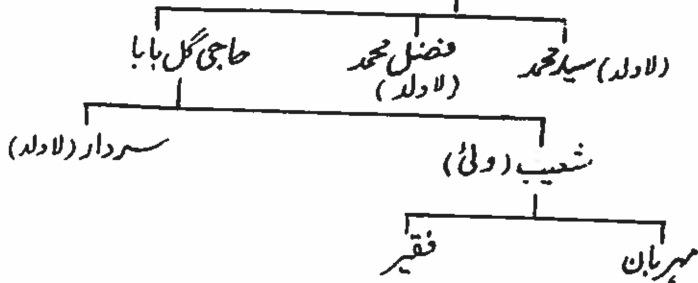
۱:۔۔۔۔۔ نجم الدین بابا



۲: ــــــــــ شکور گل بابا فرزند دوم حضرت شیخ شہیدؒ

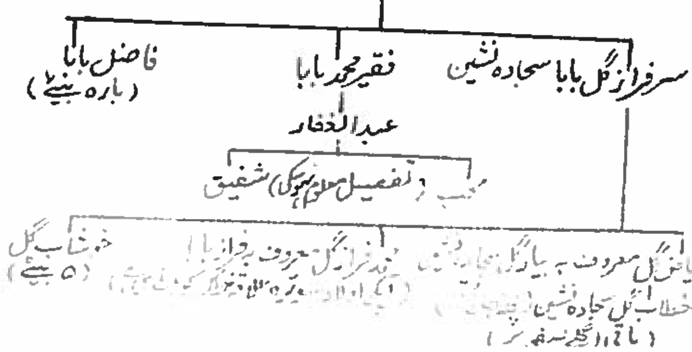


۳: ــــــــــ برہان الدین یا برہان گل بابا فرزند سوم شہید بابا

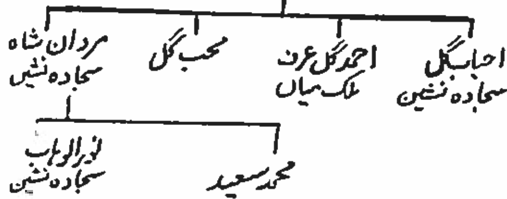


۴: حضرت زین العابدین المعروف بہ بازگل بابا ابن شہید بابا
تاریخ پیدائش ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ

زین العابدین (بازگل بابا) سجادہ نشین شیخ شہیدؒ



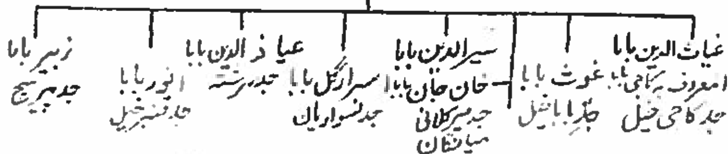
(بسلسلہ گذشتہ)



نوٹ ۱: میاں گان سرخ ڈھیری ضلع مردان میں غلام ربانی۔ غلام صمدانی۔ غلام جیلانی میاں گان مصلہ کی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قصبے میں باقی کاکاخیل میاں گان کاجی خیل (قیاس خیل) کی شاخ میں بتائے جاتے ہیں۔

نوٹ ۲: اس خاندان کے ایک فاضل میاں احتقاب گل مرحوم نے کاکاخیلوں کے نہایت مفصل شجرے مرتب کئے ہیں اور زیارت اور بیرون زیارت کے تمام کاکاخیلوں کے متعلق مفصل معلومات ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ میاں صاحب مرحوم کا یہ ایک نہایت شاندار قومی کارنامہ ہے جو حضرات اپنے شجروں کی تکمیل چاہتے ہوں وہ میاں صاحب موصوف کے اخلاف سے رابطہ قائم کریں۔ ظفر۔

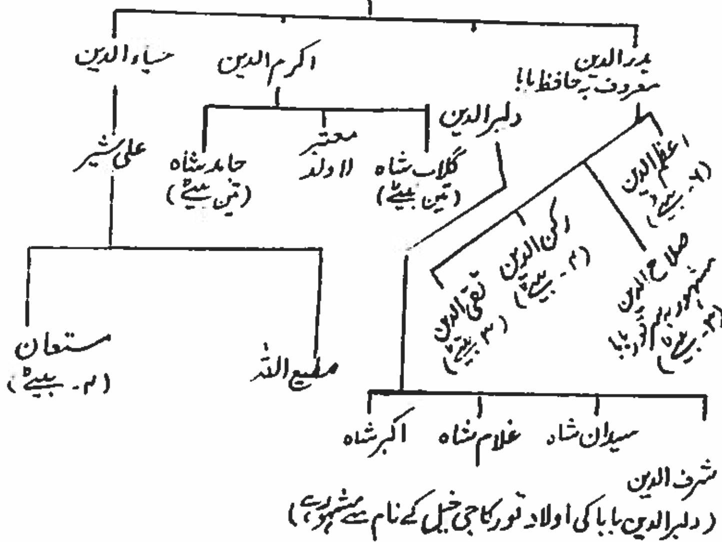
۵:- قیاس الدین بابا فرزند پنجم حضرت ضیاء الدین شہید بابا (تاریخ پیدائش ۱۸ محرم ۹۶۱ھ) آپ کے آٹھ بیٹے تھے۔ جو درج ذیل ہیں)



حضرت قیاس الدین بابا کی اولاد کی مختصر تفصیل اگلے صفحات میں درج ہے۔

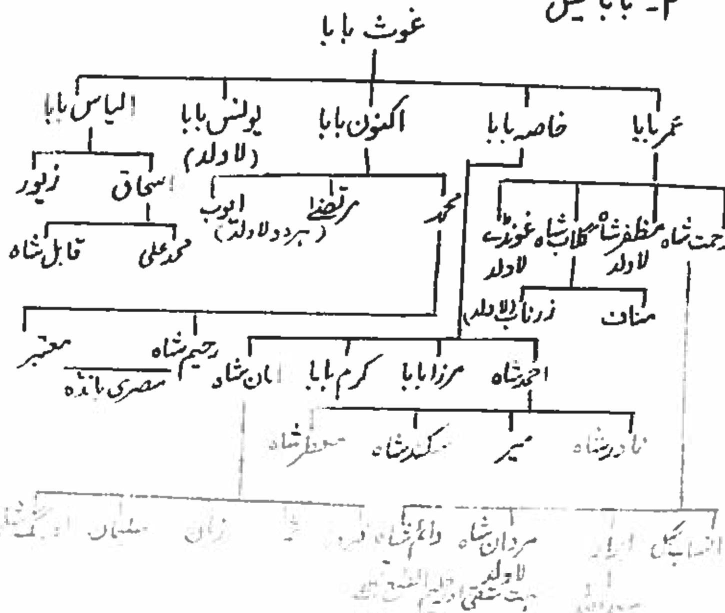
۱- (کاجی خیل)

غیاث الدین بن قیاس الدین بن حضرت شہید بابا
(جدِ کاجی خیل)

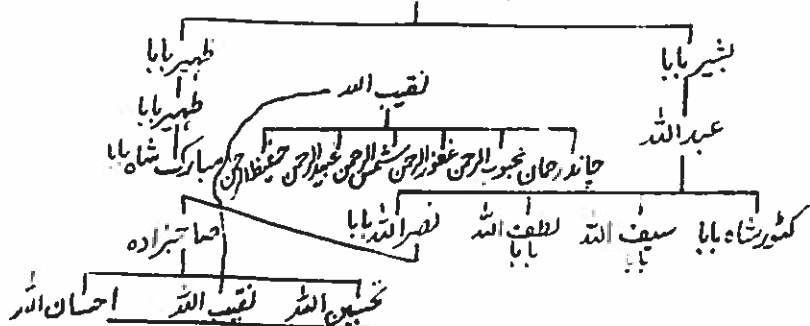


۲- باباخیل

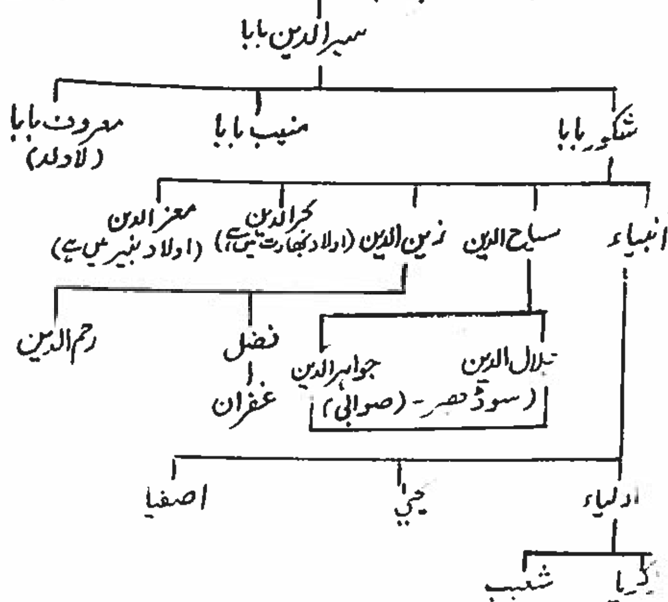
(قیاس خیل)



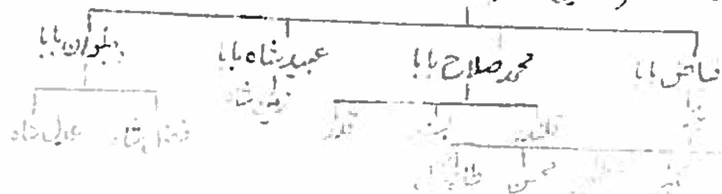
۳:- میر کلانی (قیاس خیل)۔ خان جان بابا ابن قیاس الدین بابا



۴:- سیر بابا فرزند چہارم قیاس الدین بابا ابن شہید بابا



۵:- اسرار الدین (اسرار گل بابا) ابن قیاس الدین بابا ابن شہید بابا

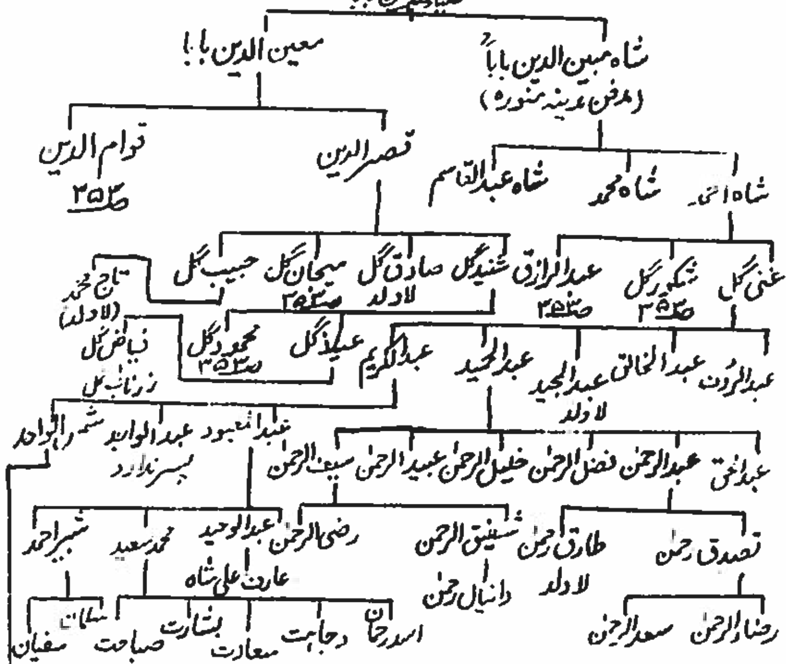


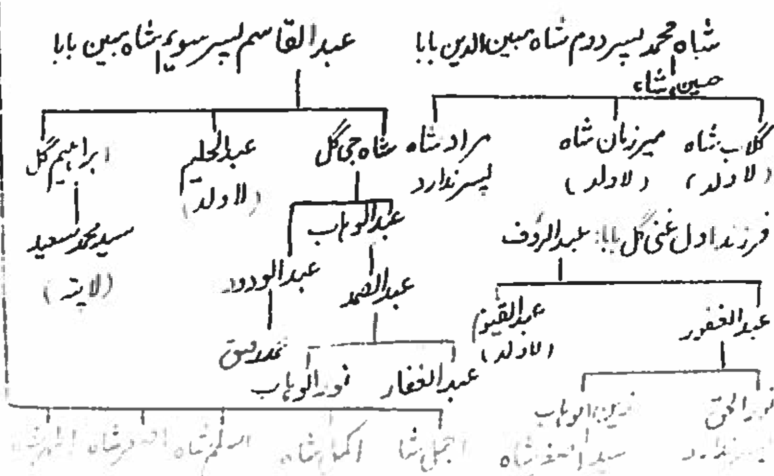
۶ ـ حضرت شیخ عیاذ الدین بابا ابن قیاس الدین بابا ابن شیخ ضیاء الدین شہیدؒ

جدّ سرشتہ میانگان عیاذ الدین بابا

عزیز گل بابا

ضیاء الدین بابا





قوام الدین بابا ابن معین الدین بابا

- شمس الدین (لاولد)
- علم الدین
  - الحاف الدین
    - سردار الدین
  - معرفت شاہ
  - معار شاہ
    - ابرار گل
- رابیل شاہ
  - قیاس الدین (لاولد)
  - محمد غنی (لاولد)
  - قریب الدین
    - عمران اللہ
      - غفران اللہ
- عماد الدین (لاولد)

(میجان گل ابن قیصر الدین ابن معین الدین بابا)

میجان گل

- حمید گل
  - فضل گل
    - شاہجہان شاہ
  - کشور گل
  - جنت گل
  - نور سعید
- حجاب گل
  - محمد گل

شکور گل فرزند دوئم شاہ احمد ابن شاہ مبین بابا

- مغنی گل
  - مفتوح گل
    - سراج گل
    - معراج گل
  - قیاس گل
    - سید الیاس
    - سید مبارک شاہ
- مغفور گل
  - مسرور گل
    - انوار الحق
      - افتخار علی شاہ
      - دقار علی شاہ
      - نجم الحسن
      - ذوالفقار علی شاہ
  - منصور گل بسر ندارد
  - فضل حق بسر ندارد
  - عذیر گل بسر ندارد
  - حبیب گل
    - عابد شاہ

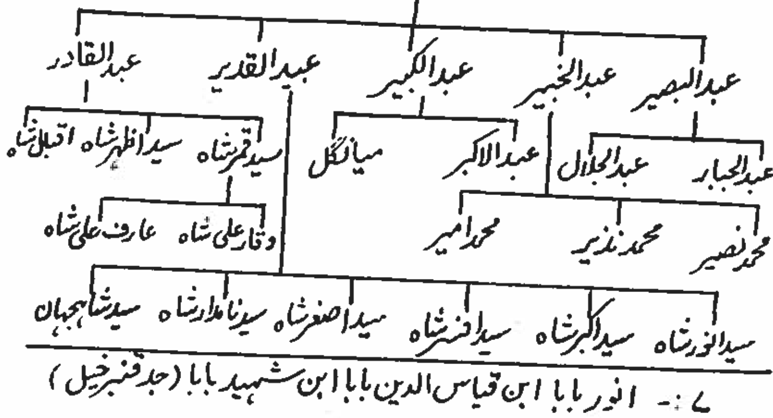
عبد الرازق فرزند سوئم شاہ احمد ابن شاہ مبین بابا

- عبد المالک
  - عبد الرحیم
  - عبد القدیم
- عبد الحکیم
  - عبد الوکیل
    - اقبال
    - ممتاز
    - مختیار
- عبد العزیز

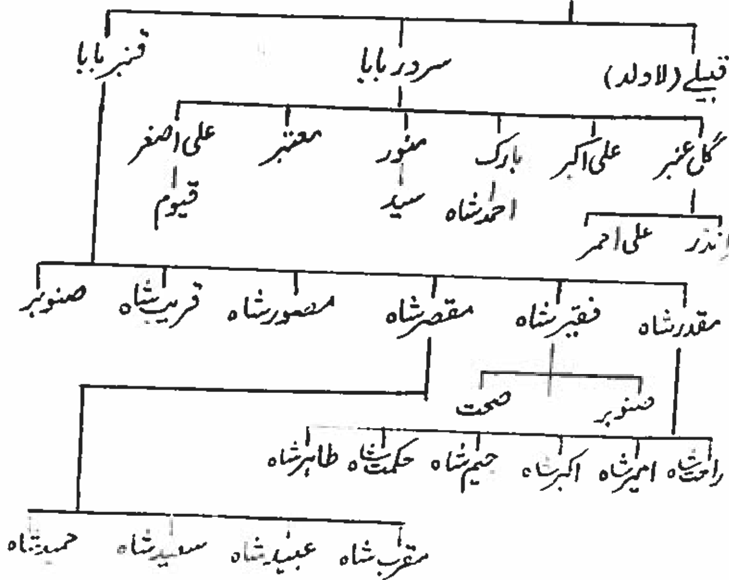
محمود گل ابن شنید گل ابن قیصر الدین

- سرفراز گل
- حضرت گل
- سردر گل

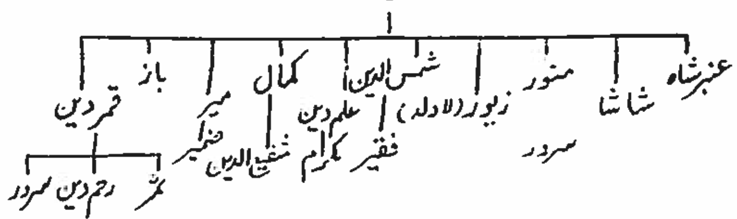
عبدالخالق فرزندِ دوم غنی گل بابا ابن شاہ احمد بابا ابن شاہ مبین بابا



۷:- انور بابا ابن قیاس الدین بابا ابن شہید بابا (جد قنبر خیل)



۸:۔ قیاس خیل (پیرسیج)



عنبرشاہ بابا کے گیارہ بیٹے تھے ۔ جن میں سے چند کے نام مجھے معلوم ہوئے ۔

ا ۔ سکندر شاہ ، معطر شاہ ۔ بادو ۔ فقیر (لاولد) امین ۔ امان شاہ (لاولد) ، سلطان شاہ و بادشاہ ۔

ب ۔ سکندر شاہ ابن عنبرشاہ ابن زبیر بابا کے چھ بیٹے تھے : اکرم شاہ ۔ انعم شاہ افہم شاہ مشہور بہ باپا میاں ، حضرت شاہ ۔ عبدالغنی ۔ برکت شاہ (لاولد)

ج ۔ افہم شاہ (باپا میاں) کے بیٹے : حسین شاہ ، صاحب شاہ ، عبدالکریم مصنف نورحسن

د ۔ اکرم شاہ ابن سکندر شاہ کے بیٹے : حرود ۔ قریب ، مقرب شاہ ، مفرح شاہ (لاولد)

ھ ۔ شاشا ابن زبیر بابا کے بیٹے : احمد شاہ ۔ فیروز شاہ ، جمیل شاہ ۔ سلیمان شاہ ۔ ذکریا ۔ طوطی ۔ بہادر ، نعیم شاہ ۔

(قیاس خیل کا شجرہ ختم ہوا)

۶۔ عباس الدین بابا فرزند ششم حضرت شیخ ... بابا

نجم الدین بابا

میر حمزہ

مہتاب گل

میانگل بابا

صاحب عالم — اکبر شاہ — احمد شاہ

نواب — بادشاہ — امیر

نور زادہ — محمود زادہ — سلیم زادہ (لاولد) — کلیم زادہ

سناء الدین — ... الدین — فیروز الدین — نصیر الدین

جمال الدین — بہاؤ الدین — وسیع الدین — ... — ظہیر الدین — نصیر الدین

تاج الدین — سراج الدین

عاصم

۷۔ دل آرا الدین بابا فرزند ... شیخ شہید بابا (جد افریدی میانگان)

مکارم بابا — لعل بابا

اعظم بابا

بادشاہ — علی اکبر — آزاد گل — ... — علی گل — قاضی

فہیم گل بابا

وسیم بابا

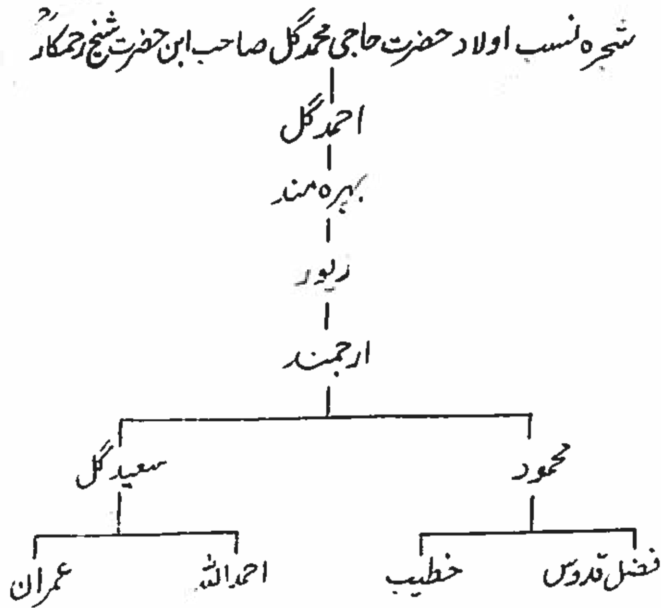
نسیم گل — قسیم گل — جسیم گل

سلیمان شاہ — زمان شاہ — عبد الرحیم — ... نعیم

(بسلسلہ گذشتہ) علوم معقول و منقول میں ید طولی رکھتے تھے۔ مورخ، شاعر ادیب اور محقق تھے۔ مختلف علوم و فنون میں کم و بیش ۱۵۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ سنہ ۱۲۷۱ھ سے سنہ ۱۲۷۳ھ تک پشاور میں بھی مقیم تھے۔ علامہ سید جمال الدین افغانی نے بھی بمقام پشاور تحصیل علوم میں ان سے استفادہ کیا تھا۔

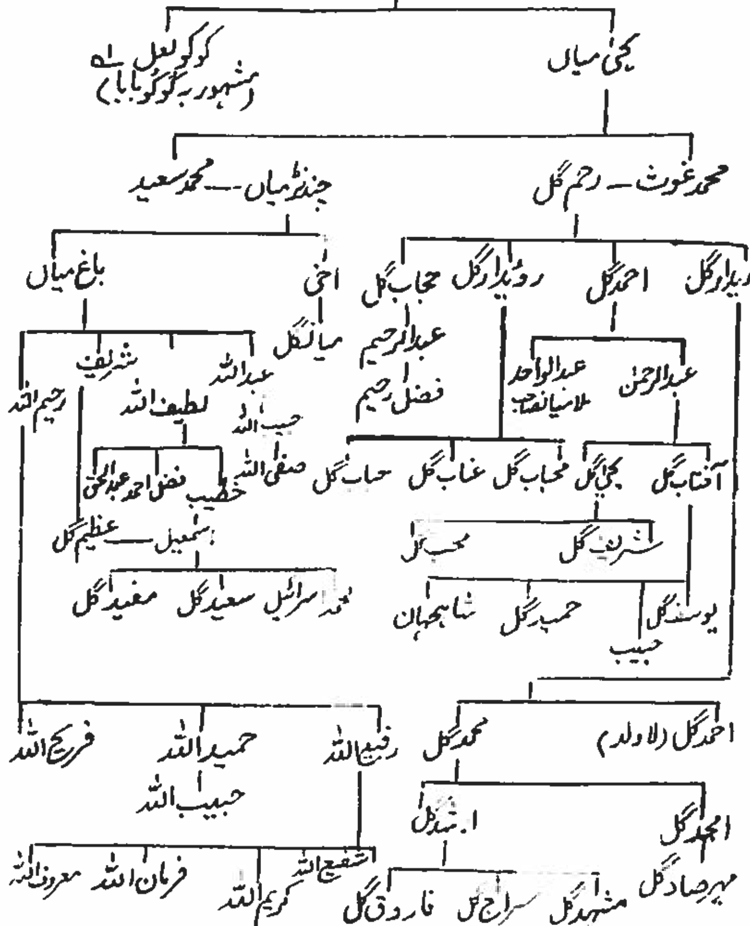
فی الوقت اس خاندان میں مولانا حافظ فخر الاسلام صاحب بمقام ہنگو (کوہاٹ) ایک عظیم دارالعلوم کے مہتمم اور سرپرست ہیں۔ ادر بصارت سے محروم ہونے کے باوجود درس و تدریس اور دارالعلوم کے انتظامی معاملات کی نگرانی نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ حافظ فخر الاسلام صاحب مستقل طور پر ہنگو میں رہائش پذیر ہیں۔

(مختصر شجرہ حضرت شہید بابا کے سات بیٹوں کا ختم ہوا)



شجرہ نسب اولاد حضرت شیخ خلیل گل صاحبؒ المعروف برامزرے بابا
ابن حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ

خلیل گل



لہ آپ آجکل کوکو بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ ابتدا ہی سے مجذوب اور درد محبت میں ڈوبے رہتے تھے اور اکثر روتے رہتے۔ آپ کی حالت سے صرف آپ کے والد ماجد حضرت شیخ خلیل گل صاحب ہی واقف تھے۔ جب آپ جوان ہوئے۔ تو آپ کی شادی کا بندوبست کیا گیا۔ مگر آپ نے انکار کیا (اگلے صفحہ

(سلسلہ گذشتہ) آخر بزرگوں کے مجبور کرنے پر راضی ہوئے۔ مگر ایک ہفتے کی مہلت مانگی۔ اور اسی ایک ہفتے کے اندر اندر آپ رحلت فرما گئے۔ آپ کی قبر حضرت شیخ رحمکارؒ کے روضہ سے بجانب مغرب کچھ فاصلے پر محلہ قبر خیل میں ایک احاطے کے اندر ہے۔ بہت بڑے پائے کے بزرگ تھے۔

شجرہ نسب اولاد حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب ابن حضرت شیخ رحمکارؒ

حضرت شیخ عبدالحلیم صاحب کے پانچ صاحبزادے تھے۔ افضل شاہ بابا۔ گل حسن بابا (ان کی والدہ موضع مناہی کی خٹک خاتون تھی)۔ شیخ غنی دل بابا۔ رحمت شاہ بابا (ان کی والدہ موضع مہاراجی کی خٹک خاتون)۔ فخرالدین بابا (ان کی والدہ ہندوستانی خاتون تھی)۔

افضل شاہ بابا کی اولاد کی تفصیل: آپ کے تین صاحب زادے تھے۔ یمین بابا۔ سید انور شاہ بابا۔ عمر شاہ بابا۔

یمین شاہ بابا ابن افضل شاہ ابن شیخ عبدالحلیم صاحب ابن حضرت شیخ رحمکارؒ

حمد شاہ — دائم شاہ — میر بابا — چراغ شاہ — قائم شاہ لاولد

سلیمان شاہ[1] — مردان شاہ

خازن — رحمت شاہ — امان

معظم — محمد — زیارت شاہ — زمان شاہ — سلیمان شاہ

محمود شاہ — میر زیارت لاولد — محبوب شاہ

معصوم — شیر باز — منور شاہ

منون شاہ — مرحوم شاہ

عبدالکریم

عنبر شاہ — عزت — راحت — صحت — عطار شاہ — حضرت شاہ (لاولد)

محفوظ — عبدالمعروف — عبدالرؤف

فضل رؤف

واحد — فضل وکیل

محمد شاہ — عبدالہادی شاہ

محمد شفیع — عبدالمعبود — عبدالرحیم

میر — جلیل — محمد شاہ — نماز — خالد شاہ — مخزن — خادم — گل بادشاہ — عارف — احمد — جلیل

میر جمال — میر بابا — خان بابا — وزیر بابا

[1] ان کی اولاد ... [illegible]

میر بابا ابن دائم شاہ ابن یٰسین شاہ ابن افضل شاہ ابن شیخ عبدالحلیم صاحب

میر بابا

شعیب داواہ محبوب نعیم شاہ زیور شاہ مسحور شاہ

ہر دو لا ولد

گلاب شاہ تدیم شاہ مغفور شاہ حضرت شاہ معمور شاہ

وفات ۱۳۱۶ھ

سید اکبر مسحون مقرب

عبدالخالق شاہ مظہر شاہ حسین شاہ ذاکر (لا ولد)

محسن شاہ

شاہ ظفر

کمال انور شاہ افضال انور جراغ شاہ مزمل شاہ

جمیل انور شاہ

ذی شان انور شاہ جمال انور شاہ نادر شاہ قادر شاہ

صاحب شاہ

قابل شاہ

باچا

مستور لاولد

لائق شاہ نفیر شاہ سیفور شاہ (لا ولد) ملائک شاہ

خلائق شاہ سیفور شاہ جعفر شاہ

فضل شاہ مہر نواب ظاہر شاہ معبود شاہ مظہر شاہ اجمیر شاہ محمد

نصرت شاہ اسرار گل معروف بہ قالمی میاں طیب شاہ میاں گل طاہر شاہ

ہر دو لا ولد

منفعت شرافت

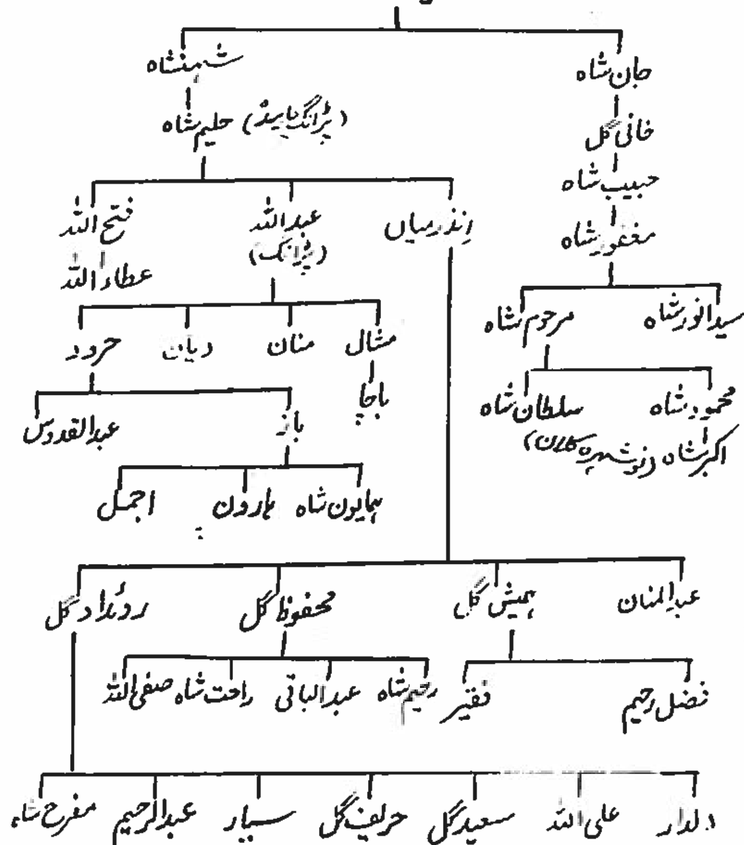
میاں گل جان معزز جان افریق

بابا اکبر کمال اکبر سجاد رشاد الطاف رفیق جان

امیر شاہ (لا ولد) مرحمت شاہ ہدایت شاہ فضیلت شاہ (دو بیٹے)

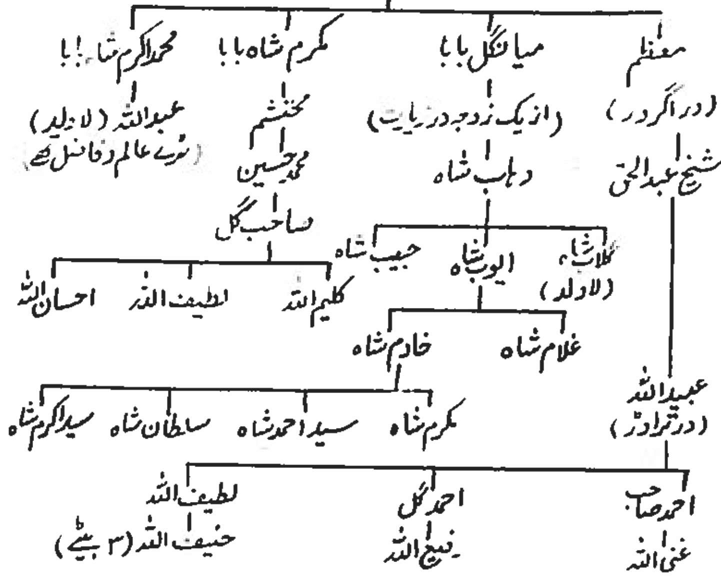
فاروق شاہ خرم شاہ

شجرہ اولاد سید انور شاہ ابن افضل شاہ ابن شیخ عبدالحلیم ابن شیخ رحمکارؒ



مختصر تفصیل اولاد عمر شاہ بابا ابن افضل شاہ ابن شیخ عبد الحلیم صاحب

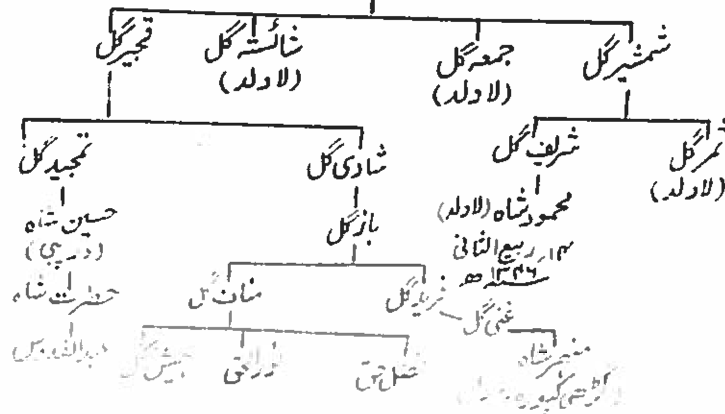
عمر شاہ بابا



تفصیل اولاد گل حسن بابا فرزند دوم شیخ عبد الحلیم صاحب ابن حضرت شیخ رحمکار

گل حسن بابا

محسن بابا

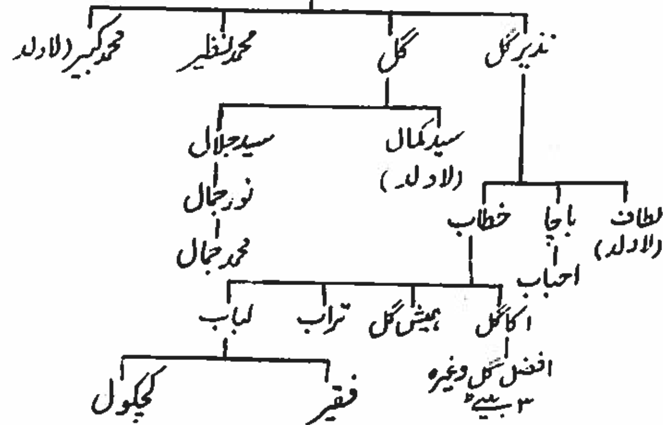


تفصیل اولاد رحمت شاہ بابا ابن شیخ عبدالحلیم صاحبؒ ابن شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ

رحمت شاہ

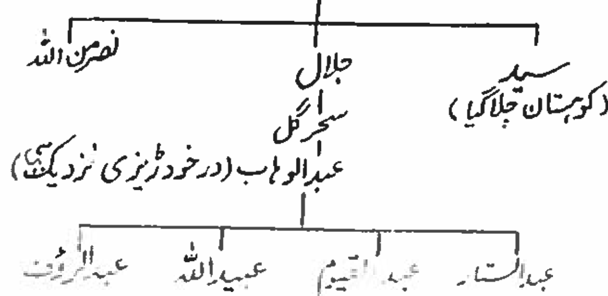
دلیداد بابا (در آگرہ تہشتنگر)

میرزمان



مختصر تفصیل اولاد شیخ غنی دل بابا فرزند حضرت شیخ عبدالحلیم صاحبؒ ابن حضرت شیخ رحمکار کاکا صاحبؒ۔

شیخ غنی دل بابا کے چار صاحبزادے تھے: حاجی گل بابا (لاولد) عبدالغفار بابا قسلان بابا۔ شیخ دلیر بابا۔ عبدالغفار بابا کی اولاد کی مختصر تفصیل :۔



مختصر تفصیل اولاد قتلان بابا ابن شیخ عبدالحلیم صاحب ابن شیخ رحمکارؒ

قتلان بابا

عمر (لاولد) — عبدالستار بابا

واجد گل

مراد گل — نافع گل — عواہد گل — مجاہد گل — فوائد گل

زاہد گل (لاولد) — شاہد گل — حلیم گل — سمیع گل

حمیم گل

شافع گل (مجذوب) — عزیر گل (زامیر ملا) — نافع گل — صمیم گل (دیوانہ) لاولد

تسنیم الحق — تقویم الحق — تنظیم الحق — تکریم الحق — تنعیم الحق

محمد ظفر — عبدالرؤف — زبیر

محمد طیب — عبداللہ — عبدالرحمن — محمد قاسم — محمد یوسف

تفصیل اولاد شیخ دلیر بابا فرزند چہارم غنی دل بابا ابن شیخ عبدالحلیم صاحب

شیخ دلیر بابا

اشراف اللہ (بہت بڑے عالم تھے) — حبیب اللہ — لطیف اللہ (فولاد بابا کے نام سے مشہور تھے)

لطیف اللہ بابا کے نو بیٹے تھے جنکے نام یہ ہیں:-

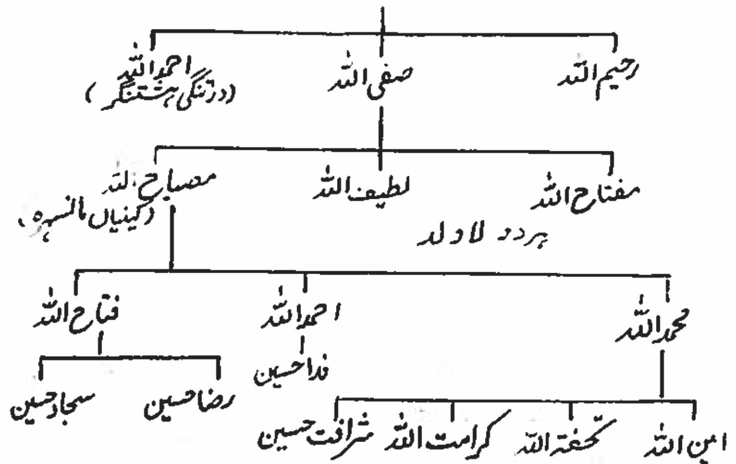
رحمت اللہ ۔ خلیل اللہ ۔ صفی اللہ ۔ غریب اللہ (ہر چہار لاولد)

جواد اللہ، سعید اللہ، سیف اللہ، حمید اللہ، نبی اللہ

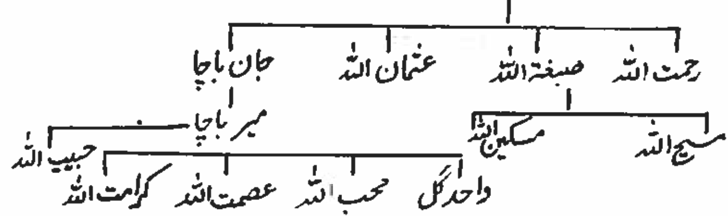
(باقی کی تفصیل اگلے صفحات میں دیکھئے)

رفیع اللہ ([illegible]) — نجی اللہ

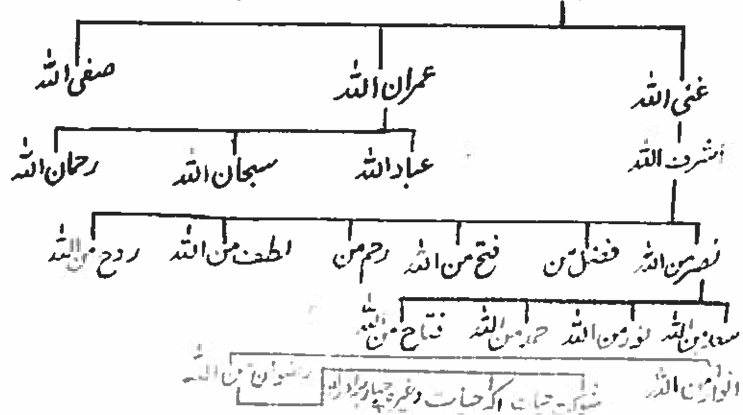
سعید اللہ ابن لطیف اللہ



سیف اللہ ابن لطیف اللہ ابن شیخ دلبر بابا



حمید اللہ ابن لطیف اللہ ابن شیخ دلبر بابا



نبی اللہ ابن لطیف اللہ ابن شیخ دلیر بابا

- شفیع اللہ
  - غیاث اللہ
  - اسحاق اللہ
  - عبدالمنان
  - محسن اللہ
- سمیع اللہ
  - اسمٰعیل
  - عظیم اللہ
- وسیع اللہ
  - امان اللہ
    - سعید اللہ

تفصیل اولاد فخرالدین بابا ابن شیخ عبدالحلیم صاحب ابن شیخ رحمکارؒ

فخرالدین بابا کے چار صاحب زادے تھے: شیخ جنید بابا۔ محمد شاہ بابا

عصام الدین۔ اعظم قادر بابا۔

تفصیل اولاد شیخ جنید باباؒ

- انور شاہ
- گل بلند
- اختر محمد
- سلطان شاہ
- رفیع اللہ
  - عارف گل (لاولد)
  - ظفیر گل
    - وصیف گل
      - صادق
        - مصدق (دیوانہ)
        - عبدالاحد
    - حسیف گل
      - مسیح اللہ
        - عبدالحبیب
        - عبدالواحد
        - عبدالماجد
        - بادشاہ گل
          - عمر خطاب
        - چاند بادشاہ
          - امیر شاہ
        - میانگل
          - میر باچا
          - سید باچا
        - عجائب گل
    - حنیف گل
      - عزیز گل
      - میانگل
        - محمد شریف
        - طرز گل
      - نواب گل
        - ابراہیم گل
          - مفتی الحق

تفصیل اولاد محمد شاہ بابا

- بادشاہ
  - احمد گل
    - صدیق
    - شبیر
      - حسین شاہ
        - فقیر محمد
          - فضل ربی
    - عثمان
      - میر احمد شاہ
        - محمد نواب
          - امیر نواب
          - غنی نواب
        - قدیم شاہ
          - اجمیر شاہ
        - شمس النواب
    - عمر
- حیدر شاہ
  - نور شاہ
  - فقیر
  - فیروز شاہ
    - صاحبزادہ
  - اکبر
    - امیر شاہ

تفصیل اولاد عصام الدین بابا ابن فخر الدین بابا ابن شیخ عبد الحلیم صاحب

عصام الدین

عظیم الدین

مظہر الدین (لاولد) — وسیع الدین — مشرف الدین — محسن الدین — شفیع الدین — ملک دین

سمیع الدین — فضل دین — اشرف الدین — صالح — کریم شاہ

رحمان (لاولد) — اسرار — فتاح الدین — حضرت شاہ — میر آفتاب — سناب گل — میانگل — الیاس

احسان الدین — عمر — فقیر

فصیح الدین — حصام الدین

ماہ جبین — گلاب شاہ

امیرزادہ — حلیم زادہ — میرباچا

رحیم شاہ — معراج — سبحان الدین

میر احمد شاہ — محمود شاہ — مفرح — سیرت شاہ — حمید الدین — حمید شاہ — معرفت شاہ

ذراعت شاہ — مفرح شاہ — حکیم زادہ — صاحب زادہ — شیرین

تفصیل اعظم بابا ابن فخر الدین بابا ابن شیخ عبد الحلیم صاحب

عطار گل — علیم گل — نسیم گل — اورنگ شاہ — محمد گل — احمد شاہ — نسیم گل

عبد الجبار — عثمان (جلبئی)

باز گل — محمد گل — رحیم گل — محمد نبی — سید گل — آفتاب گل — قاسم گل — سناب (ہندوستان چلاگیا)

نظیم گل — قابل — سکندر شاہ — نواز گل

الخیر گل — سفید شاہ — رحیم گل — ہمیش گل

مجید گل (ذوالفقار) — شاہ شاہ — کشور شاہ — حباب گل

مبارک شاہ — فرح شاہ

عثمان شاہ — احمد شاہ — بادشاہ گل — رحمت شاہ — جسیم گل — محمدی — آفتاب گل

مظفر شاہ